

نبی کریم ﷺ کا ذکر مبارک..... عید میلاد النبیؐ پر تحفہ خاص



پیشوا مشران
سعید الزماں صدیقی
کا انشائیہ
کے بحر اور اسرار

اردو انسائیکلو پیڈیا

جز 2015ء



لے کر محسوس کیا گیا
ہم نے اپنے لیے
گلشنِ پاک کے تحت
کی قسم کھائی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھارت میں پاکستانی
ڈراموں کی مقبولیت

شہید ٹیچر کے
برگیا میر شوہر کا نذرانہ عقیدت

2014ء کی
بہترین ایجادات



صدر مجلس	ڈاکٹر ایاز حسین قریشی
مدیر اعلیٰ	ایضاح حسن قریشی
وزیر کاروبار	حبیب اقبال قریشی
سنسٹ ایڈیٹر	سید عامر محمود
سب ایڈیٹر	انعام حیدر
مجلس تحریر	مدینہ انوار، محسن، نوید اسلام، سعید علی، سلفی، عمران
مختصر مضمون	فاروق اقبال، قریشی
انچارج ایڈیٹر	انسان کا عمران قریشی
پروف خواتین	نثار علیی، المدین
انچارج ایڈیٹر	عبدالرحمن، اشرف سکندر

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ



تبدیلی کا سال

17 دسمبر کی صبح رونما ہونے والے سانحہ پشاور نے ہمارے دل ڈھکی کر دیے۔ ہر آنکھ اٹکلبار ہے۔ یہ سانحہ ماؤں اور بچوں کے دل و دماغ پر بہت گہرے اور عدم تحفظ کے اثرات چھوڑ گیا۔ جس دن سے یہ واقعہ پیش آیا ہے، میری جین کمر سے باہر جانے سے کترانے لگی ہے۔ اکثر اوقات ٹی وی دیکھتے دیکھتے زار و قطار رونے لگتی ہے۔ اور مجھ سے کئی طرح کے سوالات پر ہنسی ہے، جن میں سے اکثر کے جوابات میرے پاس نہیں ہیں۔

پشاور سانحہ میں شہید ہونے والے بچوں کے والدین کو دلاسا دینے کی ہمت بھی مجھ میں نہیں ہے۔ صرف دعا... کہ اللہ تعالیٰ شہداء کے وارثین کو سیرتِ نبویؐ دکھا کرے اور پھر بھی ہمدردی مرز میں اس طرح کے حادثے سے دوچار نہ ہو اور ان کی قربانی برباد نہ جائے۔

بڑے دکھ اور قرب کی بات ہے کہ ہمارا ملک پچھلے عشرے سے مابست جنگ میں ہے لیکن ہماری قوم اور اہل باب اختیار نے اس بات کو سمجھنا ہی نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہو گا جب مشرف نے آئن ایجن کے واقعہ کے بعد امریکا اور چین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور قوم کو "سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ دیا تو ساتھ ہی ملک میں روشن خیالی کے نام پر فیشن شو، کیت واک، کسٹمز اور ہیلتھ جیو کے میلے آگئے شروع ہو گئے۔ ملک میں ایک طرف ڈورنڈا اپنا کام دکھا رہے تھے اور دوسری طرف نیوز اور بی بی سی نورمز افغانستان میں کارروائیاں کر رہی تھیں۔ جس کا دلکش آئنا نظری تھا، ہماری انوائج ملک کی سرحدوں پر اور ملک کے اندر کئی مقامات پر بہادری سے لڑتے ہوئے قربانیوں سے رہی تھیں۔ لیکن قوم کو کسی جنگ کے لیے تیار نہیں کیا گیا۔ ملک کی مقبول میڈیا نے نظیر بھٹو کو شہید کروا گیا۔ اس کے بعد دہشت گردی کے واقعات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ملک میں دو انتخابات بھی منعقد ہوئے جس کے نتیجے میں سرکار اور سوزوں میں مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان کے لیڈر بھی دہشت گردوں کا نشانہ بنتے رہے۔ لیکن پہلے پانچ سال کرپشن کے اسکینڈلز اور عدلیہ کے ساتھ ملاؤ آزادی میں گزار دیے اور

فہرست

16 واں

خصوصی انٹرویو

سابق چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی

ایک بلند پایہ قانون دان جنہوں نے آمریت کا مروانہ دار مقابلہ کر کے قومی عدلیہ کی تاریخ میں زندہ و تابندہ روایت قائم کر دی



دوسرے دور میں تحریک انصاف نے جہاں پاکستان آباد ہے جہاں پڑی اور طاہر القادری "انقلاب" کا درس دیتے گئے۔ یہاں صاحب اور ان کی حکومت سمورت حالی کو کبھی بغیر پہلے مشرف اور پھر چوٹی ون کے معاملے میں الجھ گئے۔ کبھی سیاستدانوں نے سٹے سوزیوں کا شوشا چھوڑ دیا اور کبھی انتخابات میں احماد علی کا... ہم گزشتہ کئی شماروں میں اپنے قارئین اور اہل باب، اقتدار کو انٹراکٹنگ کرنے کے حوالے سے نظام میں موجود کمزوریوں کی نشاندہی کرتے رہے۔ پولیس اور عدلیہ میں بہتری لانے کے لیے قابل عمل تجاویز بھی دیں۔ (پڑھیے چند جملے) (158) لیکن کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رہ سکتی۔

۲۵ دسمبر نصف شب کو وہی گھنٹے کے طویل اجلاس کے بعد ازراہ عظیم پاکستان، نواز شریف نے قوم کو خطاب کے ذریعے نوید دی کہ تمام سیاسی جماعتیں اور فکری قیادت نیا اور محفوظ پاکستان بنانے کے لیے متحد اور مختلف اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اب ہماری حکومت کو کوئی ایضاح کیے بغیر گورنمنٹ کے ذریعے اپنی رست قائم کرنا ہوگی اور کسی بھی امتیاز کے بغیر قانون کی منبری لانا ہوگی۔ سیاسی قائدین، عدلیہ، پریور اور کسی سب کو اولین ترجیح اپنے فرائض کی ادائیگی کو دینا ہوگی۔

آئیے ہم سب مل کر عہد کریں کہ 2015ء میں ہم اپنا وطن محفوظ اور توانا بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔ اس مقصد کے لیے اپنی حکومت کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو جائیں گے اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہاجر بھٹی، کیس اور ٹیکس کی چوری نہیں کریں گے، ڈاکٹر مریم نواز سے بے رحمانہ سلوک نہیں کریں گے اور دکھا، سائیلیں کو خوار کر کے اپنی تصویریاں نہیں بنیں گے۔ غرض ہر شعبے سے متعلق افراد اپنا کام دیانت داری سے ادا کریں گے، حتیٰ کہ اساتذہ پوری لیکن سے نئی نسل کو ملک کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لیے تیار کریں گے اور طالب علم اپنا قیمتی وقت غیر تعمیری اور منفی سرگرمیوں میں ضائع کرنے کے بجائے نئے بنیادوں پر گزار سکیں گے۔ یہ ملک ہم سب کا ہے اور ہم سب کو اس کی حفاظت اور ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ سچی ہم سب کی باتوں میں اپنے شہید بچوں کی قربانیوں کا بدلہ لے سکیں گے۔ آپ کو نیا سال "تبدیلی کا سال" مبارک ہو۔

علیہ السلام
inaynab.ali@urdu-digest.com
پڑھیے، جڑ جائے، سچے اور لطف اٹھائے



فہرست

سالانہ شمارہ

146 مجھے اپنی بیگم پر فخر ہے 155 سمجھو کچھ غلط ہے

148 سانحہ پشاور کی مہیب گونج 159 دکھ کا نیا پیغام

156 غم و اندوہ تصاویر کے آئینے میں



آپ بقی لندن میں کیا گزری؟

حیرتوں اور حیرتوں کے ماپ سے جنم لینے والی دلچسپ گزارشت

راشد و غلوی



191

پکشاکت

سوئس عدالت نے
آصف زرداری کو مجرم
نامزد کر دیا

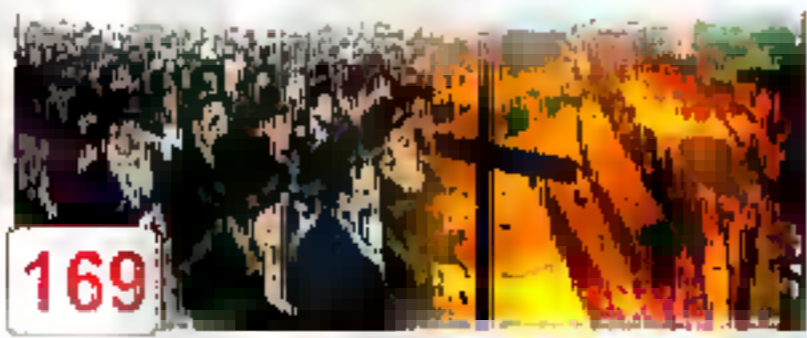
95

عالمی ساراں مٹھی بھر یہود

نے دو ارب عیسائیوں

کو پھانس لیا

رضی الدین سید



169

128

ٹاشی ٹینک
جو ڈوبتا نہیں تھا

اردو ڈائجسٹ 11

جنوری 2015ء

فہرست

اسلامی زندگی کی کہکشان

33 نبی کریم کا ذکر مبارک پروفیسر احمد الدین ماریوی

روزانہ اربوں کی تعداد میں ہونے والی پاکستانی پاک کا ذکر مبارک

39 مکہ کے نابینا صحابی فقیر اللہ خاں

ایک بلند مرتبہ مقدس شخصیت کا تذکرہ

44 جن سے ملے روشنی آباد شاہ پوری

بھنگے ہوؤں کی راہنمائی کرنے والے پیش قیمت واقعات

49 کیوبا میں پہلی مسجد ہادی محمود

کیونستوں کے گزرتے ہیں اذان کی آواز گونجے گی

116 شیطان کا لقمہ ناپید جعفر

ایک نابینا عورت کی عبرت انگیز کہانی

مصباح الحق خان

کیل کلاری

کبھی تک تک کبھی چوکے چنگے

ابوصارم



73

انجمنات

2014ء کی

ایجادات

83

آپ بقی

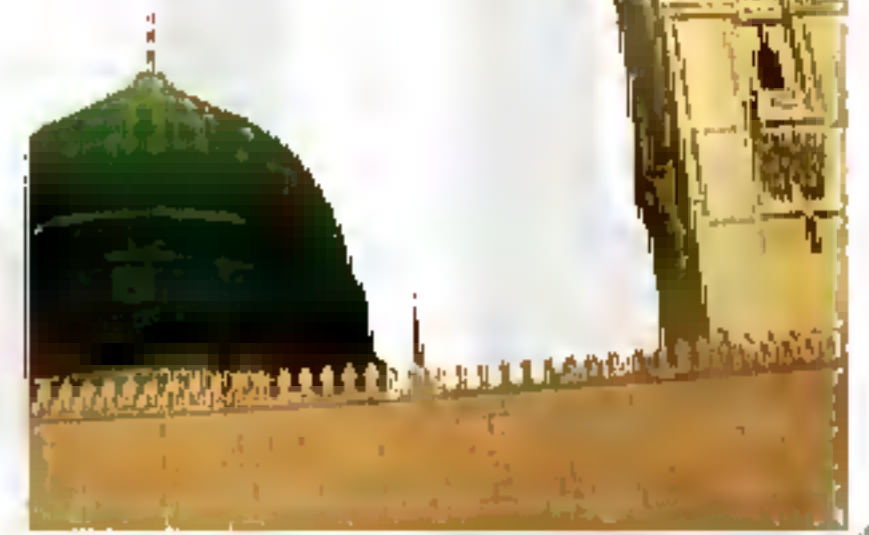
جب آئی جی

نے پیاز چرایا

124

جنوری 2015ء

ربیع الاول مبارک



مجدد امجد

اردو کے طرح دار شاعر

کا اچھوتا خاکہ

پادشاہان



بیراصغر چودھری

65

الطاف حسن قریشی کے فلم سے

15 کچھ اپنی زباں میں

قیصلہ کن مرحلہ

اردو ڈائجسٹ 10

جنوری 2015ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہائر کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

222 ڈراما سکرینے یوسف ناظم

نوٹو گرافر کے کام کو مطلق اعزاز بادشاہ بھی مال نہیں پاتا

طب و صحت

139 سوگ بچان محمد ظلیل چودھری

گوشت سے بھی زیادہ پروٹین رکھنے والا ٹیش بہار ندرتی تحفہ

201 پتھلی کون سی بہتر ہے؟ ڈاکٹر سلطان محمود

غذائے اہستہ معاشرے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کی حقیقت

رنگارنگ تحریریں

53 یہ جامن سندھ کے ہیں محمد عابد عباسی

ایک دیہاتی سندھی کا نعرہ مستانہ

89 مجھے باتونیوں سے بچاؤ ابراہیم جلیس

باقول دوستوں سے عاجز آئے کی رہائی

103 پاکستانی ڈراموں کی دھوم عام محمود

عمرہ کہانی، نگارنگ لاداکاری اور بہترین عکاسی والے ڈراما سیریل

120 ٹیس بک کے بارہ راز عسکرا حسین

پاکستان میں مقبول ترین سوشل نیٹ ورک سائٹ

182 نئے صوبے ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

ترقی و خوشحالی کی نوید

211 سری محمد داؤد ظاہر

برف سے باتدھی سے دستار انضیات تیرے سر

226 افریقا کے بونے فرزانہ مجتبت

معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار ہونے

مستقل سلسلے

230 قصہ کوثر 237 چمن خیال

232 تبصرہ کتب 240 یوجھو تو جائیں

اردو ادب

68 آخری سانس

بشری زمین ہسکتی، دکتی، چمکتی، چمکتی زندگی کا قصہ غم

78 سہرا سبق

صالحہ محبوب باختراندہ ولاد نے بھٹکے ہوئے بچوں کو سیدھی راہ دکھلا دی

108 زندہ کھلی کی موت

سراج دینا اس بیٹے دور کی دل خوش کن کتنا جب خلوص و پیاری سب کچھ تھا

142

کبھی ہم بھی خوب صورت تھے نیلم احمد بشیر گزرے وقت کی کبھی تپھی یادیں

161 کامیابی

جاوید ہسام ایک ذہین بے روزگار کی داستان عجب

165 احسان

رزاق شاہد کوہل ایک احمق کا اداس ماجرا

175 نصیب

احمد ندیم قاسمی ایک بے آسرا بیوہ نے اپنی سوسائٹی سے آس لگائی مگر وہ اس میں بدل گئی

188

مجھے اللہ نے بچا لیا مہ جیس بھلا پھلا کر معصوم لوگوں کو لوٹنے والے فخر ناک گروہ کا سنسنی خیز قصہ

185

ہم نے پاکستانی فلم دیکھی ملیب امین قیصرانی اسی سالہ امیر اور بچاس سالہ ہیروئن کی غیر معمولی لاداکاری

204

اندھیرے کی لکیر سلطان جلیل نسیم لیک لاپٹی و خود غرض انسان کی کتھا

216

بے گناہ سہراب اسلم اندھے قانون سے ڈرے ایک ستم رسیدہ غریب کا ماجرا

اردو ڈائجسٹ 12

نومبر 2015ء



فیصلہ کن مرحلہ

پشاور کے بعد قوم جس طرح دہشت گردی کے خلاف متحد ہوئی ہے اور ہر قربانی کے لیے آمادہ ہے وہ ایک تابندہ مستقبل کی نوید باریت ہو سکتی ہے۔ ہماری مسلح افواج سالہا سال سے دہشت گردوں کی یلغار کے آگے صف آرا ہیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہی ہیں۔ اس خونریز جنگ میں پچاس ہزار شہری بھی موت کی آغوش میں جا چکے اور پاکستان کو معاشی طور پر ساٹھ ارب ڈالروں کا نقصان ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہمارے ارباب اقتدار ہمیشہ و عشرت کی زندگی بسر کرتے اور عوام کو غربت اور جہالت کی تاریکیوں میں دھکیلتے رہے۔ وہ اپنی سکیورٹی پر لامحدود وسائل خرچ کرتے جبکہ ملکی داخلی سلامتی سے غافل رہے۔ اب جب آرمی پبلک اسکول پشاور میں لوگوں نے پھول سے پھول کو درندوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھا تو وہ غم اور غصے کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے تب ہمارے حکمرانوں کو بھی احساس ہوا کہ اگر دہشت گردی کا مکمل صفایا نہ کیا گیا تو پاکستان کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی اور تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ آرمی چیف جنرل راجیل شریف نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ آخری دہشت گرد اور اس کے معاونوں کے خاتمے تک ہم آپریشن جاری رکھیں گے اور عوامی حمایت سے یہ جنگ ضرور جیت جائیں گے۔

ہم نے یہ خوش آمد نظر بھی دیکھا کہ وزیراعظم کی دعوت پر پارلیمان کے تمام قائدین پشاور پہنچے انہوں نے عظیم الشان قومی جذبے کا مظاہرہ کیا اور اتفاق رائے سے ایک قومی ایکشن پلان بھی منظور کر لیا۔ اس پلان پر عمل درآمد کے لیے وزیراعظم کی سربراہی میں ایک نگران کمیٹی بھی بنا دی گئی اور پندرہ ذیلی کمیٹیاں بھی تشکیل پا چکی ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہ کمیٹی ہے جس نے آئین اور قانون میں ایسی ترامیم پیش کرنا ہیں جو فوجی عدالتوں کے لیے آئینی جواز پیدا کر سکیں گی۔ یہ تمام کام ہنگامی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہونا ہے کہ حکومت اور فوج اس چیلنج کو غیر معمولی سنجیدگی سے لے رہی ہیں اور تیز تر مشاورت کا عمل جاری ہے۔ ہم ان کوششوں کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور اپنی قوم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کی اہانت سے نجات پانے کے لیے سردھڑکی باڑی لگا دے قانونی موٹو گائیوں میں الجھنے کے بجائے اصل اہداف پر نگاہ مرکوز رکھے اور فوج کے شانہ بشان کھڑی نظر آئے۔ ان سیاد اور سفاک چہروں کو تختہ دار پر لٹکانے کے ساتھ ساتھ جو انسانوں کے سروں سے فٹ بال کھیلتے اور بچوں کو ذبح کرتے ہیں ہمیں اس مائنڈ سیٹ کو تبدیل کرنے کے لیے ایک مشترکہ جذبے سے کام کرنا ہوگا جو ہماری اخلاقی انتظامی سیاسی سماجی اور اقتصادی بگاڑ اور تباہی کا ذمے دار ہے۔ یہ وہ مائنڈ سیٹ ہے جو معاشرے کے ہر طبقے میں اوپر سے نیچے تک پایا جاتا ہے اور اس کا سامنا دوسرے زندگی میں قدم قدم پر ہوگا۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے اور نظار توڑنے والے کمزوروں کے حقوق

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرتک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جا سکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



سابق چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی

ایک بلند پایہ قانون دان جنہوں نے آمریت کا سردانہ وار مقابلہ کر کے قومی عدلیہ کی تاریخ میں زندہ و تازہ روایت قائم کر دی

انٹرویو: الطاف حسن قریشی، نلیب اعجاز قریشی اور نصیر احمد شاہی



کرچی کی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے بچکانے میں جس عظیم المرتبت شخصیت سے انٹرویو کر رہے تھے انہیں ہم قومی ہیرو کا مقام حاصل ہے کہ انہوں نے ۲۰۰۰ء کے اوائل میں پی سی او (پرویز مل کتسی ٹیوشن آرڈر) پر حلف اٹھانے سے کمال جرأت اور بلند ہمتی سے انکار کر دیا تھا اور ہماری عدالتی تاریخ کے صفحات پر ایک تابندہ روایت کا لازوال نقش ثبت کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ وہ اعلیٰ نوعی حکام کی چکنی چپڑی باتوں اور خوفناک دھمکیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آئین کی بالادستی پر ڈٹے رہے اور ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس پر قوم فخر کرتی رہے گی۔ پچھلے دنوں ملک میں ایسے حالات پیدا ہوئے جن میں عدالت عظمیٰ کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا گیا۔ یوں لگا کہ وہ ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آگئی ہے چنانچہ ہم نے محسوس کیا کہ سابق چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی سے نہایت حساس موضوعات پر تبادلہ خیال ہمارے قارئین کے لیے بہت مفید رہے گا۔ اس کے علاوہ ان عوامی کامرانیوں کا ناہمی غایت درجے دلچسپی کا باعث ہوگا جنہوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان سے کئی بار پہلے بھی ملاقاتیں رہیں اور ہر ملاقات نے ان کی فکری اصابت اور ذہنی استحکام کا احساس دلایا۔ ان کا مزاج سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا دلکش بھی ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دو ستر کے پٹے میں تھے لیکن وہ کرسی پر اس طرح تن کر بیٹھے تھے جیسے وہ پوری طرح تازہ دم ہوں اور ایک مشنری جذبے نے انہیں ماہ و سال سے ماہرا کر دیا ہو۔

میرا ان سے پہلا سوال تھا کہ عدالت عظمیٰ کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچنے کی پوری کہانی کیا ہے اور آپ کی تربیت میں خاندان امداد اور آپ کے تجربات کا حصہ کیا کیا ہے انہوں نے کسی نامل کے بغیر اپنے حالات زندگی سنانا شروع کر دیے جو سادہ ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ گئے:

”نومبر ۱۹۳۷ء میں گلگت میں پیدا ہوا جہاں میرے پردادا لاکھنؤ سے ہجرت کر کے گئے تھے جن کا بہت اچھا کاروبار



غضب کرنے والے اپنے بیٹوں میں رشوت کی آگ بھرنے والے ٹیکس چوری کرنے والے دفاتر اور تعلیمی اداروں میں اپنے فرائض سے کوتاہی برتنے والے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے والے طاقت کے زور پر اپنی بات منوانے والے اور ایک فرد کو ناقص قتل کر دینے والے اور بستیاں اُجاڑ دینے والے ایک ہی خطرناک ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کے لیے تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مستقل بنیادوں پر جہاد کرنا ہوگا۔ ہماری آج سب سے بڑی ضرورت ہمارے ذہنی رویوں میں ایک عظیم تغیر پیدا کرنا ہے۔

دوسری اہم بات صحیح ترجیحات کا تعین ہے۔ ہمارے منصوبہ سازوں کو داخلی سلامتی کی اہمیت اور تقاضوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اور ایک بے حد ضروری ہے۔ ہماری خاطر ترجیحات اور ہمارے غیر متوازن رویوں نے پاکستان کا پورا انفراسٹرکچر تباہ کر ڈالا ہے جس کے باعث سیکورٹی کے ادارے صحیح طور پر کام کر رہے ہیں نہ تحقیقاتی ایجنسیوں کے درمیان ایک مضبوط اور مربوط کوآرڈینیشن موجود ہے کیونکہ وہ مجرموں اور دہشت گردوں کے بجائے سیاسی اور معاشی مفاد کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ مزید برآں سیاسی جماعتوں کے اندر اور سول اور فوجی قیادتوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش بڑے بڑے بحران پیدا کرتی رہی اس لیے ایک طرف وزیراعظم کو پوری سنجیدگی کے ساتھ جی اتھ کیوں سے قومی سلامتی کے خدوخال کی صورت گیری کے علاوہ ان کے لیے وسائل مہیا کرنا ہوں گے اور دوسری طرف سیاسی جماعتوں کے اتحاد اور یگانگت کو قائم رکھنے کے لیے آپس کے اختلافات طے کر لینا از بس لازم ہے۔ اگر ایک بار پھر سیاسی بے یقینی عود کر آئی تو دہشت گردوں کو اپنے ناپاک منصوبوں پر عمل کرنے کا موقع مل جائے گا۔

پوری قوم شدت سے محسوس کر رہی ہے کہ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور اس کے اندر ایک بھائی کیفیت پائی جاتی ہے مگر ریاست جو ایک ماں کی طرح شفیق ہوتی ہے اسے سخت سے سخت قدم بھی مروج سمجھ کر اور مہذب انداز میں اٹھانا چاہیے۔ اس امر کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا کہ فوجی عدالتوں سے کسی بے گناہ کو سزا نہ دی جائے اور ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس طرح یہ بات بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ دہشت گردوں سے وابستہ سیاسی اور معاشی مفادات ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریاتی اسباب کا بھی قلع قمع کیا جائے۔ اس کے لیے حکومت کو راست فکر، نفاذی اہل دانش اہل قلم اور میڈیا کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ ہمارے تجزیے کے مطابق ملک میں ادارے بھی موجود ہیں انتہائی قابل ماہرین بھی اور تجربے کار تنظیمیں بھی مگر وہ سیاسی مداخلت اور کرپشن کے غیر معمولی پھیلاؤ کے باعث غیر فعال ہیں اور تمام تر ہارگراں فوج پر آن پڑا ہے۔ کمیشنوں کے رپورٹوں کے دائرے سے باہر آ کر ہماری مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں اس پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیں کہ ان کا ہر فیصلہ اور بڑے مناصب پر تقرر میرٹ کے مطابق ہوگا قرابت وادوں کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا پولیس کے سربراہ خود مختار ہوں گے اور ان کی جنس کے ادارے سیاسی شخصیتوں کے بجائے مجرموں کا تعاقب کریں گے جبکہ حکمران اور حکام سادہ زندگی کا نمونہ پیش کریں گے تو ہر سوتو امانی کے چشمے بہہ نکلیں گے دہشت گردوں کو کہیں بھی جائے پناہ نہیں ملے گی اور قوم جنگ جیتنے کے لیے میدان میں اتر آئے گی۔ اور یہی ہماری تاریخ کا فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوگا۔

الطاف حسن قاسمی



جنرل پرویز مشرف اور شریف صاحب نے اپنے دور میں پاکستان کے لیے کیا خدمات

تھا۔ میرے والد صاحب اپنے خاندان میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے پہلے فرد تھے۔ انہوں نے 1932ء میں میرے دادا جی کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے بجائے ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی لیکن جب اسی سال جاپان نے کلکتے پر بمباری کی تو ہم دو بارہ لکھنؤ آ گئے۔ میں نے ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی لیکن میٹرک ڈھا کے سے کیا کیونکہ تقسیم ہند کے بعد ہم نے پاکستان ہجرت کر لی تھی۔

ڈھا کے کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا اُس وقت وہاں حالات کیسے تھے اور آپ نے کیا مٹا لیا تھا؟ جنس صاحب نے بڑی صفائی سے جواب دیا:

”ہم نے وہاں آباد ہونے کی بڑی کوشش کی مگر ماحول کچھ سازگار نہیں تھا اور وہاں نفرت پائی جاتی تھی۔ دراصل مغربی پاکستان سے جو افسر وہاں بھیجے گئے انہوں نے حالات بہت خراب کیے تھے کیونکہ ان کا بنگالیوں کے ساتھ رویہ اہانت آمیز تھا۔ میں نے جگن ناتھ کالج ڈھا کے سے انٹرسائنس میں کیا۔ اس وقت تک وہاں اردو زبان کے مسئلے پر خونیں فسادات ہو چکے تھے اور ”شہید مینار“ تعمیر کر لیا گیا تھا۔ پھر 1953ء میں وہاں انتخابات ہوئے جن میں ”جگنو فرٹ“ نے مسلم لیگ کو عبرت ناک شکست دی۔ مواوی فضل الحق کی حکومت بنی مگر چنا گنگ پھیل میں ہولناک فسادات ہوئے جو کلکتا تک پھیل گئے۔ ان کے نتیجے میں گورنر راج نافذ ہوا اور فضل الحق کی حکومت ختم کر دی گئی جس میں شیخ مجیب الرحمان وزیر تھا۔ ہم 1956ء کے دستور کی تدوین سے پہلے ہی کراچی آ گئے تھے اور مسلم لیگ کو اترز میں رہنے لگے۔ بی اے میں نے ایم اے قریشی کالج سے کیا جو زمین کی چادروں سے بنایا گیا تھا مگر وہاں کے اساتذہ بہت قابل اور فرض شناس تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ بی اے اکنامکس کرنے کے بعد ایس ایم لاکھ سے قانون کی ڈگری لی۔“

میں نے پوچھا آپ اکنامکس سے قانون کی طرف کیسے مائل ہوئے۔ انہوں نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ کہتے گئے: ”میرے پڑوس میں ایک معروف قانون دان غلام علی میمن رہتے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ایم اے کرنے کے

عدلیہ میں سوال و جواب سے زیادہ کام کرنا ہے، لیکن اسی کی تنخواہ سب سے کم ہے

آجائے۔ جب وہ قریب گئے تو بھٹو صاحب نے پوچھا چیف صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو بیٹھنے کے لیے کرسی کیوں نہیں دی؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ میں جب طالب علم تھا اور پاسپورٹ بنوانے پاسپورٹ آفس گیا تو آپ کے والد پاسپورٹ انسر تھے۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کرسی نہیں دی تھی اس لیے میں نے آج آپ کو کھڑا رکھا تھا۔ ہم اس واقعے سے مہبوت ہو کے رہ گئے کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اس قدر تنگ ذہنیت کا ثبوت بھی دے سکتا ہے۔ میرے ذہن کی اسکرین پر اور بہت ساری تصویریں ابھرنے لگیں جو بڑی روح فرساتھیں۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا اور اپنی توجہ دوبارہ جسٹس صاحب کے منظر دور منظر سفر پر مرکوز کر دی اور ان سے پوچھا کہ آپ وکالت میں کب آئے اور اس کے اندر کے بیج رخم کیسے گئے تھے؟ انھوں نے داستان حیات کے ورق اٹتے ہوئے کہا:

”یہ پیشہ 1961ء میں اختیار کیا اور جناب اور ایس قریبی کے چیمبر میں ایک سال تک اٹرنی کے طور پر کام کرتا رہا۔ مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے میں نے 1960ء میں پی پی آئی بلڈنگ میں اپنا دفتر قائم کر لیا۔ کچھ عرصے بعد شریف الدین پیرزادہ بھی میرے برابر والے کمرے میں شفٹ کر گئے اور ان سے بہت میل جول ہو گیا۔ وہ جنرل یحییٰ خاں کے دور حکومت میں انارڈنی جنرل تھے۔ جب عاصمہ جیلانی کا کیس عدالت عظمیٰ میں آیا تو یحییٰ خاں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے حکومت سنبھالتے ہی شریف الدین پیرزادہ کی خاں نکلائی اور انھیں برطرف کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ لیکن شریف الدین پیرزادہ بڑے سیانے اور دورانہدیش ننگے اور فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اس زمانے میں تمام دوست ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور میں واحد شخص تھا جو ان کا ساتھ دیتا تھا۔ بھٹو صاحب نے ان کا نام ای کی ایل میں ڈال دیا۔ شریف الدین پیرزادہ بھٹو کے دور حکومت میں خاموش رہے اور جنرل منیاہ الحق کے زمانے میں پہلے وزیر خارجہ اور بعد ازاں وزیر قانون مقرر ہوئے۔“

۲۶

سابق چیف جسٹس جناب سعید الزماں صدیقی جو بہت سارے راز ہائے سرسبز کے امین ہیں ان کی باتیں ہمیں بہت دلچسپ لگیں اور یہ جاننے کی جستجو پیدا ہوئی کہ عاصمہ جیلانی کیس کی ہماری قومی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ انھوں نے سادہ الفاظ میں کہنا شروع کیا:

”عاصمہ جیلانی کیس واحد کیس ہے جس میں فیصلہ آیا کہ جنرل یحییٰ خاں عاصمہ ہے۔ چیف جسٹس حمود الرحمن نے فیصلہ دیا تھا جو آج بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے بعد نصرت بھٹو کیس کا جو فیصلہ سپریم کورٹ نے دیا، اس پر بھی عاصمہ جیلانی مقدمے کا فیصلہ سب سے فکرن رہا تھا۔“

”اصل میں ہوا یہ تھا کہ یحییٰ خاں کے دور میں عاصمہ جیلانی کے والد غلام جیلانی قید کر لیے گئے۔ اس پر ان کی بیٹی عاصمہ جیلانی نے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی۔ وہاں عبدالعزیز خاں چیف جسٹس تھے جنہوں نے رٹ خارج کر دی۔ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی۔ اس وقت حمود الرحمن چیف جسٹس تھے۔ اس میں سب ججوں کا متفقہ فیصلہ

بجائے قانون کی تعلیم حاصل کرو وکالت ایک سزز پیشہ ہے اور اس میں بڑی آزادی ہے۔ گھر والوں نے بھی یہی صاحب کے مشورے کو درست سمجھا چنانچہ میں نے 1960ء میں ایس ایم لا کالج سے لا کیا جس کے پرنسپل حسن علی عبدالرحمان تھے جن کے چھوٹے بھائی طفیل علی عبدالرحمان جنرل یحییٰ خاں کے زمانے میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے، مگر بھٹو صاحب ان سے ایک معاملے میں وقت ناراض ہو گئے تھے۔“

اتنے میں چائے آگئی اور سلسلہ کلام ٹوٹ گیا جبکہ میں اس واقعے کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے بے قرار تھا جو دونوں کے درمیان تنازع کا باعث بنا تھا۔ میرے چہرے پر تجسس کے آثار دیکھتے ہوئے جسٹس صاحب نے رواں لہجے میں کہنا شروع کیا:

”سیشن جج سائیکس نے ایک ایسے شخص کو ضمانت پر رہا کر دیا جسے بھٹو صاحب مزا دلانا چاہتے تھے۔ اس پر انھوں نے سیشن جج کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ انھوں نے ضمانت کے لیے ہائی کورٹ میں درخواست دی۔ چیف جسٹس طفیل علی عبدالرحمان نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا اور ان کی گرفتاری پر احتجاج بھی کیا۔ اس پر بھٹو صاحب ناراض ہو گئے۔ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار مختلف انداز میں کرتے تھے اور متعلقہ شخص کی بے عزتی کرنے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ میں اس ضمن میں آپ کو ایک واقعہ سنانا ہوں جو ان کی جہالت کا مظہر ہے۔ ہمارے زمانے میں غلام علی رانا ایڈیشنل جج تھے اور انھیں کنفرم نہیں کیا جا رہا تھا۔ جب ان کی کنفرمیشن کا وقت آیا تو بھٹو صاحب نے انہیں اسلام آباد بلا دیا۔ ان دنوں ایوان صدر راولپنڈی میں تھا اور صدر بھٹو کے دفتر میں صرف دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پر وہ خود بیٹھتے اور دوسری کرسی پر ملاقاتی۔ جج صاحب سے ملاقات کرتے وقت دوسری کرسی اٹھالی گئی۔ وہ پچارے شریف آدمی تھے بھٹو صاحب کے سامنے کھڑے رہے اور کہا کہ آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے علاوہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ ابھی تک آپ کو جج کی حیثیت سے کنفرم نہیں کیا گیا۔ جب وہ جانے لگے تو بھٹو صاحب نے کہا کہ میرے قریب



بھٹو صاحب اپنی ناراضی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے اور متعلقہ شخص کی بے عزتی کر کے خوش ہوتے

خندق کو عبور کرنے کے لیے جو قانونی پل فراہم کیا تھا وہ قانونی ضرورت کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ جناب صدیقی نے تاریخی واقعات کو ترتیب دیتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی:

”میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ ۱۹۵۳ء میں جب تمیز الدین کیس چلا تو سندھ چیف کورٹ نے گورنر جنرل کے اقدام کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دے دیا جبکہ چیف جسٹس منیر نے میرٹ پر فیصلہ دینے کے بجائے کہا کہ سندھ چیف کورٹ نے جو رٹ جاری کی ہے اس کا اسے قانونی اختیار حاصل نہیں کیونکہ وہ آرٹیکل ۱۷۳ کے تحت جاری ہوئی ہے جس کی توثیق گورنر جنرل نے نہیں کی تھی اس لیے یہ لاگو نہیں ہوتی۔ اب وہ فیصلہ تو آگیا لیکن اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۳ء تک جتنے قانون بنے تھے وہ کا اعدام قرار پائے۔ ان میں کسی پر بھی گورنر جنرل کے دستخط نہیں تھے۔ پھر یوسف پٹیل کیس میں جسٹس منیر ہی کا فیصلہ ہے کہ جتنے قوانین کا اعدام ہو چکے ہیں ان کی پچھلی تاریخوں سے منظوری دینا گورنر جنرل کے اختیار میں نہیں۔ یوں ایک بولناک قانونی بحران پیدا ہو گیا اور حکومت نے اس خطرناک صورت حال کا حل تلاش کرنے کے لیے فیڈرل کورٹ کو ریفرنس نمبر ایک بھیجا۔

”جب یہ ریفرنس جسٹس منیر کے پاس آیا تو اس نے فیصلہ دیا کہ نئی اسمبلی بنے گی اور اس میں سارے قوانین پیش ہوں گے۔ اگر یہ قوانین پاس ہوئے تو لاگو ہوں گے ورنہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ ہے نظریہ ضرورت جو جسٹس منیر نے ریفرنس نمبر ایک میں نکالا، تو یہ فیصلہ اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ اس کے بعد نئی اسمبلی بنی جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں طرف کے نمائندے آئے جنہوں نے کا اعدام قوانین کی توثیق کی اور ۱۹۵۶ء کا دستور منظور کیا تھا۔“

ماضی کے واقعات سے یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ اقتدار کے پہاڑوں نے قانون اور آئین پر بار بار شکنجوں مارے اور بار بار خطرناک صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ اب میں شیردل جسٹس سعید الزماں صدیقی سے اس شکنجوں کا حال سننا چاہتا تھا جو جنرل پرویز مشرف نے اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ڈرامائی انداز میں مارا تھا۔ انہوں نے سلسلہ ہائے روز و شب کا حساب کرتے ہوئے کہا:

”۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل مشرف نے حکومت پر قبضہ کیا تو ۱۴ اکتوبر کو ہمارے گھر اسلام آباد آیا۔ چیف جسٹس ہاؤس تو ابھی نہیں بنا تھا لیکن جگہ نمبر ایک جسٹس ہاؤس قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ اپنی پوری پلٹن کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ میں سری لنکا سے آ رہا تھا کہ نواز شریف نے ہمارا اطمینان ہائی جیک کر لیا۔ وہ ایک طویل کتھا سنا کر رہا۔ میں نے اس سے وہ باتیں کہیں۔ پہلی یہ کہ آپ عدالتوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ دوسری یہ کہ پی سی او آئے گا نہ کوئی رنج اس کے تحت حلف لے گا۔ اس نے مجھے دونوں باتوں کی ضمانت دی۔ چار مہینے تک وہ اس پر کار بند رہی رہا لیکن اس دوران پشاور ہائی کورٹ کا جج ریٹائر ہو گیا۔ ان کی جگہ میاں رحمت اللہ کو حلف لینا تھا۔ میرے پاس اتارنی جنرل عزیز بخش آیا اور پوچھا کہ میاں رحمت اللہ کو حلف لینا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کا چیف آیا تھا اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئین کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ یہ بھی کہا کہ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے میں لکھا ہے کہ آئین ملک کا سپریم

سامنے آیا جو ڈوسو کیس میں دیے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے سے یکسر مختلف تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ طاقتور فیصلہ جسٹس یعقوب علی نے لکھا جس کا عدالتوں کے اندر حوالہ دیا جاتا ہے۔ انہوں نے قدرے گہرائی سے آئینی اور قانونی نکات کا جائزہ لے کر بڑی صراحت اور تفصیل سے فیصلہ لکھا تھا۔ فیصلہ سنانے والا جج سات جج صاحبان پر مشتمل تھا۔“

جسٹس صاحب نے اپنی گفتگو میں ڈوسو کیس کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے سوال کیا کہ ہماری تاریخ پر کون کون سے عدالتی فیصلے اثر انداز ہوئے اور آپ آئندہ سپریم کورٹ کا کردار کیسا دیکھتے ہیں؟ انہوں نے تاریخی حوادث کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہا:

”میں آپ کو بڑے بڑے عدالتی فیصلوں کے بارے میں بتائے دیتا ہوں۔ ایک بڑا فیصلہ تمیز الدین خان کیس میں ہوا جو ۱۹۵۴ء میں سامنے آیا۔ اس کے بعد ڈوسو کیس بہت اہم ہے جس میں چیف جسٹس محمد منیر نے ایوب خان کے فوجی انقلاب کو سندھ جواز عطا کی اور اس میں ”کامیاب انقلاب“ کا نظریہ ایجاد ہوا۔ یہ ۱۹۵۸ء میں فیصلہ ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں یحییٰ خان کے غاصب ہونے کا فیصلہ سامنے آیا۔ اس کے بعد نصرت بھٹو کا کیس آیا جس کا فیصلہ چیف جسٹس انوار الحق نے سنایا اور جنرل ضیاء الحق کی فوجی بغاوت کو جائز قرار دیا تھا۔“

جسٹس صاحب نے چار اہم عدالتی فیصلوں کا حوالہ دیا جو ہماری تاریخ پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوئے تھے اور ان کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاتے ہیں چنانچہ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان میں ہمارے بڑے دکلا اور قانون دانوں کا رول کیا رہا؟ ان سے پوچھا کہ عاصمہ جیلانی کیس میں کون سے نامور وکیل پیش ہوئے اور کیا دلائل دیے تھے؟ انہوں نے بے ساختہ کہنا شروع کیا:

”شریف الدین بھیرزادہ اس وقت اتارنی جنرل تھے لیکن انہوں نے کہا کہ میں ریاست کے بجائے عدالت کے معاون کے طور پر پیش ہوں گا۔ ریاست کی طرف سے اسے کے بروہی پیش ہوئے۔ انہوں نے وہ دلائل دیے جن پر ڈوسو کیس کا فیصلہ ہوا تھا جبکہ شریف الدین بھیرزادہ نے وہ لائن اختیار نہیں کی۔ وہ بہت ہوشیار آدمی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب آئین موجود ہے، تو اس کے مطابق امور مملکت چلانا ضروری ہیں۔ انہی کے دلائل پر جنرل یحییٰ خان کو غاصب قرار دیا گیا جو ججوں کو پسند آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ اگر عوام کی فلاح میں کوئی اچھا قدم اٹھ چکا ہوتا تو آپ اسے ریورس نہیں کریں گے یعنی ججوں نے ماضی میں جو فیصلے اس بنیاد پر دیے ہیں ان پر نظر ثانی نہیں ہوگی۔ میرے خیال میں ”نظریہ ضرورت“ میں بھی کوئی خرابی نہیں۔ ہمارے ہاں جو خرابی پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ اسے قانونی جواز کا نظریہ بنا دیا گیا۔ آپ چیف جسٹس منیر کا فیصلہ پڑھیں تو آپ اس کی معقولیت کے قائل ہو جائیں گے۔“

انٹرویو کے بعد میں نے نظریہ ضرورت کے بارے میں چیف جسٹس منیر کا ایک لکھا: واقعات پر حلاجی میں تحریر تھا:

”ہم ایک خندق کے کنارے آ پینچے ہیں جہاں ہمارے سامنے تین راستے ہیں۔ (۱) جس راہ سے ہم یہاں تک آئے ہیں اسی راہ واپس مڑ جائیں۔ (۲) خندق پر ایک قانونی پل تعمیر کر کے اسے عبور کر لیں۔ (۳) خندق میں چھلانگ لگا کر تھامی کا شکار ہو جائیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ ریفرنس نمبر ایک میں فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل ملک غلام محمد اور جسٹس منیر کی کھودی ہوئی

”پھر نومبر کے مہینے میں جنرل صاحب نے ایک آرڈیننس نکالا۔ اس میں لکھا تھا کہ آئینہ بالی کورٹ اور سپریم کورٹ میں جو بھی ججوں کی تقرری ہوگی ان سے وہی حلف لیا جائے گا جو آئین میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عدالتوں سے کسی قسم کا تصادم نہیں چاہتا تھا لیکن ۲۵ جنوری ۲۰۰۰ء کو پی سی او جاری ہو گیا۔ ۲۴ جنوری کو مشرف کے پرنسپل سیکرٹری کا مجھے پیغام آیا کہ جنرل صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں تمہاری دیر کے لیے پرائم منسٹر ہاؤس آجائیں۔ خیر میں وہاں چلا گیا۔ وہ اپنی جنرل کی آؤٹ فٹ میں تھا اور کہیں باہر سے سے آ رہا تھا۔ اس نے بیٹھے ہی کہا کہ صدیقی صاحب! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کل پی سی او جاری کر دیا جائے گا اور تمام جج صاحبان کو نیا حلف دیں گے۔ میں نے کہا آپ نے وعدہ کیا تھا کہ عدالتی امور میں مداخلت نہیں کریں گے۔ کہنے لگے یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کمنٹ کی تھی اور میں اب بھی آپ سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ہم اس کے بغیر حکومت نہیں چلا سکیں گے۔

میں نے کہا آپ ان کی بات سن لیں یا جو مجھ سے وعدہ کیا تھا اس پر کار بند رہیں۔ کہنے لگے، اچھا جن صاحب نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے میں ان کو بلا لینا ہوں آپ ان سے بات کر لیں۔ میں نے کہا کہ جب آپ میرے گھر آئے تھے، تو صرف آپ سے میری بات ہوئی تھی اور کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا، یہاں تک کہ آپ نے اپنے سیکرٹری کو بھی نکال دیا تھا۔ اب میں تیسرے آدمی سے کیا بات کروں؟ جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے کہا کہ انہیں بلا لیں۔ وہ شریف الدین پیرزادہ تھے جو وہیں بیٹھے تھے۔ وہ اور عزیز منشی دونوں آ گئے۔ دراصل اگلے دن یعنی ۲۶ جنوری کو میرے پاس ظفر علی شاہ کا کیس لگا ہوا تھا جس کے لیے میں نے ۱۲ بجوں کا بیچ بنایا تھا۔ ان کو یہ شبہ تھا کہ میں نصرت بھٹو کے فیصلے کو اور رول کرنے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو کل حلف دیں گے۔ میں نے کہا میں حلف نہیں لے رہا کیونکہ میں پہلے ہی انکار کر چکا ہوں۔ خیر انہوں نے بہت کوشش کی اور خاصی گر ماری بھی ہوئی۔

میں نے کہا آپ کا بھی وہی مشر ہوگا جو ایوب خان کا ہوا تھا۔ آپ کے لیے وعدہ خلافی مناسب نہیں۔ میں نے واضح کیا میں کسی قیمت پر حلف نہیں لوں گا۔ اس پر بڑی تلخی بھی ہوئی۔ میں انہوں کے چلا آیا، تو عزیز منشی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ میں نے کہا، کتنے بے وقوف آدمی ہوں! کہنے لگا، یہ تو ٹھیک ہے مگر میں کیا کروں، یہ جو کچھ ہوا ہے، شریف الدین پیرزادہ نے کیا ہے۔ یوں میں وہاں سے گھر آ گیا تب مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ رات ۹ بجے مجھے جی ایچ کیوں سے فون آیا کہ دو تین جرنیل آپ سے ضروری بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا آ جاؤں۔ کوئی ساز جسے فوج کے قریب جنرل مصین الدین حیدر، احسان الحق اور جنرل محمود آئے۔ ان کے ساتھ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ وہ تو اٹھ کے باہر چلے گئے اور یہ تینوں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے کہا، جی کیسے آئے ہیں؟ کہنے لگے، ہم آپ کے لیے چیف صاحب کا پیغام لائے ہیں کہ کل صبح چیف جسٹس کا حلف آپ لیں۔ میں نے کہا، میں تو آپ کے چیف کو وزیر اعظم ہاؤس آتی ہوں انکار کر آیا ہوں۔ خیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ جنرل محمود بہت جوشیلا تھا وہ تمہارا نام پھر دینے لگا۔

جسٹس صدیقی صاحب نہایت اہم راز افشا کر رہے تھے اور میں نصرت بھٹو کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا فیصلہ چیف جسٹس انوار الحق نے سنایا تھا اور میں عدالت کے اندر موجود تھا۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کی حکومت کو سند جواز عطا

کرنے کے علاوہ اسے دستور کے اندر ترمیم کا حق بھی دیا تھا۔ حالانکہ عاصمہ جیلانی کیس میں عدالت عظمیٰ نے منصف فیصلہ دیا تھا کہ آئین پریم ہے اور اسے تحلیل یا معطل کرنے والا شخص غاصب ہے۔ میں نے سابق چیف جسٹس سے دریافت کیا کہ چیف جسٹس انوار الحق نے ہاشمی کے فیصلوں سے انحراف کیوں کیا تھا۔ انہوں نے جواب میں ایک چشم کشا واقعہ سنایا:

”یہ واقعہ مجھے خود شریف الدین پیرزادہ نے سنایا جو اس وقت غالباً وزیر قانون تھے۔ نصرت بھٹو کیس میں فیصلہ محفوظ کرنے کے بعد کسی دعوت میں چیف جسٹس انوار الحق ان سے ملے۔ میں ان دنوں شاہراہ فیصل پر رہتا تھا اور شریف الدین پیرزادہ سے میری بہت دوستی تھی۔ وہ ایک رات دو بجے میرے پاس آئے۔ میرے گھر کے عقب میں انگیسی تھی جس کو لاہری ریل بنا رکھا تھا۔ میں ان کو وہاں لے گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ جسٹس انوار الحق کا جو فیصلہ آیا ہے کیا آپ نے دیکھا ہے؟ میں نے کہا، ہاں اس نے انجمن دستور میں ترمیم کا بھی اختیار دے دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ کیسے ہوا؟ پھر اس نے بتایا کہ جب میں جسٹس صاحب سے ملا تو انہوں نے انکشاف کیا کہ میں کل یا پرسوں فیصلہ جاری کر دوں گا۔ اس پر میں نے کہا، وہ قطعی تاریخ بتادیں جب آپ فیصلہ سنانے والے ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا، آپ وہ تاریخ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہم اسی روز ایک تقریب کریں گے۔ چیف جسٹس نے پوچھا، یہ تقریب کس لیے ہوگی؟ میں نے جواب دیا کہ جسٹس یعقوب علی کو بنا کر ہم نے آپ کو چیف جسٹس بنایا تھا۔ جسٹس یعقوب علی کو مسز بھٹو نے چھٹی ترمیم کے ذریعے چیف جسٹس بنایا تھا اور ضیاء الحق نے اس ترمیم کو ختم کر کے آپ کو چیف جسٹس بنایا ہے جبکہ آپ اصل آئین کے مطابق چیف جسٹس نہیں بن سکتے تھے۔ اگر آپ فوجی حکمران کو آئین کے اندر ترمیم کا اختیار نہیں دیتے تو چھٹی ترمیم بحال کر دی جائے گی اور ایک نئے چیف جسٹس حلف اٹھا لیں گے۔ میری بات سننے کے بعد انہوں نے اپنے تحریر شدہ فیصلے میں اضافہ کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق کو آئین میں ترمیم کا اختیار دیا تھا۔“

”میں نے کہا، میں نے فیصلہ نہایت سوچ سمجھ کے کیا ہے۔ یہ کوئی رات گیارہ بجے تک مجھ سے بحث مباحثہ کرتے رہے۔ پھر جانے وقت کہ گئے کہ آپ مزید سوچ لیں صبح ۶ بجے ہمارا آدمی آئے گا اور آپ کا آخری جواب معلوم کرے گا۔ ٹھیک ۶ بجے میرے پاس ایم آئی کا ایک میجر آیا اور پوچھا کہ سر! آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میرا فیصلہ وہی ہے جو میں آپ کے چیف صاحب کو بتا چکا ہوں۔ اس نے بر ملا کہا کہ جی ایچ کیوں کی طرف سے دوسرا پیغام آپ کے لیے یہ ہے کہ گیارہ بجے تک گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔ ان کو شبہ تھا کہ اگر میں باہر چلا گیا، تو مبادا کوئی اور جج بھی حلف لیتے سے انکار کر دے۔ مجھے جج تو پہلے ہی باہر ہو گئے تھے اور سندھ کے سارے ججوں نے حلف لینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرا تصادم کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے میرے گھر کے چاروں طرف پولیس اور فوج تعینات کر دی کہ کوئی شخص باہر جانے سکے۔ ۱۲ بجے کے قریب انہوں نے مجھے ٹیل فون کیا کہ حلف برداری ہوگئی ہے اور اب آپ گھر سے باہر جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد میڈیا کے لوگ آ گئے اور بہت ہنگامہ رہا۔“

میں نے دل ہی دل میں ان کی عزیمت کو سلام کیا کہ وہ پہلے بہادر اور یا اصول چیف جسٹس ہیں جنہوں نے پی سی او

کے سامنے مرتبہ کانے کے بجائے اسے سسزہ کر دیا فوجی آمریت سے کوئی سمجھتا نہیں کیا اور آئین کے ساتھ وابستگی کی ایک درخشندہ روایت قائم کی ہے۔

چائے کی پیالی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور اس کی خوشبو دکھوت نوش دے رہی تھی۔ دو چار گرم گرم چسکیاں لیں تو جسٹس صاحب کی باتوں کا لطف دو آفتاب ہو گیا۔ وہ اپنی حکایت جاتھرا سنا رہے تھے:

”چیف جسٹس سجاد علی شاہ پہلے سندھ ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے۔ ان کے بعد میں چیف جسٹس بنا تھا۔ شاہ صاحب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انھیں سپریم کورٹ بھجوانے میں میرا ہاتھ ہے۔ وہ سندھ ہائی کورٹ ہی سے ریٹائر ہونا چاہتے تھے۔ میرے چونکہ وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ سے تعلقات تھے اس لیے سجاد علی شاہ سمجھتا تھا کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے حالانکہ یہ بات بالکل نہیں تھی۔ معاملہ بڑا سادہ تھا۔ انھوں نے عدالتی معاملات میں گڑبڑ کی تھی اور وہ زرداری کے قریب تھے اور انھوں نے زرداری کو ایک کیس میں ضمانت بھی دی تھی۔ میں نے جب وہاں چیف جسٹس کا حلف لیا تو مجھے ایسی تصویریں ملیں جن سے لگتا تھا کہ ان کے زرداری صاحب سے خاندانی تعلقات ہیں۔ اس کے بعد آخر فرق کا معاملہ سامنے آیا۔ وہ زرداری کا ہم جماعت تھا۔ بے نظیر نے اسے ۴۴ جوں کو نظر انداز کر کے سپریم سیٹ دی تھی۔ اس پر سجاد علی شاہ نے سوئف اختیار کیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر زرداری نے بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا اور اسے کہا کہ ”سالے تم کیسے بیچ بن گئے تھے تم بھی تو جونیئر تھے۔“ سجاد علی شاہ چوتھے نمبر پر تھا جب وہ چیف جسٹس بنایا گیا تھا۔ ان کی فائل پر بے نظیر نے یہ لکھا تھا کہ ”وہ اچھی جوان ہے اور اچھل میاں انتظار کر سکتا ہے۔“ اور دوسری بات یہ لکھی تھی کہ وہ بہت مددگار ہے۔

”اس کے فوراً بعد صوبہ سرحد میں گورنر راج نافذ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی عدالت عظمیٰ میں رٹ دائر ہوئی جسے صرف سب سے سینئر جج ہی سن سکتے تھے۔ ہم سات ججوں کا بیچ تھا۔ سجاد علی شاہ مجھے تو بیچ سے نکال نہیں سکتے تھے کہ میں کنفرم جج تھا۔ اس نے دو جونیئر جج نکالے اور اڈباک پر دو بیچ لے آئے۔ دو تین جج پنجاب کے تھے جن کے تعلقات ان کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ اگر آپ وہ فیصلہ پڑھیں تو محسوس کریں گے کنفرم ججوں کا فیصلہ اور ہے اور اڈباک جج کا کچھ اور۔ انھوں نے پانچ کنفرم ججوں کا فیصلہ نظر انداز کر دیا اور اڈباک ججوں کا فیصلہ درست قرار دے دیا۔ ہم چونکہ پانچ جج تھے تو ہمیں کاؤنٹر کرنے کے لیے ان کو بھی پانچ جج کا بیچ بنانا پڑا چنانچہ انھوں نے دو اڈباک پر لیے اور تین پنجاب کے جج ان کے ساتھ تھے یوں کل پانچ ججوں کا بیچ بنا دیا۔ پھر اس کے عوض بے نظیر نے انھیں مرسیڈیز گاڑی دی۔ ہم نے تو اسی وقت واپس کر دی کہ ججوں کے لیے جو ۱۵۰۰ یا ۱۶۰۰ سی سی گاڑی ہے وہی ٹھیک ہے۔ سجاد علی شاہ نے ایک کام اور ناکام کیا کہ کبھی فل کورٹ میٹنگ نہیں بلائی۔ فل کورٹ میں تمام جج ہوتے ہیں جو سال بھر کا پروگرام بناتے ہیں۔ وہ ۱۹۹۳ء میں چیف جسٹس بنے لیکن ۱۹۹۳ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک انھوں نے کبھی فل کورٹ میٹنگ نہیں بلائی۔ اس نے ایک کام اور کیا کہ جتنے سینئر جج تھے ان میں سے کسی کو کوئٹہ کسی کو کراچی اور کسی کو کہیں اور بھیج دیا اور مجھے پشاور بھیج دیا۔ تین جج کوئٹہ تین کراچی اور دو پشاور میں۔ پنجاب سے جو پانچ جج یہ لائے تھے وہ ان کے ساتھ اسلام آباد بیٹھے رہتے تھے۔

”پھر یہ ہوا کہ کوئٹہ کے تین جج ان کے خلاف ہو گئے۔ ۱۹۹۶ء میں ایجوکیشن کی رٹ پر چیف جسٹس کی تقرری کے حوالے سے جو جج کا فیصلہ آیا تھا وہ سجاد علی شاہ نے دیا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ سینئر مومٹ جج ہی چیف جسٹس بن

شریف الدین پیرزادہ نے جنرل پرویز مشرف کو مشورہ دیا تھا کہ ججوں سے پی سی او پہ حلف لیا جائے

سکتا ہے۔ سجاد علی شاہ نے اس میں یہ بھی لکھا کہ اس فیصلے کا مجھ پر اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ پہلے ہی اس کے تقرر کے خلاف پشاور میں ایک رٹ دائر تھی کہ وہ سب سے سینئر جج نہیں تھے۔ کوئٹہ میں لوگ درخواست پر درخواست دے رہے تھے کہ اس فیصلے پر عمل کیا جائے۔ کوئٹہ میں مولانا ظلیل الرحمن، ارشاد حسن خان اور جسٹس ناصر اسلم زاہد سپریم کورٹ کے بیچ پر تھے۔ اس کے بعد پشاور میں میرے پاس صاحبزادہ سعید نے رٹ دائر کی اور اس میں براہ راست یہ الزام لگایا کہ جج کیس کے مطابق سجاد علی شاہ کی تقرری درست نہیں۔ ہم نے نوٹس دیا لیکن کوئی حکم صادر نہیں کیا کہ انکشن پہلے ہی کوئٹہ عدالت کا موجود تھا۔ جب نوٹس ہوا تو انھوں نے سارے ججوں سے کہا کہ انھیں میرے خلاف کیس سننے کا کوئی حق نہیں ہے پشاور۔ سجاد علی شاہ نے کہا کہ آرٹیکل ۱۸۳ء کے تحت چیف جسٹس فیصلہ کرے گا کہ یہ کیس کون سنے گا۔ ہم نے کہا، یہ غلط بات ہے کیونکہ عدالتی معاملے میں اگر کوئی ۱۸۳ء کے تحت رٹ دائر کرے گا، تو کوئی بھی جج جو وہاں موجود ہے مقدمہ سن سکتا ہے لیکن جب اس کا روسٹر فکس کرنے کے لیے جائے گا تو وہ چیف جسٹس کے پاس جائے گا پھر وہ اپنا فیصلہ دے گا۔ میں نے پھر صاحبزادہ سعید کی فائل پر اپنا فیصلہ لکھا اور اسے اپنے سینئر جج مہاں اجمیل کو بھیج دیا کہ آپ اس کیس کا فیصلہ کریں۔ وہ چونکہ کراچی میں تھے اس لیے انھوں نے لکھا کہ میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ ان کے بعد سینئر جج میں تھا اور فائل دوبارہ پشاور آ گئی۔ میں نے پھر جتنے سینئر جج تھے سب کو اسلام آباد اکٹھے ہونے کا نوٹس بھیجا۔ وہاں ہم دس جج کا بیچ بنا جس کی صدارت میں نے کی۔ آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ دس جج کا بیچ سجاد علی شاہ کیس سننے گا۔ شاہد منٹو بار کے صدر تھے۔ انھوں نے مداخلت کی۔ ہم نے کہا کہ ہم نے جو آرڈر پاس کیا ہے اس کو عدالتی قوانین کے معیار پر دیکھ لو کہ پاس ہو سکتا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ روسٹر ہم نے فکس کر دیا ہے۔ سپریم کورٹ کے دوسرے سینئر جج ہونے کی حیثیت سے جو پانچ جج تھے وہ اس زمانے میں نواز شریف کا کیس چلا رہے تھے۔ سجاد علی شاہ کا کیس میرے پاس لگا دس ججوں کے ساتھ۔ میں نے فیصلہ دے دیا کہ سجاد علی شاہ کا چیف جسٹس آف پاکستان کا تقرر غلط ہے کیونکہ یہ جج کیس کے مطابق نہیں ہے اس لیے ان کی تقرری کا عدم قرار دی جاتی ہے۔ اس پر انھوں نے استغاثی دے دیا۔ ان کے بعد میاں اجمیل چیف جسٹس آف پاکستان بن گئے۔ وہ سب سے سینئر تھے اور ۲ سال تک چیف جسٹس رہے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد میں چیف جسٹس بنا۔“

ہم سائنس روکے داخلی کنٹیکٹس کی ایک ہوشیار داستان سننے اور یہ سوچتے رہے کہ ہماری عدلیہ نہایت خوفناک بیجانی کیفیت سے گزرتی رہی ہے اور جج صاحبان کے درمیان جاری کنٹیکٹس نے بڑے بڑے مسائل پیدا کیے ہیں اور بہت منفی کردار ادا کیا ہے۔ میں نے ہمت کر کے جسٹس صاحب سے یہ نوک دار سوال پوچھ لیا کہ اس طرح کی افواہیں گردش کرتی رہیں کہ کوئٹہ میں سپریم کورٹ کے بیچ صاحبان نے سجاد علی شاہ کے خلاف جو علم بغاوت بلند کیا اس میں ”شریف بریف کیس“ استعمال ہوا تھا؟ انھوں نے دو نوک لفظوں میں کہا:

”یہ ہوا اس لیے کہ رفیق تارڑ سوت کیس لیے پھر رہے تھے جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ایک جج کراچی کا تھا، ناصر اسلم زاہد۔ اس کے بارے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ مولانا

خلیل الرحمن بھی صاف آدمی تھا۔ ایک ہی آدمی رہ جاتا ہے، جسٹس ارشد حسن خان۔ وہ ان دونوں کی موجودگی میں ایسا کام نہیں کر سکتا تھا اور اس کے تارڑ کے ساتھ تعلقات بھی بہت کشیدہ تھے۔“

اب ہم حساس نلاتے ہیں داخل ہونے لگے تھے۔ میں نے پوچھا، سپریم کورٹ پر حملے کے وقت آپ کہاں تھے اور حملہ آوروں سے کیسے محفوظ رہے؟ انہوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کہا شروع کیا:

”تب میں جج تھا اور یہ نوان لیگ والوں نے عدالت عظمیٰ پر حملہ کیا تھا۔ ہوا یہ کہ سجاد علی شاہ روز بروز وزیراعظم نواز شریف کو بلا رہا تھا۔ پارٹی کو شبہ تھا کہ وہ انہیں تو جین عدالت میں مزادینے والا ہے۔ اس نے اختیار جو ڈیو کو چیف ایگیشن کیشنر بھی مقرر کر دیا تھا۔ شاہ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عدالت میں آنے سے پہلے صدر افتادہ صاحب سے ملنے جاتے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ نواز شریف کو مزادینے کے بعد ان کا ریفرنس اسی دن چیف ایگیشن کیشنر کو بھیج دیا جائے جو اسے باہل قرار دے دے گا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت برطرف ہو جائے گی۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے میں ایک اور سنگین غلطی یہ کی تھی کہ انہوں نے تیرہویں ترمیم یک طرفہ طور پر معطل کر دی جبکہ اعجاز احسن نے لاہور ہائی کورٹ میں جو رٹ دائر کی تھی اس میں چودہ چوبیس کا فیصلہ موجود ہے کہ آپ کسی بھی قانون کو معطل نہیں کر سکتے کہ عدالت کے پاس آئین کو معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔“

شاہ صاحب نے تیرہویں ترمیم معطل کر کے یہ پیغام دیا تھا کہ حکومت ختم ہونے والی ہے چنانچہ یون لیگ نے اس شر سے محفوظ رہنے کے لیے عوامی ملاقات کا مظاہرہ کیا۔“

داخلی حالات کی ایک انتہائی مکروہ تصویر ابھر رہی تھی اور یہ احساس ہو رہا تھا کہ ماضی میں منتخب حکومتوں کے خلاف کیا کیا سازشیں ہوتی رہیں اور صدر اور چیف جسٹس کی ملی بھگت سے جمہوریت پر حملوں کے کیسے کیسے منصوبے تیار ہوتے رہے۔ پھر مجھے وہ دن یاد آئے جب ایوان صدر سازشوں کا گڑھ بن گیا تھا اور تمام سیاسی تخریب کار وہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں نے جسٹس صاحب سے اپنے تشدد کا سوال پھر دہرایا کیا آپ نے تہہ در تہہ سپریم کورٹ پر حملہ ہوتے دیکھا تھا؟ انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا:

”میں سپریم کورٹ میں جج تھا لیکن اسلام آباد میں نہیں دیکھا تاہم مناظر کی ویڈیو اور ٹی وی شوش موجود ہیں کہ حملہ آوروں لیگ کے آدمی تھے۔ اس میں ٹی وی انٹیکر طارق عزیز بھی شامل تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ شاہ صاحب کیس کو قانون کے مطابق چلانے کے بجائے میاں صاحب کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے سپریم کورٹ میں توڑ پھوڑ بھی کی۔ نامہرا مسلم زاہد کی قیادت میں تین جنوں کا بیج بنایا لیکن جو لوگ بھی پیش ہوئے وہ گواہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ کیس خارج ہو گیا تھا۔ چیف جسٹس بننے سے پہلے ایک ایبل پریس نے اس کیس کی سماعت کی۔ ایبل منظور ہوئی اور میرے سپریم کورٹ سے چلے جانے کے بعد انہیں جیسے جیسے مینے کی سزا ہوئی۔“

جناب سعید انڑماں صدیقی ماضی کے بڑے دلچسپ اور عبرت آموز واقعات بیان کر رہے تھے اور تاریخ ایک نئے پس منظر کے ساتھ سامنے آ رہی تھی۔ میں نے ان سوالات کی طرف رخ کیا جن کا تعلق ہمارے حال اور مستقبل سے ہے۔ ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں ایگیشن کیشن کی موجودہ شکل شفاف انتخابات کی ضمانت دے سکتی ہے اور جو احتجاج کیا جاتا رہا

چیف جسٹس انوار الحق نے اپنا عہدہ سلامت رکھنے کی خاطر جنرل ضیا الحق کو آئین میں ترمیم کا اختیار دیا

ہے اس سے حالات بہتر ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ جسٹس صاحب نے قدرے محتاط الفاظ میں جواب دیتے ہوئے کہا: ”میں نے کئی دفعہ یہ بات کہی ہے کہ اسٹریٹ پارہ سے نیا ایگیشن ہو سکتا ہے۔ ایگیشن کیشن ختم ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک عدالتی کیشن کی تشکیل سے زیادہ ضروری اس کے حدود و قیود اور قواعد و ضوابط کا تعین ہے۔ مناسب نرمر آف ریفرنس ہوں گے تو ایک اچھا حل نکل آئے گا۔ آپ کا ملک معاشی طور پر بری حالت میں ہے۔ اس وقت آپ کے اوپر ۶۰ ارب ڈالر کے قرضے ہیں وہ آپ کہاں سے ادا کریں گے؟ آپ کی صنعت نزع کی حالت میں ہے۔ آپ کے پاس بجلی ہے نہ گیس، تو آپ کا معاشی پیہہ کیسے چلے گا؟ میرے خیال میں ان معاملات کو انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے وسیع انظری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔“

اس جواب پر طیب اعجاز نے کہا کہ اس دہرنے کے دوران ایک تاثر یہ بھی پیدا ہوا تھا کہ سپریم کورٹ اس معاملے میں مصالحتی کردار ادا کرنے کی تیاری کر رہی تھی اور اس نے تمام جج صاحبان کو اسلام آباد طلب کر لیا تھا۔ آپ نے اس پوری صورت حال کو کس طرح دیکھا تھا؟ جسٹس صاحب نے فوری جواب دیا:

”یہ تاثر بالکل غلط تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس اسے آروائی کا صحافی کا شرف عباتی آیا اور یہی سوال کیا تھا۔ میں نے قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ سپریم کورٹ کے پاس مصالحت کرانے کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ تو فیصلے صادر کرتی ہے۔“

”مگر ابھی آپ نے کہا ہے کہ سپریم کورٹ کے پاس بڑی طاقت ہے۔“ طیب اعجاز نے بات کو کریدتے ہوئے کہا۔ ”طاقت تو ہے اس کے پاس۔ دیکھیے اس سے پہلے چیف جسٹس افتخار چودھری تھے۔ انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ انتظامی معاملات میں مداخلت کرنا شروع کر دی اور جینی کی قیمت ۴۵ روپے نکل مقرر کر دی جبکہ بازار میں ۷۰ روپے نکل رہی تھی۔ دیکھیے آپ کی ایک حد ہے۔ جب آپ اس سے تجاوز کریں گے اور کسی دوسرے اداروں کے دائرہ اختیار میں مداخلت کریں گے، تو پھر آپ کے احکامات کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔“

”مگر جناب ایہ تاثر تو پھیل گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔“

”یہ زیادہ تر میڈیا نے پھیلا یا۔ میں نے اسی دن ٹی وی پر کہا تھا کہ بارانٹم لوگوں نے بڑی بربادی کر دی ہے۔ جس دن افتخار چودھری ریٹائر ہوا اور جیلانی آیا تو اس دن میڈیا پر پورٹرز نے کہا کہ ہمارا کاروبار ٹھپ ہو گیا ہے۔ افتخار چودھری سماعت کے دوران ریٹائر کس دیتا تھا اور اس کا مقصد عوام سے داد وصول کرنا تھا حالانکہ ان کی قانونی لحاظ سے سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ قانونی طور پر یہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہے جس میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ آپ کوئی ایسا ریٹائر کس نہ دیں جس سے فریقین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔“

اس پر میں نے یہ نکتہ اٹھایا کہ عدالتی نظام کے اندر خود اختسابی کا نظام ناہیہ بہت کمزور ہے کہ کسی جج کو ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی سے روکا نہیں جاسکتا۔ اس پر جسٹس صاحب نے فوری اپنا رد عمل دیتے ہوئے کہا:

”اختساب کا نظام قائم ہے۔ پہلے آرٹیکل ۲۰۹ کے تحت صرف صدر پاکستان کو یہ اختیار تھا کہ وہ سپریم کورٹ جوڈیشل

کونسل میں کسی جج کا کیس بھیج دے۔ افتخار چودھری کے خلاف جنرل صاحب نے جو کیس بھیجا تھا وہ اپنی جگہ بالکل صحیح تھا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ بھی درست تھا کہ اس کے بیٹے نے کس طرح سیڈ بیکل کالج میں پڑھا اور کس طرح وہ ایف آئی اے میں آیا۔ اس وقت یہ اختیار صرف صدر کے پاس تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس کسی جج کے خلاف ثبوت ہے تو آپ جوڈیشل کونسل میں جاسکتے ہیں لیکن اس میں یہ ہے کہ غلط ثابت ہونے پر آپ کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔

”یہ تو ایک رسمی عمل ہے۔ کیا کوئی داخلی نظام بھی موجود ہے جو ایک جج کو اپنی حدود سے آگے جانے سے روک سکے؟“ میں نے وضاحت چاہی:

”سولین کورٹس جج کی خود اختیاری نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ خود اختیاری کا سلسلہ شروع ہو جائے، تو پھر وہ کیس بھی نہیں رکے گا۔ آج کل یہ عالم ہے کہ کوئی آدمی کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جج میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ہمارے اپنے فیصلے موجود ہیں کہ آپ کسی جج کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ یہ متعصب ہے۔ یہ بات آپ اور کورٹ کے جج کے لیے تو کہہ سکتے ہیں لیکن سپریم کورٹ کے جج کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ مضابطہ اخلاق میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی جج سمجھتا ہے کہ وہ کیس نہیں سن سکتا تو وہ خود اس کیس سے دستبردار ہو جاتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ میرے سامنے یہ کیس نہ لگایا جائے اور وہ کیس اس کے پاس نہیں لگتا۔“

میں نے ایک اہم سوال یہ اٹھایا کہ بھارت میں جو ایکشن کمیشن ہے اس کے ارکان اور چیف ایکشن کمیشن عدلیہ سے نہیں لیے جاتے اور وہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں ایکشن کمیشن جج صاحبان پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ انھیں کوئی انتظامی تجربہ نہیں ہوتا جبکہ انتخابات بہت بڑی انتظامی ایکسٹرنل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا آپ یہ مشورہ دیں گے کہ ایکشن کمیشن کی ہیئت یکسر تبدیل کر دی جائے؟ جسٹس صاحب نے بے ساختہ کہا:

”یہ بالکل ضروری نہیں کہ اس میں تمام جج صاحبان ہی ہوں بلکہ ان کی مداخلت کم سے کم ہونی چاہیے۔ دوسری یہ ہے کہ جج صاحبان ۶۵ سال کی عمر میں ریٹائر ہوتے ہیں۔ اس وقت ۷۰ سال کا ہوں۔ میرا جی انھوں نے نام دیا تو میں نے کہا کہ آپ کا دماغ خراب ہے۔ میں اس عمر میں ایکشن کمیشن کا کام نہیں کر سکتا۔ ایکشن کی مانیٹرنگ کے لیے ایک سٹیزن گروپ بنا تھا میں اس کا صدر تھا۔ میں نے اس ایکشن میں سندھ کے پانچ اور پنجاب کے تین انتظامی حلقوں کو خود مانیٹر کیا جو بہت مشکل کام تھا۔ یہ ایسے جج صاحبان کا کام نہیں جو ۷۰ سال کی عمر سے تجاوز کر چکے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس میں انتظامی کام بہت ہے جس میں عدلیہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“

”لیکن ایکشن ٹریبونلز میں ان کی ضرورت تو ہوگی۔“ میں نے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے پوچھا۔

”وہاں ضرورت ہو سکتی ہے لیکن آپ جو ریٹرننگ آفیسر عدلیہ سے لیتے ہیں ان کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھیں یہ قوانین بھٹو صاحب کے دور حکومت میں بنے تھے۔ اس زمانے میں بیورو کریسی خاصی بدنام تھی۔ جی جی خان نے تین سو افسر نکال دیے تھے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے بھی ایک فہرست تیرہ سو آدمیوں کی تیار کی تھی۔ ان کے خیال میں بیورو کریسی ایماندار نہیں تھے اور عدلیہ کا ادارہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ اب اس کی بھی مٹی پلید ہو گئی ہے۔“

میں نے پوچھا کیا ان حالات میں کوئی شخص چیف ایکشن کمیشن بننا پسند کرے گا؟ انھوں نے بے اطمینانی کا اظہار

جسٹس سجاد علی شاہ نے عدالتی معاملات میں گڑبڑ کی تھی اور ان کے آصف علی زرداری سے تعلقات تھے کرنے ہوئے کہا:

”تین جج صاحبان انکار کر چکے ہیں۔ مجھ سے ٹی وی والوں نے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے پاس بیورو کریسی میں بھی بہت اچھے افسر ہیں۔ دستور میں ترمیم کیجیے جو آسانی سے ہو جائے گی کیونکہ تمام سیاسی جماعتیں ایکشن کمیشن کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلی چاہتی ہیں۔“

طیب اعجاز نے کہا کہ افتخار چودھری صاحب کی بحالی مہم میں عوام نے بھرپور حصہ لیا تھا آپ اسے کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟ انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

”وہ عوام ہی کے جج بن کے رہ گئے سپریم کورٹ کے جج نہیں تھے۔ وہ کراچی آئے تو میری ان سے بات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم نے سپریم کورٹ کا وقار کم کر دیا ہے اور کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ انھیں یہ بھی احساس دلایا کہ آزاد عدلیہ کا مطلب یہ نہیں کہ ہر معاملے میں دخل دینے لگے۔ سول کورٹ میں جا کے دیکھو کہ وہ اتنے ہی کرپٹ ہیں اور حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ میں نے کہا، جب تک سول کورٹس کا نظام درست نہیں ہوتا جہاں روزانہ ہزاروں افراد کا آنا جانا ہوتا ہے اس وقت تک خود مختار عدلیہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔“

طیب اعجاز نے سوال کیا کہ ماتحت عدالتوں میں لوگوں کو انصاف نہیں مل رہا ان کے حالات کس طرح بہتر بنائے جاسکتے ہیں؟ جسٹس صاحب نے بڑے تحمل سے جواب دیا:

”اس کا بہت آسان طریقہ ہے۔ سب سے یہ قابل غور بات یہ ہے کہ جب پاکستان بنا اس وقت کراچی کی آبادی چار لاکھ تھی اور اس وقت دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ آپ نے کیا اسی تناسب سے عدلیہ میں توسیع کی ہے؟ جج عدلیہ سب سے آخری ترجیح ہے۔ کوئی بھی منصوبہ ساز عدلیہ پر پیسہ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ ایک وکیل کو سول جج بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی ماہانہ آمدنی پانچ چھ لاکھ روپے ہے وہ کبھی موجودہ تنخواہ پر نہیں آئے گا۔ آپ نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں بڑھا کے کہاں تک پہنچا دی ہیں۔ سات آٹھ لاکھ روپے سپریم کورٹ کے جج کی تنخواہ ہے جبکہ پانچ یا چھ لاکھ روپے ہائی کورٹ کا جج وصول کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سول جج کو جو سب سے زیادہ کام کرتا ہے اسے ماہانہ تین لاکھ چار لاکھ روپے تنخواہ دی جائے اور ان کی تعداد آبادی کے لحاظ سے بڑھانی جائے۔ آپ سٹی کورٹ جا کے دیکھیں کہ ایک جج کے پاس ۴۰،۴۰ کیس لگے ہوتے ہیں جن کی سماعت ناممکن اور ناقابل عمل ہے۔ پھر آپ نے عدلیہ کو ایگزیکٹو سے علیحدہ کر دیا ہے اور سول جج کو مجسٹریٹ بنا دیا ہے۔ اب وہ سول جج رہے گا یا مجسٹریٹ۔ آپ امریکہ میں جا کے دیکھیں کہ جہاں دس ہزار کی آبادی ہے وہاں ان کے لیے تین عدالتیں ہیں، کریمنل کورٹ، سول کورٹ اور ایپیلٹ کورٹ۔ وہاں بیورو کی کاسٹم بھی ناکام ہوتا جا رہا ہے اور عدلیہ پر اعتماد میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

”آپ کے خیال میں عدلیہ کی زبوں حالی کی ذمے دار حکومت ہے؟“ طیب اعجاز نے پوچھا۔

”حکومت سو فیصد ذمے دار ہے۔ زیریں عدالت میں پرائے ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ایک شخص ٹائپ کر رہا ہوتا ہے۔ کیا

آج دنیا میں کہیں ایسا ہوتا ہے؟ دنیا کی پیوٹرا نڈا ہو گئی ہے۔ ہائی کورٹ، سپریم کورٹ میں کیپیوٹرا ہے مگر ماتحت عدالتوں میں ایسا کیوں نہیں ہے؟

اس پر طیب اعجاز نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں ایک سول کورٹ میں گیا، تو ریڈر بھاگا بھاگا میرے پیچھے آیا اور کہنے لگا کہ سر آپ نے شرٹ بہت اچھی پہنی رکھی ہے۔ جج صاحب پوچھ رہے ہیں کہ یہ کہاں سے لی ہے۔ میں نے کہا، یار مجھے تو یاد نہیں کہاں سے لی ہے، بازار ہی سے لی ہوگی۔

جسٹس صاحب نے واقعہ سننے کے بعد بڑے دکھ بھرت لہجے میں کہا:

”بہت بری حالت ہے ان کی۔ ان کے پاس فریجیچر ہے نہ ٹیبلٹ کی جگہ۔ ٹرانسپورٹ ہے نہ بنیادی سہولتیں۔ جب جام صادق سندھ کا وزیر اعلیٰ تھا تب میں دو سال وہاں کا چیف جسٹس رہا۔ پیر پگاڑا کے کہنے پر یہ میرے پاس آیا کہ آپ ٹیلیو میں دو عدالتیں بنا دیں۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ سول ججوں کی رہائش کا بندوبست کریں اور ان کے اسٹاف کا تب میرے پاس آئیں۔ اس پر پیر صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں نے سندھ میں تقریباً دس بارہ عدالتیں بنوائیں اور اعلیٰ الاہان کہا کہ جب تک جج کی رہائش اور عدالت کی عمارت کا بندوبست نہیں ہوگا تب تک میں کسی سول جج کا تقرر نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ کا دورہ کرتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ جج سیاسی پارٹی والوں کو کہتے تھے کہ ہمیں عدالت تک چھوڑ آئیں۔ وہ تانگے پر عدالت جاتے تھے۔ میں جام صادق علی کو سلام کرتا ہوں کہ اس نے مجھے کئی اجازت دی تھی کہ جس جگہ آپ چاہیں عدالت بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے تمام بنیادی سہولتیں فراہم کی تھیں۔“

”لیکن! عوام کو تو یہ معلوم نہیں کہ عدلیہ کے لیے کتنے وسائل درکار ہوتے ہیں۔ آگاہی دینے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔“ طیب اعجاز نے محکم لہجے میں کہا۔

”مجھے ریٹائر ہوئے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ یہ ادارہ جس میں ہم بیٹھے ہیں اس کا نام ہے۔ Kurachi Centre For Dispute Resolution۔ یہ ہم نے ورلڈ بینک کے تعاون سے بنایا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں مجھے چیف جسٹس صاحب نے کہا کہ آپ اس ادارے کے لیے کام کریں۔ میں یہاں بلا معاوضہ کام کر رہا ہوں۔ ہم نے ۵۰۰ ججوں اور ۲۰۰ ہورو کریٹس کو مصالحت کار (Mediator) کی تربیت دی ہے۔ اس طرح اے سی بی اور دوسرے کئی اہم اداروں کو ہم نے ٹریننگ دی ہے۔ اب میں نے سندھ اور پنجاب حکومت کو خطوط لکھے ہیں کہ پولیس والوں کو بھی مصالحت کاری (Mediation) کی تربیت دلانی جائے۔ میاں نواز شریف نے ابھی جو کمیٹی بنائی ہے اس پر میں نے ہزانت خد لکھا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ مصالحت کاری (Mediation) اور ثالثی (Arbitration) کو الگ الگ کریں۔ میں تو خود ثالثی (Arbitration) کرتا ہوں اور بیرون ممالک جا کر کیس کرتا ہوں اور ایک ایک کیس میں میری فیس اسی لاکھ روپے ہوتی ہے جو صرف ملٹی نیشنل کمپنی کے لوگ دے سکتے ہیں۔ ثالثی کے مقدمات میں یہاں نہیں سنتا ان کے لیے وہی یا سہ گاؤر جاتا ہوں۔ ۲۰۰۵ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ورلڈ بینک نے کہا کہ آپ ایک مصالحت کاری (Mediation) کا سنٹر کھولیں۔ سوال پیدا ہوا کہ یہ سنٹر کون چلائے گا کیونکہ ہماری فیس فقط پانچ سات ہزار روپے ہے اس سے تو دفتر کا خرچہ ہی پورا نہیں ہوتا چنانچہ تمام ملٹی نیشنلز کو میں نے تاحیات ممبر بنایا اور ان سے انٹرفمبر شپ کے تین تین

جسٹس سجاد علی شاہ نے زرداری کی کا حکم نہ مانا تو وہ بولے ”سائلے تم کیسے جج بن گئے، تم بھی تو جو نیر تھے“

لاکھ روپے لیے اور ان کی ہم نے سرمایہ کاری کی ہے۔ اس سے جو آمدنی آتی ہے ہم اس سے ہم اسٹاف کو تنخواہ دیتے ہیں۔ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ مصالحت کاری (Mediation) اور ثالثی (Arbitration) کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ مصالحت کار (Mediator) کا کام صلح کرانا اور فیصلہ لکھ کے میرے پاس بھیج دینا ہے اور میں اسے عدالت میں رجسٹر کرادیتا ہوں۔ اس میں پندرہ سو روپے دن ملتے ہیں مگر تنازعات حل ہوتے جاتے ہیں۔“

ہم اس ادارے کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے اور جسٹس صاحب کی ہمت کو داد دی کہ وہ پیرانہ سالی میں بھی رضا کارانہ طور پر ایک مشنری جذبے سے کام کر رہے ہیں اور تربیت کے ذریعے مصالحت کاری کو فروغ دے رہے ہیں۔ رواں موضوع سے ہٹ کر میں نے تو می اہمیت کا ایک سوال اٹھایا کہ موجودہ انتخابی نظام کے اندر وہ امیدوار بھی کامیاب ہو جاتا ہے جو اپنے حلقے میں ۲۰ فیصد سے بھی کم ووٹ لیتا ہے۔ کیا مناسب نمائندگی کا نظام بہتر نہیں رہے گا؟ جسٹس صاحب نے فی البدیہہ جواب دیا:

”آسٹریلیا میں ۱۰۰ فیصد ووٹنگ ہوتی ہے اور جو آدمی ووٹ نہ ڈالے، اسے سزا ملتی ہے۔ مختلف ممالک میں الگ الگ نظام ہیں۔ آپ اپنے ہاں ووٹنگ کا نظام دیکھیں۔ کس کے پاس اتنا ووٹ ہے کہ سارا دن قتلار میں گزار دے؟ امریکہ میں ووٹ پندرہ پندرہ اور میں جس دن ڈالے جاتے ہیں جس کو جب فرصت ملتی ہے وہ جا کر اپنا ووٹ مشین میں ڈال آتا ہے۔ ہمارا موجودہ نظام چلنے والا نہیں کیونکہ وہ لوگ جو ووٹ نہیں ڈالتے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں مناسب نمائندگی سے بہتری آ سکتی ہے۔“

فصیر احمد سلیمی صاحب نے نشان دہی کی کہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالملک بلوچ نے تو دعوائی فیصد سے بھی کم ووٹ لیے تھے۔ جسٹس صدیقی صاحب نے اپنے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: ”ہمارے ہاں ووٹنگ سسٹم ایک عیاشی ہے۔ غریب آدمی کا اس میں کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔“

ان کے اس جواب سے یہ سوال پیدا ہوا کہ عام آدمی کو انتخابات کا صحیح معنوں میں حصہ دار بنانے کے لیے سیاسی جماعتوں کے اندر کس نوع کی اصلاحات درکار ہیں۔ جسٹس صاحب نے اُلٹا ہم سے سوال کر ڈالا۔

”مجھے اس ملک میں کوئی ایک پارٹی ایسی بتائیں جو صحیح معنوں میں سیاسی پارٹی ہو۔ اگر آپ نواز شریف کو نکال دیں، تو مسلم لیگ (ن) ختم، اگر بھٹو صاحب کو نکال دیں، تو پہنچ پارتی ختم، اگر آپ ولی خان ہاؤس کی فیملی کو نکال دیں تو اسے این پی ختم، یعنی یہ سب پارٹیاں سورتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ اپنے اندر انتخابات کا نظام قائم کریں۔ ان کے اندر ہر سطح پر انتخابات ہونے چاہئیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کے اندر ایک دروز میں انقلاب آ گیا تھا؟ میگنا کارنا کی منظوری کے بعد پارلیمنٹ کے اسپیکر کی گردنیں اڑائی گئیں۔ تو مسوں کی زندگی میں پہچاس ساٹھ سال کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ فرانس کے اندر اٹھارہویں صدی میں انقلاب آیا تو اب کہیں جا کے وہاں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی ہے۔“

میں نے ایک بڑے نازک معاملے کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ کے میاں صاحب کے ساتھ

تعلقات بڑے اچھے ہوا کرتے تھے اب کیا صورت حال ہے؟ انہوں نے قدرے دلگیر آواز میں بیان حقیقت شروع کیا: "تعلقات اس حد تک اچھے تھے کہ انہوں نے مجھے صدر مملکت کے لیے نامزد کیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے دوران مجھے چودھری شاکر کا ٹیلی فون آیا کہ سہرا ہم آپ کو نامزد کرنا چاہتے ہیں صدر کے امیدوار کے طور پر۔ میں نے کہا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ میں کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہوں گا جس میں آپ کی جماعت بھی شامل ہے۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں تو پھر بات کی جاسکتی ہے۔ میری شرط سے میاں صاحب نے اتفاق کیا لیکن عملی طور پر بے عملی اور بے عملی کا ثبوت دیا۔ وہ چاہتے تو میں بڑی آسانی سے منتخب ہو سکتا تھا۔"

مجھے قدرے حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا کہ آپ کس طرح صدارتی انتخابات میں کامیاب ہو سکتے تھے؟ جواب میں جسٹس صاحب نے خوش بیانی کا ایک رنگ جمانے ہوئے کہا:

"میں اس وقت چودھری شجاعت سے ۱۱۱ جس کے پاس ۸۸ نشستیں تھیں۔ اس نے کہا صدیقی صاحب آپ کا نام نواز شریف صاحب نے دیا ہے، تو ان کو مجھ سے ملنا چاہیے۔ وہ اگر اپنی انا کی وجہ سے میرے پاس نہیں آنا چاہتے تو وہ مجھے ٹیلی فون کر سکتے ہیں۔ میں ان کے پاس چلا جاؤں گا اور میرے جتنے ووٹ ہیں سب آپ کو دوں گا۔ الطاف حسین نے آج سے پانچ سال پہلے مجھے سینٹ کی نشست کی پیش کی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ سے میرا تعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ کی اور میری سوچ میں فرق ہے۔ کہنے لگے، آپ کیسی بات کر رہے ہیں! میں نے کہا، تمہیں آج بھی لوگ جنت خور کہتے ہیں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اس کے بعد جب صدارت کے انتخابات ہوئے تو میں نے اسے ووٹ دینے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ اس نے وعدہ دیا کہ میں نے جب آپ سے سینٹ میں آنے کے لیے کہا تھا تب آپ نے انکار کر دیا تھا۔"

میں نے کہا، اس وقت بات یہ تھی کہ میں کسی بھی سیاسی پارٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اب میاں صاحب سے بھی یہی شرط رکھی ہے۔ کہنے لگے، اچھا آپ میاں صاحب سے کہیں کہ مجھ سے بات کریں حالانکہ اس نے زرداری سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے کہا کہ اگر میاں صاحب مجھے کہیں گے، تو میں سوچوں گا۔ پھر میں بلوچستان گیا۔ وہاں بھی کئی لوگوں کا کہنا یہی تھا کہ میاں صاحب نے تو مجھے ووٹ دینے کے لیے کہا ہی نہیں۔ مجھے کل ۱۵۱ ووٹ ملے جبکہ نون لیگ کے پاس صرف ۹۶ ووٹ تھے۔ باقی ووٹ مجھے چھوٹی چھوٹی پارٹیوں اور بلوچستان کی نیشنلسٹ پارٹیوں نے دیے۔ جماعت اسلامی نے بھی مجھے ووٹ دیا۔ میاں صاحب اگر چاہتے، تو میں منتخب ہو سکتا تھا۔ اب دو بار جب انہوں نے چیف الیکشن کمشنر کے لیے میرا نام لیا، تو ڈان نیوز کے کسی صحافی نے مجھے ٹیلی فون کر کے اس بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ مجھ سے تو کسی نے بات نہیں کی۔ ویسے وہ جہاں کہیں بھی ملتے ہیں میری بے انتہا عزت کرتے ہیں۔"

ہم ان کی باتوں سے حدود حیرت زدہ ہوئے۔ سلیمی صاحب نے اچانک پوچھا، آپ سچ کی حیثیت سے کبھی میاں صاحب سے ملے تھے؟ انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا:

"میں نے ۲۰ سال تک سچ کی حیثیت سے کام کیا جس میں سے ۹ سال سپریم کورٹ میں اس منصب پر فائز رہا۔"

الیکشن کمیشن میں ریٹائرمنٹ کی ضرورت نہیں کیونکہ ۷۰ سال کا ہونے کے بعد سچ انصافی کام انجام نہیں دے سکتا اس دوران کبھی کسی سیاسی شخصیت سے نہیں ملا۔ مجھ سے ایک صحافی نے سوال کیا کہ سچ کی حیثیت سے آپ پر کس قسم کے دباؤ ہوتے تھے؟ میں نے کہا، مجھ پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ میں برسوں کے دوران میرے پاس کبھی کوئی شخص کسی کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے سفارش کا دروازہ بند رکھا تھا۔ جب آپ سیاست دانوں سے کوئی سفارش حاصل کرتے ہیں تو پھر سفارشوں کا راستہ کھولتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کسی سیاست دان سے فائدہ اٹھالیں تو وہ دس دفعہ آپ کے پاس آ کے بیٹھا رہے گا۔ میرے پاس کسی کو آنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ میں تو اس دور میں چیف جسٹس رہا جب جام صادق علی جیسا ملا تو سیاست دان وزیر اعلیٰ تھا۔"

سلیمی صاحب نے اس بات کی وضاحت چاہی کہ جام صادق علی نے ایک دفعہ صحافیوں کو بلا رکھا تھا۔ سجاد علی شاہ صاحب چلے گئے تھے محمود ہارون قائم مقام گورنر تھے اور آپ کی عدالت میں ان کا کیس لگا ہوا تھا۔ جام صادق علی مینٹل ختم کر کے چلے گئے اور بعد میں معلوم ہوا کہ آپ سے ملنے گئے تھے۔ جسٹس صاحب نے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے جواب دیا: "نہیں میرے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ میں عدالت میں تھا اور شکایت ملی کہ غداری آپ کا حکم نہیں مانتا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ لکھ کر دیں۔ پھر اگر پانچ بجے تک اس حکم پر عملدرآمد نہیں ہوتا تو میں خود دیکھوں گا۔ تین بجے اس نے استعفاء دے دیا تھا۔"

سلیمی صاحب نے دریافت کیا کہ جب آپ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، تو آپ کے پاس زررداری صاحب کا کیس لگا تھا اس میں کیا ہوا تھا؟ جسٹس صاحب نے بے اختیار جواب دیا:

"میں نے اس کی ضمانت مسترد کر دی تھی۔"

"لیکن تاثر یہ تھا جیسے سجاد علی شاہ اور آپ کی ملاقات کے نتیجے میں ضمانت مسترد کی گئی تھی۔" سلیمی صاحب نے واقعات کی گہرائی میں اترے ہوئے کہا:

"یہ آپ زررداری سے پوچھیں کہ جب میں سپریم کورٹ گیا تو اس نے مجھے پیغام بھجوایا کہ میں آپ سے ملنا اور آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے سپریم کورٹ سے آئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں اسے کہو کہ اب اس کی ضرورت نہیں۔ ہوا یہ تھا کہ جب زررداری کی ضمانت کا کیس میرے پاس چل رہا تھا تو یہ لاہور سے طالب حسین وکیل کو میرے پاس لایا۔ میں نے زررداری سے کہا کہ ابھی ثبوت پیش نہیں کیے گئے اس لیے ضمانت کے لیے وکیل کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی کریمنل کیس میں جب تک ثبوت پیش نہ ہو جائے، تو ضمانتی کاغذات گرانٹ نہیں کیے جاسکتے۔ زررداری وہاں بیٹھا تھا وہ اٹھ کے میرے پاس آیا اور کہا کہ سہرا میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پوچھیے اور اسے سمجھایا کہ تمہارا وکیل تمہیں جیل بھجوادے گا۔ تین چار مہینے بعد ممنون قاضی نے ضمانت دے دی تھی۔"

طیب صاحب نے دریافت کیا کہ اپنے شعبے کے علاوہ آپ کس قسم کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں؟ جسٹس صاحب نے مختصر سا جواب دیا: "پیشہ ورانہ اور علاقائی کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہمارے پاس ناشی کا بہت کام ہے۔"

TENDER NOTICE

1. Sealed tenders based on item rates / percentage above or below on approved estimated (DNIT) amount are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors / firms enlisted / renewed with C & W Department for the current financial year 2014-15 in the field of Buildings works.
2. Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bids in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment / up to date renewal letter, PEC license, Identity Card of Contractor / Managing Partner / Director of the firm alongwith registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque from any Scheduled Bank:-
 - i) Chief Engineer, Punjab Buildings Department (South Zone), Lahore.
 - ii) Commissioner, Sargodha Division, Sargodha.
 - iii) Superintending Engineer, Provincial Buildings Circle, Sargodha.
 - iv) District Coordination Officer, Sargodha / Khushab.
 - v) Executive Engineer, Provincial Buildings Division, Sargodha
 - vi) Assistant Commissioner concerned.
3. Tender rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.
4. Tenders will be received in the offices of Chief Engineer, Punjab Buildings Department (South Zone), Lahore and Commissioner, Sargodha Division, Sargodha and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives who opt to be present.
5. Conditional tenders and tenders not accompanied with earnest money @ 2% bid amount in shape of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.
6. Any of the total bids can only be rejected on the basis of evaluation criteria, though, The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal as per PPR& Rules.

”سر! آپ کا بیٹا کیا کرتا ہے؟“
 ”وہ بھی وکیل ہے۔“
 ”وہ کہاں پر پریکٹس کر رہا ہے؟“

”وہ یہاں لیاقت مرچنٹ ایسوسی ایٹس میں کام کرتا ہے۔ شہباز شریف کو میں نے ایک پراجیکٹ بنا کے دیا ہے وہ اس پر کام کر رہا ہے اور میاں صاحب کے پاس میٹنگ میں جاتا رہتا ہے اور اس ادارے کی نمائندگی کرتا ہے۔“
 ”اس کے علاوہ آپ کی کیا مصروفیات رہتی ہیں؟ گالف کھیلتے، ٹی وی دیکھتے اور کیا کرتے ہیں؟“
 ”نلاجی کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ سات آٹھ ویلفیئر انجمنیں چلا رہا ہوں۔ بہت ساری یونیورسٹیوں کے بورڈ کارکن ہوں۔“

”ہمارے قارئین جو لاہور پر حسنا چاہتے ہوں، ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟“
 ”میں نے اکثر کہا ہے کہ قانون کی یونیورسٹیاں اس طرز پر ہونی چاہئیں جس طرز پر بیرون ممالک میں ہیں۔ بھارت میں بہت اچھے قانون کے ادارے ہیں۔ اس کے علاوہ نوجوان وکیلوں کی تربیت بھی غایت درجہ ضروری ہے۔ قانون کی کتابیں پڑھ لینے سے وکالت نہیں آتی۔“
 ”سر! یہ جو بیٹے وکیل بنتے ہیں، ان کے حوالے سے ایک منفی اثر پڑتا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

”یہ چلن کراچی میں بہت زیادہ نہیں تاہم لاہور میں خاصا کام ہے۔ وحید الدین ہوتے تھے ان کا بیٹا وجیہ الدین ہے۔ ہمیں تو کوئی شکایت نہیں ہے ان سے۔ فاروقی صاحب کے بیٹے ہیں اور جمالی کے بیٹے بھی پریکٹس کر رہے ہیں۔ دیکھیں آپ کسی کو منع تو نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی ایک آدھ وکیل کوئی ایسا ناخوشگوار کام کرتا ہے تو اور بات ہے۔ لاہور کے اندر یہ کلچر زیادہ ہے کہ بیٹے صاحبان کے بیٹوں کے اپنے چیمبر ہیں اور وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کی روک تھام کا طریقہ کار یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے بیٹوں کو وہاں پریکٹس نہ کرنے دیں جہاں آپ خود بحیثیت جج تعینات ہوں۔ پہلے بیٹے صاحبان عوام اور رشتے داروں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اب تو وہ ہر محفل میں موجود ہوتے ہیں۔ میں اسلام آباد میں آٹھ سال رہا اور مجھے وہاں کوئی نہیں پہچانتا تھا۔“

ہم بلند مرتبہ اور اولاد العزم سابق چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی کی صحبت سے دو گھنٹوں سے زیادہ مستفید ہوتے رہے اور ایسا محسوس کیا کہ ہم بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ ان کے صحت مند ذہن اور صحت مند زندگی سے ایک حوصلہ ملا اور دلوں میں امید کی شمعیں فروزاں ہوئیں کہ پاکستان مسائل کے گرداب سے باہر نکل آئے گا اور عوام کو ایک روز مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہوگی کہ اجتماعی بیداری آتی جا رہی ہے اور نوجوان اپنے وطن کی تعمیر کے لیے تے جذبوں سے سرشار دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ بد نظمی، بلڈ بازی اور ایک منظم اور مستعد زندگی میں ترقی کرنے لگے ہیں۔ مزید خوش بختی یہ کہ وہ اپنے قائدین اور حکمرانوں کی باز پرس کرنے لگے ہیں۔ حریت نگر اور ذوق نمواں کا نام ہے۔

Sl. No.	Name of Work	Estimated Cost (in Rs.)	Estimate Agency (in Rs.)	T.S No & Date	Tender Fee (in Rs.)	Completion Period	Last date for submission of application to purchase / issue tenders	date & time for receipt / opening of Tenders
6	M/R to Sewerage System of Rahmat-Ul-Amin and Burnt Unit in D.H.O Teaching Hospital at Sargodha.	2,95,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		15 th 01/15
7	M/R to Burnt Unit in D.H.O Teaching Hospital at Sargodha.	2,40,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	175/-	01 Month	05.01.2015	08.01.2015
8	M/R to Government College for Women Farooq Colony Sargodha	1,00,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month	12 th 01/15	Receipt 01:00 P.M.
9	M/R to Government College for Women Mar	3,00,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		Opening 01:30 PM
10	M/R to Government College for Women Chap. No.35/SB District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		
11	M/R to Government Boys Degree College Bhagtanwala District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		
12	M/R to Government Boys Degree College (Boys) District Sargodha.	3,08,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		
13	M/R to Government Boys Degree College Man District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		
14	M/R to Government College for Women Quaidabad District Khushab	3,00,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		
15	M/R to Construction of Uddenwala Rest House for Courier Tenders Department (C.T.D) at District Sargodha	0.540 (M)	2% of Bid Amount	Under process	4800/-	01 Months		
16	M/R to Old Civil Defence Office for Courier Terrorism Department (C.T.D) at Khushab	1,190 (M)	-do-	Under process	500/-	01 Month		

PL-16598

Executive Engineer
Procurement Buildings Division
Sargodha

Superintending Engineer
Procurement Buildings Circle
Sargodha

اردو ناؤسٹ 32 جنوری 2015ء

Sl. No.	Name of Work	Estimated Cost (in Rs.)	Earnest Money (in Rs.)	T.S No & Date	Tender Fee (in Rs.)	Completion Period	Last date for submission of application to purchase / issue tenders	date & time for receipt / opening of Tenders
1	Provision of Missing Facilities in Government College for Women Farooq Colony Sargodha (ADP No.131 for the year 2014-15)	35,870 (M)	2% of Bid Amount	Under process	19425/-	18 Months	05.01.2015	06.01.2015 15 th 01/15
2	Construction of Additional Class Room at Government College (Women) Jauharabad District Khushab (ADP No.347 for the year 2014-15)	29,406 (M)	-do-	Under process	14725/-	12 Months	12 th 01/15	Receipt 01:00 P.M. Opening 01:30 PM
3	M/R to Surgical / Burnt Unit (Ground Floor) in D.H.O Teaching Hospital at Sargodha.	2,49,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	125/-	01 Month		
4	M/R to Surgical / Burnt Unit (First Floor) in D.H.O Teaching Hospital at Sargodha	3,00,000/-	2% of Bid Amount	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	150/-	01 Month		
5	M/R to Burnt Unit (First Floor) in D.H.O Teaching Hospital at Sargodha	1,35,000/-	-do-	E.E No. 367/DRG dated 12.12.2014	75/-	01 Month		

اردو ناؤسٹ 32 جنوری 2015ء



۱۹۳۴ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ ایک علمی و سمیر تحقیق کرنے میں نکلے گیا ہوا تھا۔ دن کا زیادہ حصہ اسپیریل لائبریری میں خطوطات کی درق گردانی یا پھر خان بہادر محمد اسد اللہ، ناظم کتب خانہ کے ساتھ مذہب پر گرما گرم بحث میں صرف ہوتا۔ مرحوم کے دل میں اسلام

نبی کریم ﷺ کا ذکر مبارک

ایک جرمن یہودی اور ایک امریکی عیسائی کے ذوق تحقیق سے رسول اللہ پر ڈروڈ و اسلام بھیجے کا بڑا اہم پہلو مانڈروڈز روشن عیاں ہو گیا

پروفیسر احمد الدین مارہروی

مدرسہ معہد القرآن الحکیم کا باقاعدہ آغاز ۲۰۰۶ء میں ہوا

الحمد للہ ہر سال جگہ کی کمی ہم محسوس کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس سال جگہ کی کمی نے مجبوراً آپ سے ملاقات کروائی.....

خود آئیے..... دیکھئے..... محسوس کیجئے..... اور فیصلہ کیجئے

کہ آپ اور ہم مل کر کس طرح معہد القرآن الحکیم کو وسعت دے سکتے ہیں تاکہ دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کریں۔

مذکورہ معاملہ میں مدرسہ کے ساتھ خالی پلاٹ مدرسہ کی ضرورت بن چکا ہے۔ ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے خود دیکھنے تشریف لائیے اور مندرجہ ذیل اکاؤنٹ نمبر 005380120039959 الائیڈ بینک میں اپنے آپ کے لیے، اپنے والدین کے لیے خزانہ آخرت کا جو موجب بنیے۔

رابطہ کے لیے

قاری محمد سعد

0300-4467810

0331-4494850

مولانا محمد شفیع شاکر (ایم اے، ایم ایڈ)

0321-4731021

ایڈریس: حضرت عمر فاروقؓ، عظیم چوک عقب اعوان ٹاؤن مصطفیٰ پارک (ڈب بن پورہ) لاہور

اردو ڈائجسٹ 32، جنوری 2015ء

تے جو محبت تھی، اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ انہوں نے ہندو گروہی کے خلاف احتجاجاً تین مرتبہ سرکار کو اپنا استعفیٰ پیش کیا (جو کبھی منظور نہ ہوا)

سہ پہر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں محفلِ جہتی جو اس زمانے میں کامیاب کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ کسی نیک بحث کو لے کر خود بولتے اور دوسروں کو بھی اظہارِ رائے کا موقع عطا فرماتے۔ رات میں ’روزنامہ آزاد ہند‘ کے دفتر کی نذر ہو جاتیں جہاں مدیرِ اعلیٰ، علامہ عبدالرزاق بلخ آبادی علمِ الکلام کے سوتی بکھیرتے اور مذہبِ اسلام کو عقل کی کسوٹی پر کس کر بقول خود ’ملازم‘ کے نچھے اویڑتے۔

کلکتہ یونیورسٹی نے شعبہ اسلامیات کی ابتدا اسی سال کی تھی۔ سابق وزیرِ اعظم پاکستان، مسٹر سہروردی کے چچا سر حسان سہروردی وائس چانسلر تھے اور ایک جرمن یہودی، ڈاکٹر ڈاکریا (زکریا) شعبے کا صدر منتخب ہوا تھا۔ اتوار کے روز صبح کو ان کے ساتھ بھی مذہب کے بنیادی اصولوں پر مباحثہ خاصا دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتا۔ غرض ایک ایسا محققانہ اسلامی ماحول پیدا ہو گیا جس کا مجھے بعد میں کبھی عشرِ عشر بھی میسر نہ آسکا۔

روز و شب کی پڑ سکون کر نہیں اسی طرح جاری نہیں کہ یکا یک اخبارات نے ’مانو یا نہ مانو‘ (Believer or not) کے شہرہ آفاق خالق، رابرٹ رپلے (Robert Ripley) کی کلکتے میں آمد کا اعلان کیا۔ پھر ایک روز وہ خود ہی ایک سوال کے سلسلے میں امپیریل لائبریری آگیا۔ نوادرات اور عجائبات کے متلاشی تو آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے لیکن رپلے وہ منفرد شخص تھا جو انوکھے نمونے انجیوں سے دلچسپی لیتا۔ لندن اور امریکا کے اخبارات میں اس کے چند ہی چٹکلے شائع ہوئے تھے کہ لوگوں نے

اس پر آوازے کسے شروع کر دیے۔ کسی نے اس کو دینیا کا سب سے بڑا دروغ گو قرار دیا تو کسی نے اسے فریبی گردانا۔ وہ بات ہی ایسی کہتا تھا کہ عقل اس کو باور کرنے سے یکسر انکار کر دیتی۔ لیکن جب تحقیق کی جاتی تو عام طور پر سو فیصد ثابت ہوتی۔

ہندوستان میں ہفتہ وار ’نامز آف انڈیا‘ نے بھی اس کے مضامین کی خوب اشاعت کی تھی۔ اس لیے وہ ہمارے واسطے ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ اس نے اپنی ڈائری میں ہندوؤں کی چند مذہبی کتابوں کے نام لکھ رکھے تھے۔ اپنی تحقیق کے سلسلے میں وہ ان کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی کسی ایسے عالم کا متلاشی تھا جو اسے خالص موضوع پر ضروری معلومات فراہم کر سکے۔ چنانچہ پنڈت چند پادھیانی کو بلا دیا گیا کلکتہ یونیورسٹی میں جو سنسکرت سیکشن کے منتر عالم تھے۔ لیکن رپلے کے پہلے ہی سوال میں ان کا بھرم کھل گیا اور وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

اس نے اپنی ڈائری کا ایک ورق کھول کر دریافت کیا کہ ہندوستان میں مندروں کی تعداد کتنی ہے اور ان میں عبادت کے اوقات کیا ہیں؟ جب پنڈت جی سرا سیمہ نظر آئے، تو اس نے نہایت ملامت سے کہا ’خیر یہ تو میں دوسرے طریقوں سے بھی معلوم کر لوں گا۔ آپ صرف مجھے اپنی عبادت کے طریقے سمجھا دیجیے۔‘

پنڈت جی کے بیان پر جس طرح رپلے کی پیشانی پر بل پڑ رہے تھے، انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کی مایوسیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ دو گھنٹے بعد اس کے چہرے پر اضمحلال کی ایسی گھٹائیں چھا گئیں کہ ڈائری بند کر دی اور

ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

کہنے لگا ’میں اس لوہ میں نکلا ہوں کہ دنیا میں کون سی آواز سب سے زیادہ سنائی دیتی ہے؟ پہلے جانوروں کی بولیوں کا جائزہ لیا، لیکن ان میں ہم آہنگی بہت کم دیکھی۔ پھر انسان کی طرف توجہ کی، تو وہاں بھی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیں۔ ریلوے انجن کی سیٹی کا تجزیہ کیا، تو امریکی، یورپی اور افریقی سیٹیوں میں بے فرق نظر آیا۔‘

’اب صرف ایک امر باقی ہے کہ دنیا کے مذاہب کا جائزہ لیا جائے۔ ان میں شاید کوئی دعاء، مناجات یا تہلیل جائے جو بین الاقوامی حیثیت سے عام ہو۔ دنیا میں چار بڑے مذاہب ہیں: اسلام، عیسائیت، بدھ مت اور ہندو دھرم۔ اب میں ان کا جائزہ لے رہا ہوں۔ عیسائی ممالک سے مجھے ہر قسم کی معلومات فراہم ہو چکی ہیں، لیکن ان میں بے انتہا تنوع اور انفرق نظر آتا ہے۔ بدھوں کے ہاں عیسائیت مقابلتا زیادہ ہے، لیکن اتنی نہیں کہ اس کی کسی باہم عبادت کو آوازوں میں پہلا نمبر دیا جا سکے۔ ہندوستان میں ابھی آپ نے دیکھ لیا کہ اعداد و شمار جمع کرنا کتنا مشکل ہے۔ بظاہر یہاں تو کامیابی مشکل ہی معلوم ہوتی ہے۔‘

تیل اس کے یہ حقیقی اسلام کے متعلق کچھ کہے، خان بہادر اسد اللہ نے خود ہی سوال دانہ دیا کہ اسلام کے متعلق آپ کی جستجو کا ماحصل کیا ہے؟

بظاہر اس کا وہ دو ٹوک جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی ڈائری کا ایک دوسرا ورق کھول کر کہنے لگا ’ابھی میں تمام اسلامی ممالک میں نہیں گھوما۔ صرف مصر، شام، عرب اور فلسطین کا دورہ کر پایا ہوں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ نظر آئی کہ ہر جگہ عبادتِ عربی زبان میں ہوتی ہے۔ لیکن ان میں عبادتیں مختلف ہیں جنہیں ایک آواز کا نام نہیں دیا جاسکتا۔‘

ہم دونوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ اس برہنہ کو صحیح ہدایت کی ضرورت ہے اور اس واسطے بڑی چابکدستی سے کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ ہندو دھرم کے متعلق آپ از خود معلومات بہم پہنچائیے۔ اسلام کے بارے میں ہم آپ کو ایک جرمن عالم سے ملائیں گے جو ممکن ہے آپ کی راہنمائی کر سکے۔

جرمن عالم کا نام سننے ہی رپلے کے بڑھڑو چہرے پر مہتابیاں ہی چھوٹنے لگیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ عالم یونیورسٹی پروفیسر ہے جس کا ہر لفظ حقیقین کے نزدیک حرقب آخر ہوتا ہے، تو اسے گونہ اطمینان ہو گیا کہ اتنے نہ صرف اسلام بلکہ ہندو مذہب کے متعلق بھی یورپی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ دراصل مشہور جرمن عالم، میکس ملر نے تمام دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ سنسکرت کے سب سے بڑے بحرِ علوم صرف جرمن پروفیسر ہیں۔ ہم نے بھی اس کی غلط فہمی کا ازالہ ضروری نہ سمجھا اور منغل برخاست ہو گئی۔

اب اسلام کو برتر ثابت کرنے کے لیے جس شد و مد سے دوڑ ڈھوپ ہوئی اس کا جب خیال آئے تو دل خوشی سے بیوں اچھلنے لگتا ہے۔ رات کو پہلے علامہ عبدالرزاق کے دفتر میں میٹنگ ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مصروفیات کا عذر کر کے آنے سے انکار کر دیا۔ لیکن باقی لوگ من و عنان سے اپنی اسی فکر اور جستجو میں منہمک ہو گئے۔

علامہ عرصہ دراز تک مصر، فلسطین، شام، عرب اور

فلسطین میں رہ چکے تھے۔ اخبار سے منسلک ہونے کے باعث ان ملکوں کے رسالے اور روزنامے بھی تیار لے میں آتے رہتے تھے۔ انہوں نے وہاں کی اطلاعات و نشریات کی یادداشتوں کو کرپیدا اور صرف ان چند ممالک میں ڈیڑھ لاکھ مساجد کا سراغ لگا لیا۔

ہندوستان میں بھی نو کروڑ مسلمان آباد تھے۔ دیکھو سو برس تک ان کی حکومت رہی تھی۔ گاؤں گاؤں میں مسجدیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ ایک لاکھ سے کیا کم ہوں گی۔ اسی طرح انڈونیشیا، عراق اور افریقا کے عرب ممالک تھے۔ ان سب کی مسلم آبادی کا جائزہ لے کر تخمیناً ایک اعداد متفرق کر لی اور اسے ایک رسالے کی شکل میں مرتب کر کے چھپوایا گیا۔

دوسری نشست حسان سہروردی کے ہاں ہوئی جو معاشرت میں بالکل انگریز مگر دل سے پکے جذباتی مسلمان تھے۔ ان کے ذمے یہ قرض عائد کیا گیا کہ ڈاکٹر ذکرایا کوشیشہ میں اتاریں اور نو وارد کے سامنے باعلان اسلام کا لوہا منوالیں۔

اب خدا کی قدرت ملاحظہ کیجیے۔ ایک بالکل معمولی سی بات نہ معلوم کیوں ہم میں سے کسی مسلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ دایرت رپے نماز کے متعلق کہہ رہا تھا کہ اس میں علیحدہ علیحدہ آوازیں سنائی دیتی ہیں جن کو ایک نہیں کہا جاسکتا۔ ہمیں اس اعتراض کا کوئی مسکت جواب نہ بن پڑتا۔

لیکن جب جرمن پروفیسر کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا، تو اس نے نہایت آسانی سے اس کا حل تلاش کر لیا۔ کہنے لگا ”آپ نماز کو درمیان میں نہ لائیں بلکہ اذان کو پیش کریں جو ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ شیعوں کی اذان

میں کچھ فرق ضرور ہوتا ہے لیکن ابتدائی کلمات اس کے بھی یکساں ہیں۔“

رپے کا عرصہ اہلادکالتہ میں پانچواں روز تھا۔ اس دوران وہ نامعلوم کتنے پنڈتوں سے مل چکا تھا۔ کئی مندروں میں پراختیا بھی تھی۔ وہ اپنی تنگ و دو سے بالکل غیر مطمئن تھا۔ اس نے اپنی تمام امیدیں جرمن پروفیسر کی ملاقات سے وابستہ کر لیں۔ لیکن جب ڈاکٹر ذکرایا نے بجائے ہندو دھرم کے اسلام کے متعلق گفتگو شروع کی، تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر جب انہوں نے حتمی طور پر فیصلہ صادر کر دیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ سنائی دینے والی آواز ”اذان“ ہے، تو اسے کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا۔

علامہ عبدالرزاق کے اعداد و شمار دیکھ کر اس نے مساجد کی تعداد کو صحیح تسلیم کر لیا بلکہ اپنی ڈائری میں ان کی تفصیل بھی نوٹ کر لی۔ یہ بھی مان لیا کہ ہر مسجد میں روزانہ پانچ دفعہ اذان کہی جاتی ہے لیکن وہی یکساں کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہ بات اس کے مغرب زدہ ذہن میں کسی طرح نہ مانی۔

مختلف مساجد میں جا کر جب اسے اذان سنائی گئی تو وہ ایک کا دوسرے سے صحیح رابطہ قائم نہ کر سکا۔ طرح طرح کے اعتراضات کرتا رہا اور یکسانیت کا قائل نہ ہوا۔ اس لیے ہم سب کو پھر سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا کہ اب کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو اس سنگا رخ پتھر میں چونک لگا سکے۔ متعدد تدابیر سوچی گئیں لیکن اس مرتبہ بھی ڈاکٹر ذکرایا ہی کا تیرنشانے پر بیٹھا۔ اس کے واسطے ہمیں عجیب و غریب قسم کی جدوجہد کرنی پڑی۔

اس وقت تک دنیا نیپ ریکارڈنگ سے نا آشنا تھی لیکن گراموفون ایجاد ہو چکا تھا۔ کلکتہ میں ”ہیرما سٹرس

وائس“ کے ریکارڈ تیار کیے جاتے تھے۔ ان سے یہ سودا کیا گیا کہ بیس مختلف مساجد کی اذانیں جداگانہ اوقات میں ریکارڈ کی جائیں پھر سب کو بیک وقت سن کر رپے انداز لگائے کہ یہ ایک ہی آواز ہے یا مختلف النوع صدا آئیں۔

گراموفون کمپنی نے کام کے معاوضے میں خطیر رقم طلب کی جس کا ادا کرنا ہم میں سے کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے پنڈرادان خان کے ملک التجار حاجی محمد امین مرحوم (بانی امین برادر س کراچی، ڈھاکہ) کا جنہوں نے کل رقم اپنی جیب سے ادا کر دی۔ دودان کے اندر بیس ایسی مساجد کی اذانوں کے ریکارڈ تیار ہو گئے جن میں سے بعض کا فاصلہ بیس میل سے بھی زیادہ تھا۔

رپے نے جب انہیں غور سے سنا تو پھڑک اٹھا۔ ہم میں سے ہر ایک سے اٹھ اٹھ کر ہاتھ ملانا اور کہنا ”آپ لوگوں نے میری برسوں کی مشقت کو دور کر دیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکر یہ ادا کروں۔“ لیکن ہم سب ایک خیال میں گمن تھے۔۔۔۔۔ یہ ہماری نہیں اسلام کی فتح ہے۔

جب وہ امریکا پہنچا اور ”Believe it or not“ کی دوسری جلد لکھنی شروع کی، تو ابتدا ہی میں اس عنوان کے تحت ”دنیا کی کون سی آواز سب سے زیادہ سنائی دیتی ہے؟“ اس نے یہ جواب لکھا ”وہ مسلمانوں کی اذان ہے جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔“ اور ثبوت کے طور پر وہ تمام اعداد و شمار شائع کر دیے جو علامہ عبدالرزاق نے مہیا کیے تھے۔

ایک روز میں سورۃ الم نشرح کی تلاوت کر کے مطالب پر غور کر رہا تھا۔ اس کی یہ آیت وَرَفَعْنَا لَكَ

ذکرک ”اور اسے حبیب پاک ہم نے آپ کے واسطے آپ کے ذکر کو بلند و رفیع کر دیا۔“ دماغ کو پے در پے جھٹکے دینے لگی۔

یہ کہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے جب حضور ﷺ کے پرستار مسلمان انگلیوں پر گھسنے جا سکتے تھے۔ عرب سے باہر کسی نے آپ کا نام بھی نہ سنا تھا نہ کوئی آپ کے مشن سے واقف تھا۔ اس وقت باری تعالیٰ کا یہ ارشاد خواہ کتنی ہی دور رس پیشگوئی کا حامل کیوں نہ ہو، باری النظر میں عجیب نظر آتا تھا۔

اس وقت کس نے آیت پر غور کیا ہو گا؟ کس نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہو گا؟ لیکن قرآن صرف پہلی صدی ہجری کی کتاب تو نہیں، اس کو تو قیامت تک زندہ رہنا اور لوگوں کو صراط مستقیم دکھانے رہنا ہے۔

خیالات کی روای طرح رواں تھی کہ یکا یک مجھے ۱۹۳۳ء کے واقعے کی یاد آئی۔ اب ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ مذکورہ بالا واقعہ ہی آیت کریمہ کی تفسیر ہے۔ مؤذن منار پر چڑھ کر اذان دیتا ہے:

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ

اس طرح حضور ﷺ کا نام نامی روزانہ ہر مسجد میں کم از کم بیس مرتبہ ضرور لیا جاتا ہے۔ دس دفعہ اذانوں میں اور دس مرتبہ اقامت میں!

پھر ہر دو رکعت کے بعد تمام نمازی بیٹھ کر درود شریف پڑھتے ہیں جس میں حضور ﷺ کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد امام درود شریف کا در ضرور کرتا ہے۔ اس طرح ہر مسجد میں آپ کا ذکر دن میں ہزاروں مرتبہ کیا جاتا ہے۔

دربار نبوت میں پایا جنہوں نے بلند مقام

مکہ کے نابینا صحابی

ایک بلند مرتبہ مقدس شخصیت کا تذکرہ
جن کا ذکر خیر قرآن پاک میں فرمایا گیا

تفسیر اللہ خاں

اسلام آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ مکہ کے لوگ آہستہ

راہ روی کے طور طریقے چھوڑ کر حلقہ
بگوش اسلام ہو رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی خواہش اور

کوشش تھی کہ مکہ کے بڑے بڑے سردار بھی دائرہ اسلام
میں داخل ہو جائیں تاکہ دین اسلام کو قوت ملے۔ ایک

مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مکہ کے چند بڑے
سردار حاضر ہوئے۔ ان میں حنظل بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ

(دونوں بھائی) عمر بن ہشام (ابو جہل)، امیہ بن خلف
اور ولید بن مغیرہ (حضرت خالد بن ولید سیف

اللہ کے والد) شامل تھے۔ حضور اکرم ﷺ انہیں
اسلامی تعلیمات سے آگاہ فرما کر دعوت

اسلام کی طرف راغب کر رہے تھے۔
اچانک حضرت عبداللہ بن ام مکتوم جو کہ
بظاہر بصارت سے تو محروم تھے لیکن ان کا قلب
بصیرت سے معمور تھا۔ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر
ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے بھی بھلائی کی دو باتیں

حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا
دنیا کی فکر دل کا اندھیرا ہے اور آخرت کی فکر دل
کا نور۔

جب تم لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھو تو ان میں
شامل ہو جاؤ اور جب بُرے کاموں میں مصروف
دیکھو تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ۔

انسان کتنا ہی منلوک الحال ہو مگر مغلوب الحال
نہ بنے۔
افضل ترین ایمان یہ ہے کہ تُو خدا کو ہر وقت اپنے
ساتھ سمجھے۔

تکوار کا زخم بدن پر لگتا ہے مگر نہ ہی عادت کا زخم
روح پر۔
سختی پھل ہے مال کا، عمل پھل ہے علم کا،
رضائے الٰہی پھل ہے اخلاق کا۔

ہر وہ کام دنیا ہے جس سے آخرت مقصود نہ ہو
خواہ نماز جیسی نیکی ہی کیوں نہ ہو۔
دنیا فانی کی لذتیں لینے سے عالم باقی کے
اجر و ثواب میں کمی ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ: سعید ندوی، لاہور)

نظر آ گیا ہو گا۔ لیکن اس آیت سے آپ کو اس رفعت کا
صحیح اندازہ ہو گا جو آنحضرت ﷺ کے ذکر مبارک کو عرض
سے فرش تک حاصل ہے۔ چودہ سو برس سے نہیں بلکہ خدا
ہی بہتر جانتا ہے کہ کب سے ہو رہا ہے اور نجانے کب
تک ہوتا رہے گا۔

یہ ہے اس مختصر آیت ”رَزَقْنَاكَ ذِكْرَكَ“ کی
تفسیر ایک بڑے بڑے عالم عاصمی کے نزدیک جس پر بہت
کم مفسرین نے توجہ مبذول فرمائی۔

◆◆◆

زیادہ اور عبادت گزار بندوں سے قطع نظر جو دن رات
درود تسبیح میں مشغول رہتے ہیں، ایک عام دنیا دار مسلمان
کی زندگی پر جس کے ہاں مذاہب عموماً روایتی رسوم کی
خانہ پرستی کا نام رو گیا ہے، اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے، تو
معلوم ہو گا، اس میں بھی مہد سے لحد تک حضور ﷺ کا اسم
گرامی ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے
ساتھ ہی دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی
جاتی ہے جس میں اسم گرامی کی تکرار ہوتی ہے۔ عقیدہ اور
ختمہ کے مواقع پر بھی اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ
رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے جو ادا کی جا رہی ہے۔ نکاح
کا تو نام ہی عرف نام میں سنت نبوی ﷺ ہے۔ قاضی بہ
موقع نکاح جو خطبہ پڑھے، بالخصوص اس کا ذکر کیا جاتا
ہے۔

لیکن ”رَزَقْنَاكَ ذِكْرَكَ“ کا ایک تیسرا پہلو
بھی ہے جو ان سب سے بڑھ کر ارفع اور ذنی ہے۔ جس
کی مثال نہ کسی دوسرے مذہب میں نظر آتی ہے اور نہ کسی
اور پیغمبر کے متعلق اس قسم کا ارشاد گرامی دکھائی دیتا ہے۔

اور وہ ہے یہ آیت کریمہ
ان اللہ وملتکنتہ یصلون علی النبی یا ایہا
الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما
(الاحزاب۔ ۵۶)

ترجمہ: ”خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ
(خود) اور (اس کے) تمام فرشتے رسول اکرم ﷺ پر
درود بھیجتے رہتے ہیں، ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام
بھیجتے رہو۔“

اس دنیائے آب و گل میں تو حضور اکرم ﷺ کے
ذکر مبارک کا کچھ تھوڑا سا نمونہ آپ کو درج بالا سطور میں

◆◆◆

سکھائیں جو اللہ نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی ہیں۔ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ کا مخالف امیہ بن خلف تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر ان سرداران مکہ میں سے ایک یا دوسرا بھی ہماری دعوت اسلام قبول کر لیں، تو مسلمانوں کی تقویت کا باعث ہوگا۔

اس موقع پر آپ ﷺ کو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی مداخلت ناگوار گزری اور آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف بے رحمی برتی۔ اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ ﷺ کا یہ طرز عمل پسند نہ آیا۔ لہذا آپ ﷺ پر سورہ بھیس (پارہ تیس) نازل فرمائی گئیں۔ اس سورہ کی پہلی دس آیات حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی حمایت میں نازل فرمائیں۔ ان دس آیات کا ترجمہ یہ ہے:

”ترش رو ہوا اور بے رحمی برتی اس بات پر کہ وہ نابینا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خیر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو۔ جو شخص بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر کوئی الزام نہیں۔ اور جو شخص تیرے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ ڈر بھی رہا ہے تو اس سے ٹو بے رحمی برتا ہے۔“ (سورہ بھیس پارہ تیس)

حدیث میں ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد دربار نبوی ﷺ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا احترام بہت بڑھ گیا۔ آپ ﷺ ان کی طرف خصوصی توجہ دیتے اور بہت خیال فرمانے لگے۔ جب بھی آپ کا شانہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے، تو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ آپ کی بہت خاطر مدارت کرتیں۔ آپ کا نام عبداللہ تھا۔ والد کا نام تیس بن سعد اور

والدہ کا نام عاتکہ بنت عبداللہ۔ والدہ کے نام کی مناسبت سے آپ کی کنیت ام مکتوم تھی۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم پیدائشی نابینا تھے۔ رشتے میں رسول اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ، ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ کے بھوپتی زاد بھائی تھے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ سے آپ کی عزیز داری تھی۔

جب آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، تو جنھوں نے اول اذل دعوت پر لبیک کہا اور اسلام لے آئے، وہ ”سابقون الاولین“ (یعنی اسلام قبول کرنے میں سبقت لے جانے والے لوگ)۔ ان میں حضرت خدیجہ الکبریٰ کی طرح عبداللہ بن ام مکتوم بھی شامل تھے۔ سابقون الاولون میں جہاں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت خدیجہ اور بچوں میں حضرت علی کا نام نای آتا ہے وہاں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا نام بھی شامل ہے۔ آپ ان چند خوش قسمت اصحاب میں شامل تھے جنھیں حضور اکرم ﷺ کی دعوت پر پہلے پہل اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وہ جگہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا ذکر کیا ہے۔ سورہ بھیس کی پہلی دس آیات مبارکہ آپ کی شان میں نازل ہوئیں۔ دوسری جگہ سورہ انسا میں بھی آپ کے جذبہ شوق جہاد کے پیش نظر نہ صرف ذکر آیا بلکہ آپ کی خواہشات کے مطابق اللہ نے آیت نازل فرمائی۔ آپ حضرت بلال کے علاوہ موزن رسول بھی تھے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ ہی نے موزن مقرر فرمایا۔

حضرت عبداللہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ نے کم و بیش ۱۳ مرتبہ آنحضرت کی عدم موجودگی میں مسجد نبوی ﷺ میں آپ ﷺ کی نیابت (امامت) کے فرائض انجام دیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی سعادت تھی جو انھیں نصیب ہوئی۔ سب سے پہلے جب غزوہ بدر میں شرکت کرنے نبی کریم ﷺ تشریف لے گئے، تو اپنے پیچھے آپ ہی کو مدینہ شہر میں اپنا نائب اور مسجد نبوی میں امام مقرر فرمایا۔ فتح مکہ کے وقت بھی آپ نے مسجد نبوی میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم قرآن پاک کے حافظ بھی تھے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ان جانثار صحابہ میں شامل تھے۔ جنھیں آنحضرت نے ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ مدعا یہ تھا کہ آپ مدینہ جا کر وہاں لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ آپ ہجرت رسول اللہ ﷺ سے چند ماہ قبل حضرت مصعب بن عمیر کے ساتھ مدینہ آ گئے۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے، تو اسی سال نماز کے لیے اذان دینا شروع ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت بلال کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی موزن مسجد نبوی ﷺ کے منصب جلیلہ پر مامور فرمایا۔ یہ دونوں اصحاب آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں مسجد نبوی ﷺ میں اذان دینے کے فرائض نہایت تندہی سے انجام دیتے رہے۔

رمضان المبارک میں یہ دستور تھا کہ لوگوں کو جگانے کے لیے حضرت بلال پہلی اذان دیتے تھے اور اختتام سحر کے وقت دوسری اذان حضرت عبداللہ بن ام مکتوم دیا

کرتے۔ آپ کی اذان کے بعد مسلمان روزے دار کھانا پینا ترک کر دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ مسجد نبوی ﷺ میں اذان حضرت بلال دیتے اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم اقامہ (کلیر) پڑھتے۔

حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ میں اور حضرت مہوڑہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھیں کہ اس مجلس میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم تشریف لائے۔ ہم نے سوچا کہ وہ نابینا ہیں، تو ہم نے ان سے حجاب نہیں کیا۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ حجاب کریں۔ میں نے جواب دیا کہ حضور ﷺ وہ تو نابینا ہیں، وہ کچھ نہیں سکتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا آپ بھی لاندھی ہیں؟ آپ کی نظریں ان پر نہیں پڑ رہیں؟ اس کے بعد ہم نے حجاب کر لیا۔ اس مشہور حدیث کی روایت منکلوۃ، ترمذی، ابوداؤد اور مسند احمد میں موجود ہے۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں پردے کی کس قدر تاکید کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ایک دن رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ”یا رسول اللہ ﷺ! میں نابینا آدمی ہوں۔ میرے گھر اور مسجد کے درمیان راستہ ناہوار ہے۔ کئی درخت اور ہماڑیاں بھی باعث رکاوٹ بنتی ہیں۔ میرے پاس کوئی آدمی بھی نہیں جو میری راہنمائی کر سکے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد تک لاسکے۔ کیا آپ میرے لیے کوئی رخصت پاستے ہیں کہ میں اپنے گھر ہی میں نماز پڑھ لیا کروں اور مسجد میں حاضر ہونے کی تکلیف سے بچ جاؤں؟“

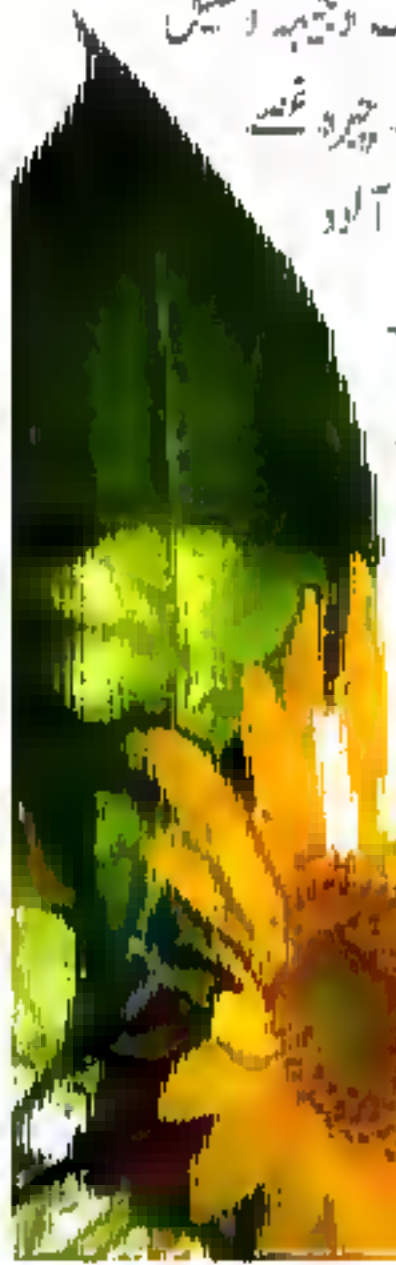
رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی

رہے ہیں۔

مدینے کے قافلے میں عراق و شام کے نو مسلم سردار بھی ہیں۔ امیر المؤمنین کی سعیت میں طواف کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کے خیال سے مسجد الحرام میں موجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ جب یہاں ہے۔ لبیک لبیک کی رنگداز صداؤں سے نضا گونج رہی ہے۔ امیر غریب بادشاہ اور رعایا سب یکساں لباس زیب تن کیے اللہ کے دربار میں حاضر ہیں۔ سب کی زبان پر ایک کلمہ ہے۔

تلبیہ کی اس مقدس فضا میں ناگہاں ایک کرخت آواز گونجنی ہے "تلاخ"۔ طواف کرنے والے رک گئے۔ لبیک لبیک کی صدا میں جھمی پڑ گئیں۔ ہتھس زگا ہیں دیکھتی ہیں کہ ایک بدستفید احرام پہنے کھڑا ہے۔ اس کی ناک کا ہانسا میڑھا ہو چکا اور خون بہ رہا ہے۔ بدو کے قریب ہی ایک وجیہہ تشکیل

عرب اول فول بک رہا ہے۔ چہرہ غصے سے سرخ ہے اور وہ غضب آلود نگاہوں سے بدو کو گھور رہا ہے۔ اللہ نے جس مقدس گھر کو جائے امن قرار دیا جہاں



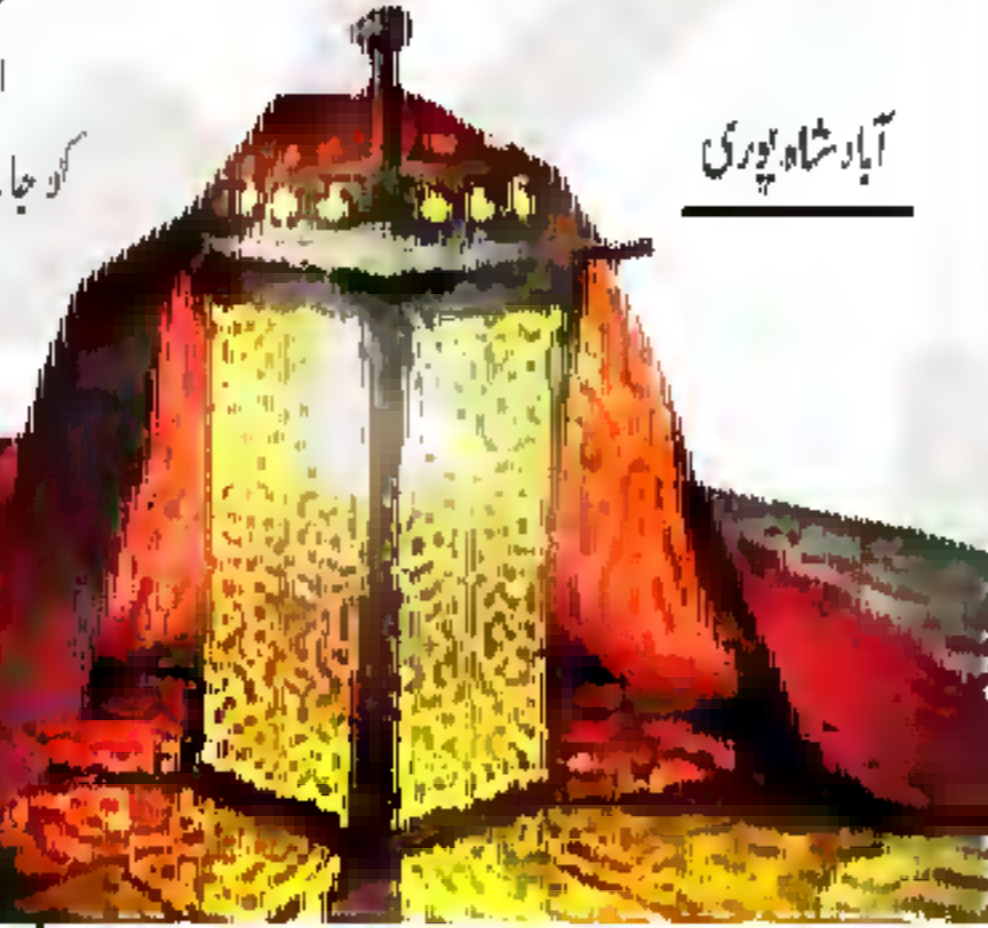
الحرام اللہ کا پاک اور محترم گھر عرب کے بیت گوٹے گوٹے سے آئے ہوئے زائرین سے بھرا ہوا ہے۔ لبیک لبیک لاشریک لبیک کی پکار ہرزبان پر ہے۔ غلام اپنے آقا کو پکار رہے ہیں۔ ان کی پکار و الہیت ہے اور عجز و انکسار بھی۔ ایک بہت بڑی جماعت طواف کعبہ میں مصروف ہے۔ امیر المؤمنین عمر بن خطاب اور ان کے ہمراہی مدینہ النبی سے تھوڑی دیر پہلے پہنچے ہیں اور طواف کر

تاریکی میں مثل مشعل

جن سے ملے روشنی حصہ دوم

معرکہ خیر و شر میں بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کرتے والے بیش قیمت واقعات

آباد شاہ پوری



ترجمہ: ضرور رسیدہ (مغذور) افراد کے علاوہ جو مسلمان (بوقت جہاد) اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے ہم مرتبہ نہیں جو اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں۔"

(سورۃ النساء آیت: ۹۵) جب آپ نے یہ آیت سنی، تو آپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ آپ کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ حالانکہ آپ کو جہاد میں شریک ہونے سے استثنیٰ مل چکا تھا، اس کے باوجود جہاد میں شریک ہونے کا شوق اس قدر تھا کہ آپ نے پھر بھی کئی غزوات میں حصہ لیا۔ آپ کہتے کہ مجھے علم تھا میں ایک جگہ میدان جنگ میں اسے پکڑے کھڑا رہوں گا جس سے مسلمانوں کے پایہ استقلال میں لفرش نہیں آئے گی اور ان کے حوصلے بلند رہیں گے۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم خلیفہ رسول ﷺ کی اجازت سے ۱۳ھ میں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے۔ تین دن تک ایرانیوں سے معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ انھوں نے زور بھنی ہوئی اور حکم نھام رکھا تھا۔ تین دن بعد جب مسلمان رات سے ہم کنار ہوئے، تو مسلمان غازیوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم شہادت کے رتبہ سے سرفراز ہو چکے ہیں اور آپ نے علم اسی طرح سے اپنے ہاتھوں سے تمام رکھا تھا۔ یہ ۶۳۶ء کا واقعہ ہے۔ آخر کار نائب رسول ﷺ اور موزان رسول ﷺ نے شہادت جیسے رتبے کو گلے لگا کر قرآن پاک کی تفسیر کا عملی نمونہ تاریخ اسلام میں رقم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مشقت اور پریشانی دیکھی۔ آپ کا عذر معقول تھا جہاں چہ آپ نے فرمایا "ہاں! تم گھر میں نماز پڑھ سکتے ہو۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن ام مکتوم واپس چلے گئے۔

بند کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مسلمان مدینہ چلے آئے تو کفار مکہ کے غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ مسلمان مدینہ اور کفار مکہ کے درمیان غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کو کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم چونکہ آنکھوں کی بینائی سے محروم تھے اس باعث جہاد میں شرکت کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ حالانکہ ان کے دل میں جذبہ جہاد جنوں کی حد تک موجود تھا۔ اسی اثنا میں قرآن پاک کی یہ آیت اتری:

"ترجمہ: وہ مسلمان جو (بوقت جہاد) اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، رتبے میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں۔" آنحضرت ﷺ کا سب وحی حضرت زید بن ثابت کو یہ آیت لکھوا رہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جب یہ ارشاد ربانی سنا تو حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا "مجھے جہاد میں شریک ہونے کی قدرت حاصل ہوتی تو ضرور شرف جہاد حاصل کرتا جس سے میں محروم ہو گیا ہوں۔"

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی یہ حسرت بھری خواہش بارگاہ خداوندی میں اتنی پسندیدہ بنی کہ اس کے بعد ایک اور حکم الہی نازل ہوا جس میں انھیں اور ان جیسے تمام مغذور افراد کو جہاد میں شریک ہونے کے حکم سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ آیت ربانی یہ ہے:

توجہ فرمائیے

شمارہ دہم میں جناب آبا دشاہ پوری کا مضمون "جس سے ملے روشنی" شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک اسلامی واقعہ "اسلام میں قانونی مساوات" جو جوڈیکل سٹائٹسٹس نہیں ہو سکا جس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔ یہ واقعہ زیر نظر مضمون میں اول تا آخر پیش خدمت ہے۔

خدا کا شکر

حضرت زبیر بن العوامؓ کے بیٹے عروہ ابن زبیر طبرستان استقامت کے پیکر مجسم تھے۔ بڑی سے بڑی آزمائش اور تکلیف کے موقع پر بھی زبان سے آف نہ نکلتی۔ ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک کے پاس شام گئے۔ ان کے لڑکے محمد بھی ساتھ تھے۔ شاہی اصبل رکھنے گئے۔ ایک گھوڑے نے ان کے بیٹے کو چک دیا۔ وہ اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔ خود ان کے پاؤں میں سخت چوٹ آئی۔ کچھ مدت بعد عروہ کے پاؤں میں زخم ہو گیا جو سوراخ کی شکل اختیار کر گیا۔ اطباء نے مشورہ دیا کہ پاؤں کاٹ دیا جائے ورنہ زہر تمام جسم میں پھیل جائے گا۔ عروہ اس وقت ضعیف ہو چکے تھے لیکن انھوں نے جوانوں سے بڑھ کر ہمت و استقلال سے کام لیا۔ پاؤں کاٹنے سے پہلے طبیب نے کہا "تمہاری ہی شراب پی لیجیے تاکہ تکلیف کا احساس کم ہو۔" فرمایا: "جس مرض میں مجھے صحت کی امید ہو اس میں بھی حرام ٹے سے مدد نہ لوں گا۔" طبیب نے کہا: "تو بے ہوشی والی دوا ہی استعمال کر لیجیے۔" فرمایا: "میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میرے جسم کا ایک عضو کاٹا جائے اور میں اس کی تکلیف محسوس نہ کروں۔" جراثیم کے وقت چند آدمی آپ کو سنبھالنے کے لیے آئے۔ عروہ نے پوچھا: "تمہارا کیا کام ہے؟"

والا تھا۔ وہ بول اٹھا "میں تو یہ سمجھ کے مسلمان ہوا تھا کہ پہلے سے زیادہ عزت و کرم ہوگی لیکن آپ مجھے ایک عامی کے دوش بدوش کھڑا کر رہے ہیں۔" اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا اور ایک جا رہا تھا۔

"جبلہ اسلام خاص و عام میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ یہاں عزت و شرف اس شخص کو حاصل ہے جس کے اعمال نیک اور اچھا اخلاق ہے۔ اگر عمر سے بھی کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اسلام کا قانون اس سے بھی باز پرس کرے گا۔ عزت چاہتے ہو تو اس بدو کو راضی کرو۔ ورنہ مجمع عام میں بدلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"یہ بات ہے تو میں اسلام سے باز آیا میں پھر عیسائی ہو جاؤں گا۔" جبلہ نے جھلاتے ہوئے کہا۔
"عیسائی ہو جاؤ گے؟ پھر تمہاری گردن مار دی جائے گی۔ اسلام میں مرتد کی یہی سزا ہے۔"
امیر المومنینؓ کے الفاظ سخت مگر لہجہ نہایت نرم تھا۔

جبلہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا "امیر المومنینؓ مجھے ایک رات کی مہلت دیجیے میں اس معاملے پر غور کر لوں۔"
امیر المومنینؓ نے درخواست قبول کر لی۔ مسلمان مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ اگلی صبح چلا گیا کہ جبلہ اپنے ہمراہیوں سمیت بھاگ گیا ہے۔ وہ قیصر روم کے پاس پہنچا اور دوبارہ عیسائی ہو گیا۔ قیصر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے تخت پر جگہ دی۔ کسی شخص نے کہا "امیر المومنینؓ درگزر فرماتے تو جبلہ دشمنوں کی صف میں نہ جاتا۔"

امیر المومنینؓ نے سنا تو فرمایا۔ بادشاہ ہو یا عامی اسلامی قانون ہر شخص پر لاگو ہوگا۔ عمر اگر کسی شخصیت کی خاطر اسلامی قانون کو معطل کر دے تو اس سے بڑھ کر ظالم اور کوئی نہیں۔"

مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کئی بار خیر اڑی کہ جبلہ بیماری فوج لیے مدینے پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایسی ہی خیرین کر ایک مرتبہ سخت گرمی اور قحط کے زمانے میں تبوک کی جانب مسلح ہو کر لشکر کشی کی تاکہ دشمن کو سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ بعد ازاں حضور نے زید بن حارثہ کی قیادت میں بھی ایک فوج روانہ کی چنانچہ موتہ کے مقام پر غسانیوں سے زبردست جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کے تین سپہ سالار کام آئے۔ خالد بن ولید بڑی مشکل سے مسلمان فوج کو موتہ کے مت سے نکال کر لائے۔

وہی جبلہ سر تسلیم خم کیے اب مدینے آ رہا تھا۔ اہل مدینہ نے اس کا شایان شان استقبال کیا اور سر آنکھوں پر ہٹھکایا۔ اب وہ امیر المومنینؓ کے ساتھ حج کرنے آیا تھا۔ اس نے اسلام کے آگے اپنا سرتو جھکا دیا۔ مگر ابھی اس کے سر سے بادشاہی کی خوب اور تختوں نہیں گئی تھی۔ اسی سخت کے ہاتھوں ایک مسلمان بیت الحرام کے اندر لوہلبان کھڑا تھا۔

بدو جو قبیلہ فزارہ کا آدمی تھا خون آلود احرام کے ساتھ امیر المومنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر المومنینؓ نے جبلہ کو بلایا فریقین کا بیان سنا۔ پھر فرمایا:

"جبلہ زیادتی تمہاری ہے۔ اب یا تو اس فزاری کو راضی کرو یا قصاص دو۔" جبلہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا "امیر المومنینؓ مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔ کیا آپ ایک فرومایہ شخص کے بدلے مجھ سے قصاص لیں گے؟ میں ایک بادشاہ ہوں اور وہ رعایا کا ایک عام فرد۔"

"اسلام میں بلند دست سب برابر ہیں۔ اسلامی قانون کی نظر میں بادشاہ اور رعایا سب ایک ہیں۔" امیر المومنینؓ کا جواب جبلہ کو حیرت میں ڈال دینے

پہنچ کر ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ اور ماسون سمجھتا ہے جس کے احترام میں بڑے بڑے خود سر اور مسترد اپنی گردن خم کر دیتے ہیں۔ اس مقدس مقام پر یہ ظلم!

"بات کیا ہے؟" لوگ بدست پوچھتے ہیں۔
"اس شخص کا تہ بند زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ پیچھے سے انسانوں کا ریلنا جو آیا تو میرا پاؤں اس پر جا پڑا اور اس نے مجھے تھمڑو سے مارا۔" بد خون پوچھتے ہوئے بولا۔
"ظلم ہے ظلم۔" ایک شخص پکار اٹھتا ہے۔
"بھینر بھاڑ میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ آپ کو درگزر سے کام لینا چاہیے تھا۔ دوسرا اس وجہہ عرب سے نرمی سے کہتا ہے۔"

"آپ کون ہیں صاحب؟ قصور آپ کا اپنا تھا۔ ایک مسلمان بھائی کو لوہلبان کر دیا۔" تیسرا تند و تیز لہجے میں سرزنش کرتا ہے۔

"میں؟ جبلہ ہوں غسان کا بادشاہ! اگر حدود حرم میں نہ ہوتا تو اس گستاخ کی گردن مار دیتا۔" وہ نفرت بھری نگاہوں سے بدو کو دیکھتا اور پوچھنے والے کو بڑے تکبر سے جواب دیتا ہے۔

شام کے غسان عربوں کا حکمران جبلہ بن اسیم انصار کا ہم جد تھا۔ حوران اور بلقا کا تاجدار۔ چند ماہ پہلے وہ مدینہ النبی میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا۔ مسلمانوں میں اس کی آمد کی خیرین کر مسرت اور انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ جبلہ بڑے جاہ و حشم اور تمکنت کے ساتھ سیکڑوں خدام اور مصاحبین اپنے جلو میں لیے مدینے آیا۔ شہر کے بچے بوڑھے اور جوان سب جلوں کا نظارہ دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ خواتین بھی اپنے گھروں کی چھتوں پر آئند آئیں۔

مسلمانوں کی مسرت فطری تھی۔ جبلہ اسلام اور

”زیادہ تکلیف کے وقت صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس لیے آپ کو سنبھالنے آئے ہیں۔“ فرمایا ”مجھے امید ہے تمہاری مدد کی ضرورت نہ پڑے گی۔“ اور نہایت استقلال کے ساتھ پاؤں کٹوا دیا۔ پاؤں نختوں سے الگ کیا گیا تو زبان پر تسبیح و تہلیل تھی۔ خون بند کرنے کے لیے زخم داغا گیا تو تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھے اور بے ہوش ہو گئے لیکن جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ اور چہرے کا پسیٹا پونچھ کر کٹا ہوا پاؤں منگوا دیا اور دیکھا۔ اس کو الٹا پلٹا اور خطاب فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس نے تجھ سے میرا بوجھ اٹھوایا یہ خوب جانتا ہے کہ میں کسی حرام راستے پر گامزن نہیں ہوا۔“

ان حوادث اور مصائب کے باوجود زبان شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ ہوئی اور ہمیشہ خدا کا شکر ہی ادا کرتے رہے۔ اکثر فرمایا کرتے: ”یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے چار ہاتھ پاؤں میں سے ایک ہی لیا۔ اور تین سلامت رکھے۔ ایک بیٹے ہی کو لیا اور تین باقی رکھے۔ تو نے کچھ لیا ہے تو بہت کچھ باقی رکھا۔ اگر کچھ مسیبت میں مبتلا کیا تو بہت دنوں عافیت میں بھی رکھا۔“

دولت دنیا سے بے نیازی

صفوان بن سلیم زہری ان تابعین میں سے ہیں جن کے علم و فضل کا سکہ دور دور تک رواں تھا بڑے ہی عابد و زاہد۔ اتفاقاً فی سبیل اللہ کا یہ حال تھا کہ بدن کے کپڑے تک اتار کر دے دیتے۔ ایک رات مسجد سے نکلے۔ سخت سردی تھی۔ باہر ایک آدمی ٹنگے بدن نظر آیا۔ صفوان نے اسی وقت اپنے کپڑے اتار کر دے ڈالے۔ اس وقت اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک مدینے آیا اور عمر بن عبدالعزیز کے ہمراہ مسجد نبوی میں گیا۔ ظہر کی نماز کے بعد مقصودہ کے قریب بائیں

جانب دیکھا تو صفوان بیٹھے ہیں۔ سلیمان انہیں نہ پہچانتا پوچھا ”یہ کون بزرگ ہیں؟ ان سے بہتر پیشانی میں نے آج تک کسی شخص کی نہیں دیکھی۔“

”امیر المؤمنین! یہ صفوان بن سلیم ہیں۔“ عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔

سلیمان نے غلام کو پانچ سو دینار کی تھیلی دی اور کہا جاؤ ان بزرگ کو دے آؤ۔ غلام نے خدمت میں حاضر ہو کر تھیلی پیش کی اور عرض کیا:

”یہ امیر المؤمنین کی جانب سے تحفہ ہے۔ وہ یہاں مسجد میں تشریف فرما ہیں۔“

”تمہیں دھوکا ہوا ہے کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی۔“ صفوان نے کہا۔

”آپ صفوان نہیں ہیں؟“ غلام نے پوچھا۔

”ہوں تو میں ہی۔“ آپ نے فرمایا۔

”تو یہ تھیلی آپ ہی کو دی ہے۔“

فرمایا ”جاؤ دوبارہ پوچھ آؤ۔“

چونکہ غلام پوچھنے گیا صفوان جوتے لٹھا مسجد سے نکل گئے۔ پھر جتنی دیر سلیمان مسجد میں رہا وہاں نہ گئے۔

زمین کا طوق

اندلس کے اموی حکمران الحکم نے پہاڑی کی چوٹی سے وادی کبیر کے کنارے پر ایک طائرانہ نظر ڈالے۔ بڑا دلکش نظر تھا۔ دریا کے کنارے سے بلند و بالا درختوں کی قطار چلی گئی تھی۔ عقب میں وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ سبزہ ختم ہوتے ہی قرطبہ کی عمارتیں شروع ہو گئی تھیں۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا اور شفق کی سرخی میدان کے سبزے سے لگنے لگ کر عجب بیمار دے رہی تھی۔ الحکم کو یہ منظر کچھ ایسا بھایا کہ میدان میں ایک عظیم الشان قصر بنوانے کا فیصلہ کر لیا۔

انجینئر اور کاریگر طلب کیے گئے۔ نقشہ تیار ہو گیا۔ زمین کی پیمائش ہوئی۔ قصر سے حسن دوہلا کرنے اور باغات لگوانے کے لیے قرب و جوار کے مکانات گرانے کا فیصلہ ہوا۔ مالکوں سے بات چیت کی گئی۔ سب نے معقول معاوضہ لے کر مکان دے دیئے لیکن ایک بیوہ خاتون نے اپنا مکان بیچنے سے صاف انکار کر دیا۔ شاہی حکام نے ہر چند کہا دوسرے لوگوں سے کئی گنا قیمتی پیش کی دباؤ ڈالا ڈرایا دھمکایا مگر بیوہ تحریریں کے دام میں آئی نہ دھمکیوں سے مرعوب ہوئی۔ معاملہ الحکم تک پہنچا۔ وہ سخت چرسٹا پا ہو گیا۔ فوراً فرمان جاری کیا ”مکان زبردستی لے لیا جائے اور قصر کی تعمیر شروع کر دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ کوئٹال نے بیوہ کو زبردستی مکان سے کال دیا۔ کدال اور پھاڈڑے حرکت میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان زمین بوس ہو گیا۔ چند ماہ بعد اس کی جگہ ایک خوش نما قصر اٹھائے کھڑا تھا۔

عورت نے عدالت میں بادشاہ پر استغاثہ دائر کر دیا۔ قاضی سے کہا ”میں ایک غریب بیوہ ہوں بادشاہ نے میرے یتیم بچوں کا حق غصب کر لیا ہے۔ بادشاہ کے مقابلے میں انصاف کی توقع کم ہے لیکن اگر آپ آزادی اور حرات سے کام لیں اور انصاف کریں تو میرے بچے کبھی اپنے حق سے محروم نہیں رہ سکتے۔“

”ہاں بی بی بے فکر رہو میں عدل و انصاف سے کام لوں گا۔ بادشاہ اور ایک غریب عورت۔ میری نظر میں یکساں ہیں۔ اگر تمہارا حق بنتا ہے تو کوئی تمہیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔“ قاضی نے جواب دیا۔

قاضی بادشاہ کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ وہ بڑا تند خو اور شعلہ صفت انسان تھا۔ ایک بار اس نے دھوکے سے اپنے تین سو مخالفین قتل کر کے ان کے سر محل پر لٹکوا دیئے تھے۔ کسی کو اس کے سامنے بولنے کی مجال نہ تھی۔

قاضی نے عورت کو لمبی تاریخ دی اور الحکم کے نام عدالت میں حاضر ہونے کے سن جا دی کر دیے۔ عورت لمبی تاریخ ملنے کے بعد ماہوں ہو گئی لیکن قاضی چاہتا تھا کہ سماعت کی نوبت نہ آئے اور دوسری تدبیروں سے غریب عورت کا حق مل جائے۔

قصر تعمیر ہو چکا تھا باغات لگ رہے تھے۔ ایک روز قاضی کو خبر ملی کہ بادشاہ قصر کا سحانہ کرنے تھا جا رہا ہے۔ قاضی گدھے پر خالی بورا لادے پہنچ گیا اور عرض کی کہ غلام اس جگہ کی مٹی بطور اعزاز اپنے پائیں ہانگ میں ڈالو! چاہتا ہے۔ ایک بورا بھرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ قاضی بورا بھر چکا تو کہنے لگا: ”تھوڑا سا ہاتھ بنائیے میں بورا گدھے پر رکھ لوں۔“ بادشاہ مستغر کے انداز میں اس دیا اور بوجھ اٹھانے میں مدد دی لیکن بورا بہت بھاری تھا اٹھ نہ سکا۔

قاضی نے کہا ”اے امیر! آپ ایک بورے کا بوجھ دوسرے کی مدد سے بھی نہیں اٹھا سکتے پھر قیامت کے روز جب حاکموں کا حاکم ذرا ذرا حساب لے گا اور عدل و انصاف کے لیے رعایا اور بادشاہ اور فقیر و غنی سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دے گا جب غریب دے نو اپنے اچھے اعمال کی بدولت نا انصاف بادشاہوں پر سبقت لے جائیں گے اور جب وہ غریب بیوہ عورت جس کا مکان زبردستی چھین کر آپ نے یہ محل بنوایا ہے بارگاہ الہی میں آپ کے خلاف استغاثہ دائر کرے گی اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس زمین کا طوق آپ کی گردن میں ڈال دیا جائے تو آپ اس کا بوجھ کیسے اٹھا سکیں گے؟“

الحکم قاضی کی تقریر سن کر رونے لگا۔ اسی وقت حکم دیا کہ محل اور باغات مع ساز و سامان کے اس بیوہ عورت کو دے دیے جائیں۔ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب اپنے اصحاب کی مفضل

کیوبا میں پہلی مسیحی

ترک وزیراعظم طیب اردگان کی سعی سے اب کیونٹنوں کے گڑھ میں بھی اذان کی بابرکت آواز گونجے گی

باری محمود

صدرہ طیب اردگان چاہتے ہیں کہ لاطینی ترک امریکا میں اسلام کا امن و سلامتی والا پیغام پھیلایا جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش پر 15 نومبر 2013ء کو اسٹیبل میں لاطینی امریکا کے مذہبی رہنماؤں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں 30 ممالک کے 6 علماء شریک ہوئے۔ اسی کانفرنس میں ترک وزیراعظم نے یہ اعلان کر کے دنیا کے مغرب میں خاصی اپیل مچا دی کہ امریکا کرسٹوفر کولمبس نہیں مسلمانوں نے دریافت کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب ایشیا تا افریقا مسلمانوں کی حکومت تھی، تو مسلم جہاز رانوں نے دور دراز کے سفر کیے۔ یہ مسلم جہاز ران بڑے ذہین، دلیر اور قابل تھے۔ انہوں نے جہاز رانی میں استعمال ہونے والے کئی آلات ایجاد کیے۔ ان میں بعض اب بھی قابل استعمال ہیں۔ چنانچہ یہ عین اغلب ہے کہ اس زمانے میں مسلم جہاز



بھڑائیں تھیں سخت سزا دوں گا۔ پھر عمر اپنے غلام کو حکم دیتے ہیں ”اون کا ایک چغہ ایک لائچی اور بیت المال کی تین سو بکریاں لاؤ۔“ حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔

”یہ چغہ لائچی اور بکریاں لو اور فلاں جگہ چلے جاؤ اور چراؤ۔“ امیرالمومنین عیاض سے کہتے ہیں۔

گریموں کا موسم اور پھر یہ مشقت۔ عیاض بن غنم سنانے میں آجاتے ہیں۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑے ہیں۔ انکار کی مجال ہے اور نہ تعمیل کا یارا۔ انہیں متذقرب پا کر امیرالمومنین کہتے ہیں: ”کیوں؟ تمہیں تال ہے؟ میں نے تمہارے باپ کو دیکھا ہے۔ یہ چغہ اس کے چغہ سے اور یہ لائچی اس کی لائچی سے بہتر ہے۔ اٹھو اور بکریاں لے جاؤ اور چراؤ۔“ ہاں کسی سائل کو اس کے درود سے محروم نہ رکھنا۔ یہ بھی جان لو کہ عمر کے گھر والوں نے بیت المال کی ان بکریوں سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نہ درود پیا اور نہ ہی ان کا گوشت کھایا۔

عیاض بن غنم ابھی تک دم بخود کھڑے ہیں۔ عمر فرماتے ہیں: ”سنائیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ عیاض پھر بھی چپ رہتے ہیں۔ عمر تین بار یہی الفاظ کہتے ہیں۔ تیسری بار عیاض زمین پر گر پڑتے ہیں مگر عمر کا فیصلہ اٹل ہے وہ اپنی سزا نافذ کر کے رہتے ہیں۔ چند روز بعد عیاض کو طلب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

”اب اگر میں تمہیں واپس مصر بھیج دوں اور تمہارا منصب بحال کر دوں تو تم کیسے انسان ثابت ہو گے؟“

”جیسا آپ چاہیں گے۔“ عیاض جواب دیتے ہیں۔

امیرالمومنین انہیں گورنری پر بحال کر دیتے ہیں۔ عیاض مصر کا پتہ ہیں تو وہ بالکل بدلے ہوئے انسان ہیں۔ عمر کے ذرۂ احتساب نے ان کی گورنری کے کس بل نکال دیے ہیں۔

اور پھر وہ بہترین گورنر ثابت ہوتے ہیں۔

میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی: آپ گورنر بناتے ہیں تو اس پر شرائط عائد کرتے ہیں مگر پھر نہیں دیکھتے کہ وہ ان شرائط کی پابندی کر رہا ہے یا نہیں؟“

حضرت عمر کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور جواب دہی کا خوف آلیتا ہے۔ پوچھتے ہیں: ”کیوں بھائی کی بات ہے؟ کس گورنر کی بات کر رہے ہو؟“

”مصر کے گورنر عیاض بن غنم کی۔ وہ آپ کی شرائط کی پابندی نہیں کرتا ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔“ امیرالمومنین اسی وقت دو آدمیوں کا ایک تعلقاتی کمیشن روانہ کرتے ہیں کہ جاؤ صورت حال کا پتا کرو اگر یہ شخص سچ کہتا ہے تو اسے میرے پاس لے آؤ۔“

دونوں اصحاب مصر پہنچتے ہیں اور لوگوں سے دریافت کرتے ہیں۔ شکایت درست نکلتی ہے۔ پھر گورنر ہاؤس پہنچتے ہیں اور باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔

”اس وقت ملنے کی اجازت نہیں۔“ گورنر کہلا بھیجتا ہے۔

”انہیں کہہ دو باہر نکلیں روز ہم روانہ کے کو آگ لگا دیں گے۔“ امیرالمومنین کے فرستادہ کہتے ہیں۔ ایک جا کر آگ لے آتا ہے۔ گورنر کو خبر ملتی ہے تو وہ باہر نکل آتے ہیں۔

”ہم عمر بن الخطاب کے قاصد ہیں۔ آپ کو ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ دونوں کہتے ہیں۔

عیاض کہتے ہیں: ”ذرا ٹھہریے میں زاوراہ لے لوں۔“ قاصد کہتے ہیں: ”نہیں آپ گھر نہیں جا سکتے۔“ وہیں باہر ہی سے انہیں ساتھ لیتے اور منزلوں پر منزلیں ملنے کرتے ہوئے امیرالمومنین کی خدمت میں لا حاضر کرتے ہیں۔

عیاض بدو تھے مصر کی آب و ہوا میں خاستے گورے بیٹے اور موٹے ہو گئے تھے۔ سلام کرتے ہیں تو امیرالمومنین پوچھتے ہیں: ”انہوں نے تو کون ہے؟“

”عیاض بن غنم آپ کا گورنر مصر۔“

”ہیں نے تمہیں گورنر کچھ شرائط پر بنایا تھا مگر تم نے انہیں قابل امتنا تک نہیں سمجھا بلکہ ان کی خلاف ورزی کی

رلان امریکا جانیچھے تھے۔

اسکو وہی ممتاز عرب جغرافیہ دان گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب، مروج الذهب و معادن الجواہر (شائع شدہ ۱۹۵۶ء) میں ذکر کیا ہے کہ قرطبہ، اندلس کے ایک نوجوان، نشتاش بن سعید نے بحر اوقیانوس پار کیا اور دوسری سمت چلے۔ وہ ملویل عرب سے بعد ۸۸۹ء کو واپس اندلس آئے۔ گویا مسلمان جہاز دان کوہیں سے بہت پہلے براعظم امریکا دریافت کر چکے تھے۔ کوہیں تو ۱۴۹۲ء میں وہاں پہنچا۔

طیب اردگان نے دوران تقریر یہ بھی ذکر کیا کہ کوہیں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے، اسے کیوبا کے ساحل پر مسلمانوں کی عبادت گاہ (مسجد) نظر آئی۔ ترک وزیراعظم کی خواہش ہے کہ مسلمانوں نے براعظم امریکا میں اپنے علم و فنسے آگاہی کی جو روشنی پھیلائی، اسے اجاگر ہونا چاہیے۔ یوں دنیا والوں پر آشکار ہوگا کہ جدید تہذیب و تمدن کی نمود و نشوونما میں مسلمان علما و فضلا کا بھی اہم کردار ہے۔

ترک وزیراعظم کی یہ بھی تمنا ہے کہ لاطینی امریکا کے مختلف علاقوں میں مساجد تعمیر کی جائیں۔ یہ ان کے جوش و جذبے ہی کا نتیجہ ہے کہ کیوبا کی کٹر کمیونسٹ حکومت بھی دارالحکومت ہوانا میں مسجد تعمیر کرنے پر سنجیدگی سے غور و فکر کر رہی ہے۔

کیوبا ۱۹۵۹ء سے کمیونسٹ ملک چلا آ رہا ہے۔ لاطینی امریکا کے اس جزیرے میں اسلام ان مسلم طلبہ نے پھیلا یا جو وہاں تعلیم حاصل کرنے گئے۔ اس وقت ملک میں تقریباً نو ہزار مسلمان آباد ہیں۔ ان کی اکثریت ہوانا میں بسٹی ہے۔

کمیونسٹ مملکت ہونے کے باعث یہ مسلمان اسلامی رسوم کھلے عام ادا نہیں کر سکتے۔ نماز عموماً گھروں میں پڑھتے ہیں۔ گویا پورے کیوبا میں ایک بھی مسجد موجود نہیں۔ نماز جمعہ کسی کے بڑے گھر میں پڑھی جاتی ہے۔ کئی سال قبل سابق کیوبین صدر، فیدل کاسترو نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے لیے ایک عبادت گاہ تعمیر کی جائے گی تاہم وہ ایضاً نہیں ہو سکا۔

چند ماہ قبل طیب اردگان نے ایک سرکاری وفد کیوبا بھیجوا یا۔ اس کے ایجنڈے میں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کرنا بھی شامل تھا۔ ترک اور کیوبین حکومتوں کے مذاکرات کامیاب رہے۔ اور کیوبین حکومت نے مسجد تعمیر کرنے کی ہائی بھر لی۔

اس معاملے میں پیش رفت ماہ نومبر میں ہوئی جب ترک حکومت نے ہوانا میں پانچ ایکڑ قلعہ اراضی خرید لیا۔ اس قطعے پر استنبول کی مشہور اور تاناکوئے مسجد کی طرز پر مسلم عبادت گاہ بنانے کا منصوبہ ہے۔ اور تاناکوئے مسجد انیسویں صدی میں ترک خلیفہ عبدالحمید اول نے تعمیر کرائی تھی۔

مسجد کی تعمیر کے بعد وہاں پانچ سو مسلمان نماز پڑھ سکیں گے۔ شہر کے کچھ کٹر کمیونسٹ لیڈر مسجد کی تعمیر کے مخالف ہیں۔ تاہم ترک حکومت کو یقین ہے کہ یہ مخالفت جلد دم توڑ جائے گی۔ یاد رہے، ترک حکومت جزیرہ ہیٹی میں بھی اپنے فریج پر پہلی مسجد بنوا رہی ہے۔ وہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔

اسلام کی بروجوڑی کے لیے ترک حکومت کی کاوشیں قابل تعریف ہیں۔ طیب اردگان کی قیادت میں ان کی جماعت رفتہ رفتہ ترکی میں شعائر اسلام متعارف کروا رہی

ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں ترک قوم کوئی منفی مغربی رسوم و رواج سے چہرکارا پالے گی۔ مثلاً بیوہ الیاس پہننا، غیر اخلاقی ٹی وی ڈرامے و پروگرام وغیرہ۔

باجواب خاتون کا انتخاب

۱۲ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو بوسنیا و ہرزگووینا میں عہدہ صدارت اور قومی اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے۔ صدارتی انتخابات میں اس یورپی مملکت میں آباد مسلمانوں نے باقر عزت بیگورج کو بطور صدر منتخب کیا۔ آپ مشہور بوسنیائی صدر، عالیجناب عزت بیگورج کے صاحبزادے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں پہلی بار منتخب ہوئے تھے۔

یاد رہے کہ بوسنیا و ہرزگووینا میں بوسنیائی مسلمان، سرب اور کروٹ اپنے اپنے صدر اور ارکان اسمبلی منتخب کرتے ہیں۔ مملکت کی قومی اسمبلی میں کل ۴۲ نشستیں ہیں۔ ان میں سے

۲۸ مسلم و کروٹ اور ۱۴ سربوں کے لیے مخصوص ہیں۔ باقر عزت بیگورج سیان جماعت، پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن کے سربراہ بھی ہیں۔ یہ بوسنیائی مسلمانوں کی اہم جماعت ہے۔ اس نے حالیہ پارلیمانی انتخابات میں ۱۰ نشستیں جیتی ہیں۔ ایک نشست پر پارٹی کی خاتون امیدوار، کانیا زوکو بھی منتخب ہوئیں۔

۲۸ سالہ کانیا زوکو کو نہ صرف قومی اسمبلی کی پہلی خاتون امیدوار ہونے کا اعزاز حاصل ہوا بلکہ خاص بات یہ کہ وہ حجاب بھی پہنتی ہیں۔ کانیا دس سال قبل سیاست

پہن آئیں۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد تھا۔ وہ یہ کہ اپنی صلاحیتیں ملک و قوم کی ترقی میں کام لائیں۔ وہ تین بچوں کی ماں اور اپنی گھریلو و سیاسی ذمے داریاں بہ احسن و خوبی نبھا رہی ہیں۔

کانیا زوکو قاطعہ ایسوسی ایشن کی سربراہ ہیں۔ پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن کی یہ تنظیم ان بچوں کی فلاح و بہبود پر مامور ہے جن کے والدین بوسنیا خانہ جنگی میں شہید ہو گئے تھے۔

بوسنیا و ہرزگووینا کا ۵۱ فیصد علاقہ مسلمانوں اور کروٹوں جبکہ ۴۸ فیصد بوسنیائی سربوں کے پاس ہے۔ بد قسمتی سے ان تین نسلوں کے مابین اختلافات اور بد اعتمادی کی فضا موجود ہے۔ اس لیے مملکت کی معاشی و معاشرتی ترقی موزوں انداز میں انجام نہیں پارتی۔



پہلی بار منتخب خاتون کانیا زوکو

سکڑتے سمٹتے بھارتی مسلمان

بھارت میں مسلمانوں کی آبادی ۱۸ تا ۲۰ کروڑ کے مابین ہے۔ گویا دو تہاں آبادی کا ۱۳ تا ۱۶ فیصد ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے لوگ سبھا (بھارتی قومی اسمبلی) میں ان کی ۶۰ تا ۵۵ نشستیں ہونی چاہئیں۔ لیکن موجودہ لوک سبھا میں صرف ۲۲ مسلم ارکان بھارتی مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

لوک سبھا میں مسلم ارکان کی بہت کم تعداد کے باعث یہ خطرہ پیدا ہو چکا کہ بھارتی مسلمان معاشی،

دو پہرے ساڑھے بارہ بجے وہاں پہنچے۔ یہ ضلع مہم گھونگی کے ایک چھوٹے سے شہر، کادراپور سے چھ کلو میٹر دور دریائے سندھ کے دائیں کٹے کے ساتھ بہتی ایک بہت بڑی نہر، گھونگی فیڈر پر بنا بنا تھا جسے ”گھونگی بند“ کہتے ہیں۔ اس بند کے ذریعے گھونگی فیڈر سے چار چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں۔ یہ بڑی نہر کے دائیں کنارے مختلف ذرائع بنائی ایک دوسرے سے دور ہوتی اور ضلع گھونگی اور ملحق اضلاع کی زرعی زمین

ہوتی تعداد کا چھن مزید چند سال برقرار رہے گا۔ وجہ یہ کہ ہندو عوام اپنے ان ہم مذہب امیدواروں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ لہذا جن حلقوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے، مثلاً کشمیر، بنگال اور کیرالہ وغیرہ میں، وہیں سے مسلمان امیدوار انکیشن جیت سکیں گے۔

معاشرتی اور سیاسی طور پر نہ صرف مزید زوال پذیر ہوں گے بلکہ معاشرے سے کٹ جائیں۔ یہ خطرہ جنم لینے کی بڑی وجہ آ رہی ہے اور بی جے پی کے روپ میں انتہا پسند ہندوؤں کا عروج پاتا ہے۔

بھارت کے ماہر سیاسیات، رشید قدوائی کہتے ہیں: ”بھارت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ عمر اور متحرک جمہوریت میں تمام نسلی و مذہبی گروہ اپنی آبادی کے حساب سے نمائندگی پاتے ہیں۔ لیکن بھارتی مسلمانوں کو برسرِ مرام نمائندگی حاصل ہے۔“

باشعور اور تعلیم یافتہ بھارتی مسلمانوں کا کہنا ہے: ”جب اسمبلیوں میں ہمارے نمائندے ہی نہ ہوں، تو مسلم حقوق کی خاطر کون آواز بلند کرے گا؟“ اس لیے انہیں تشویش ہے کہ غربت، جہالت اور بیماری مسلمانوں کے گرد گھیرا مزید تنگ کر دے گی۔



بھارت میں اب مسلم راہنماؤں کی کوشش ہے کہ آبادی کے تناسب کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں لوک سبہ اور ریاستی اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے۔ ۱۹۳۹ء میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اسی لیے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات ”تناسب آبادی“ یا پورپورٹل ری پریزنٹیشن (Proportional Representation) کے اصول پر منعقد ہوئے تھے۔

۱۹۵۷ء میں بھی لوک سبہ میں صرف ۱۲۳ ارکان مسلمان تھے۔ لیکن اس بار ان کی تعداد میں کمی کا ثبوت دیکھا بن گیا۔ پچھلی لوک سبہ میں مسلمان ارکان کی تعداد ۲۸ تھی۔ جبکہ اس سے پچھلی میں ۳۸ مسلم امیدوار منتخب ہوئے تھے۔

اگر بھارتی حکومت بھی روج پا! اصول تسلیم کر لے، تو قدرتا اس سے بھارتی مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ لوک سبہ میں کم از کم ”۶۰ مسلم ارکان“ بھیج سکیں۔ یوں لوک سبہ میں مسلمان طاقتور گروہ کی حیثیت اختیار کر کے اپنے مطالبات منوا سکیں گے۔ ابھی ٹولن کی آواز فقار خانے میں طوٹی سے ملتی جلتی ہے۔

بھارت کی ریاستی اسمبلیوں میں بھی مسلمان ارکان کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ وجہ یہی کہ بیشتر ریاستوں میں بی جے پی انتخابات جیت کر برسرِ اقتدار آ چکی۔ ماہرین سیاسیات کا دعویٰ ہے کہ اسمبلیوں میں مسلم ارکان کی کم

ایک دیہاتی سندھی کا نعرہ مستانہ

”یہ جامن سندھ کے ہیں“

نفرت کے بھڑکتے الاؤ کو جب محبت کی مہکتی خوشبو نے گل و گلزار بنا دیا.....

ایک دل گداز قصہ جو مدتوں یاد رہے گا

محمد عابد عباسی



پر چون کی ایک بڑی دکان، نزدیکی اجناس کا کاروبار کرنے والوں کی بغیر دراندوزوں والی دکانیں، لوہار کی بھٹی اور بڑھتی اور نائی کے ٹھیسے بنے تھے۔ اس سارے منظر کے سرسری جائزے ہی سے مجھے محسوس ہو گیا، ایسی جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

ہم نے فوری طور پر اپنا کام شروع کر دیا۔ وائزلیس سیٹ اور اس کا انیٹرائزنگ سے اتار زمین پر رکھا۔ بیٹری، جزیرہ، لوہے کا پلنگ اور دیگر متعلقہ سامان بھی نیچے اتار دیا۔ ہمارے ساتھ ٹیلی کمیونٹی کیشن پولیس کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر خیر پور سے ٹیکنیکل عملہ بھی آیا تھا۔ اب وائزلیس اور انیٹرائزنگ کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔ اس کے لیے جگہ کا تعین میجر اشفاق نے کرنا تھا۔ انہیں ہماری راہنمائی کے لیے بنوں، عاقل چھاڈلی سے وہاں آنا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میجر اشفاق فوجی جیب میں اپنے چند جانوروں کے ساتھ آگئے۔ انہوں نے مخصوص انداز میں اپنا تعارف کرایا پھر ہمیں سیدھا بنگلے پر لے جا کر ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا ”آپ وائزلیس اس کمرے میں سیٹ کر لیں۔ انیٹرائزنگ پر نصب کریں۔ جب آپ کا کیونیکیشن ہو جائے تو اپنے ہیڈ کوارٹر سے کہنا، مجھے اطلاع کر دیں۔“

اس کے ساتھ میجر اشفاق نے ”صوبیدار آچر صاحب“ کہہ کر ایک شخص کو آواز دی۔ وہ صاحب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور میجر صاحب کو غیر پیشہ ورانہ انداز میں سلیوٹ کیا۔ انہوں نے ان کا تعارف کرایا ”صوبیدار آچر خرنورس کی کپنی کے صوبیدار اور اس چیک پوسٹ کے انچارج ہیں۔“

انہوں نے صوبیدار صاحب کو ہمارا خیال رکھنے کا کہا اور ساتھ ہی کہنے لگے کہ وہ باقر کو ہم سے ملوادیں۔

یہ ہدایت نوٹ کر وہ روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد صوبیدار آچر نے ہمیں باقر سے ملوادیا۔ وہ دہلا پتلا شخص محکمہ زراعت کا ملازم تھا۔ بند پر آبل بہاؤ کی اونچ نیچ سے اسی نے ہمیں آگاہ رکھنا تھا۔ ہم لوگ اپنے کام پر جت گئے۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد نہ صرف انیٹرائزنگ ہو گیا بلکہ ہمارا رابطہ کراچی، تمام بیراجوں اور اہم بندوں پر قائم فلڈ اسٹیشنوں سے ہو چکا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر ٹیکنیکل عملہ روانہ ہو گیا۔ میں اور رب نواز وہاں رہ گئے۔ اب اگلے چار ماہ تک ہم دونوں کو دین رہنا تھا۔ رب نواز گھوٹکی شہر کا رہنے والا تھا۔ پہلے روز ہی شام کو اگلی صبح آنے کا کہہ کر شہر چلا گیا۔

شام کو چھ بجے باقر ایک شمال میں میرے لیے کھانا لایا جو دو روٹیوں اور چھلی کے سالن پر مشتمل تھا۔ چھت بھوک لگی تھی، میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ وائزلیس سیٹ کے لیے ہمیں جو کرا ملا وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس میں بمشکل ایک میز دیکھی جاسکتی تھی۔ وہاں ایک چار پائی پہلے ہی پڑی تھی۔ میں نے کمرے کے اندر روشنی کے لیے بیٹری کی مدد سے ایک چھوٹا بلب لگا لیا۔ کمرے سے باہر درخت کی ایک شاخ پر بھی ایک بلب لگایا۔ نواز سے بنا پولیس کا مخصوص پلنگ منجائش نہ ہونے کی وجہ سے کمرے کے سامنے کھلی جگہ پر بچھا دیا۔ رات ہوتے ہی میں چار پائی پر لیٹ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا مگر نجانے کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں پچھلے ایک سال میں اپنی زندگی کے حیران کن اتار چڑھاؤ پر غور کرنے لگا۔

یہ محض ایک سال قبل جون ۱۹۸۷ء کی بات تھی کہ میں زندگی کی ناہمواریاں پانے کی جستجو میں تعلیم اوروہری

چھوڑ کر محکمہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ پولیس کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ میری اہلیت اور تعلیم صرف اسی محکمہ میں کھپ سکتی تھی۔ ٹیلی کمیونیکیشن پولیس کو اسی لیے چنا کہ بطور وائزلیس آپریٹر معززانہ طریقے سے ملازمت کر سکوں۔ لیکن تربیت سے فارغ ہوتے ہی پتا چلا، یہ محکمہ تو پورے سندھ پر محیط ہے اور کسی بھی ضلع میں تقرری ہو سکتی ہے۔ لہذا مجھے ایک ہفتہ کے اندر اندر خیر پور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔

گھر والوں سے دور ہونے کے احساس اور کچھ اندرون سندھ کی امن و امان کی مجزبی صورت حال خصوصاً لسانی جنگزدوں کے پس منظر میں یہ تعیناتی مجھے اچھی نہیں لگی۔ وہ سارا ہفتہ میں پریشان رہا لیکن سوائے تعمیل کے کوئی راستہ نہ تھا۔

خیر پور میرس ایک چھوٹا مگر خوبصورت شہر ہے۔ انگریز دور میں ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ دو سے تین گھنٹوں میں آپ پیدل ہی پورے شہر کی سیر کر سکتے ہیں۔ مجھے خیر پور کا چھوٹا مگر انتہائی صاف ستھرا اسٹیشن بہت پسند آیا۔ وہاں کی خاص جگہوں میں اس کا بازار بیچ گلا، ریڈیو اسٹیشن، خیر پور یونیورسٹی اور کچھوروں کی منڈی قابل ذکر ہیں۔ چھتے یہاں آئے چھ ماہ گزرے تھے اور وقت اچھا ہی گزر رہا تھا کہ مون سون کا موسم آ پہنچا۔ چنانچہ مجھے چار ماہ کے لیے گھوٹکی بند پر ناراضی فلڈ اسٹیشن قائم کرنے بھیج دیا گیا۔ اب میں اس بند پر موجود تھا۔ ”داوری قسمت، میں تو خیر پور آئے کو تیار نہ تھا چہ جائیکہ یہ جنگل۔“ میں مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔ انہی خیالوں میں اُنکھ کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح سات بجے رب نواز نے مجھے اٹھایا۔ وہ وائزلیس سیٹ چلا کام میں مصروف ہو گیا۔ میں کمرے

سے باہر نکلا اور نہر کے قریب لگے برے پر منہ ہاتھ دھویا۔ خرنورس کے جولان کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ اس جگہ زندگی رواں دواں تھی۔ قریب کے دیہات سے کسان اپنی نیل گاڑیوں میں سبزیاں اور دیگر اجناس لیے بند پر پہنچ رہے تھے۔ بیوپاری یہ ایشیا خرید کر گھوٹکی اور دیگر چھوٹے قصبہات سے آئے دکانداروں کو فروخت کریں گے۔ یہاں یہ سارا کاروبار علی الصبح شروع ہو کر نو بجے ختم ہو جاتا۔ پھر تمام لوگ اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس کے بعد بند پر سارا دن آس پاس کے گھوٹکیوں سے آکا دکانوں کی آمد ہی رہتی۔ کوئی اپنے زرعی آلات کی مرمت کرانے آتا اور کوئی پر چون کا سودا سلف خریدنے۔

دو نہروں کے پار ایک چھوٹی سی مسجد واقع تھی۔ وہاں ظہیر وغرب کے اوقات میں تو تھوڑا بہت جھوم ہوتا مگر عشا اور فجر میں چند لوگ ہی نماز ادا کرتے۔ وہ بند کے نزدیک گاؤں میں رہتے۔ یا پھر بند پر کسی نہ کسی تعلق سے ڈیوٹی پر مامور تھے۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنے والوں میں مسجد کے امام جو موزن بھی تھے، ایری کیشن کا ملازم باقر، خرنورس کے جوان اور اب میں بھی شامل تھا۔

خرنورس پیر صاحب پگارا کے مریدوں پر مشتمل ایک غیر فوجی مگر سلسلہ رستہ ہے۔ ملیشیا شلوار قمیض میں ملیوں ان کے بھیس جولان جنگلوں میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن میں فوج و پولیس کی مدد کے لیے بند پر تعینات تھے۔ چونکہ یہ لوگ مقامی تھے اور اپنے جنگلات سے واقف، اس لیے فوج آپریشن میں ان کی مدد حاصل کرتی تھی۔ میرے آنے سے کچھ عرصہ قبل تک تو فوج کی پوری ایک کپنی اس بند پر باقاعدہ تعینات تھی۔ مگر حالات بہتر ہونے پر فوج بند کا چارج خرنورس کے حوالے کر کے چلی

گئی۔ تاہم کم و بیش روزانہ ہی فوج کا ایک میجر اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ ۲۳ گھنٹوں کی رپورٹ لینے وہاں آتا۔ آج کل میجر اشفاق یہ ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ پولیس نیلی کیونیکیشن محکمہ سندھ پولیس ہی کا ایک ذیلی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس کا کام دائرہ پولیس پر پولیس کے رابطے بحال رکھنا ہے۔ ہر سال بارشوں کے موسم میں جب دریاؤں میں پانی کی آمد اور اخراج بڑھ جائے تو یہ محکمہ ایمری کیشن ڈیپارٹمنٹ کی مدد کے لیے سندھ کے ہر بند اور بیراج پر عارضی فلڈ اسٹیشن قائم کرتا ہے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ دریاؤں میں پانی کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھی جائے جس سے سیلاب کے خطرات کم کرنے اور آبی ذخائر کی حفاظت میں مدد ملتی ہے۔ گھنٹی بند پر ہمارا کام دریائے سندھ پر بالائی بیراجوں یعنی گند اور تونسہ وغیرہ پر پانی کی آمد و اخراج کی ریڈنگ لے کر سکھر، کوٹری اور کراچی نوٹ کرانا تھا۔ یہ ریڈنگ ہم دن میں صرف دو بار لیا کرتے۔ یعنی صبح آٹھ بجے اور پھر شام کو چار بجے۔ رب نواز صبح سویرے بند پر آتا اور شام چار بجے کام سے فارغ ہو کر شہر واپس چلا جاتا۔

میں کچھ ہی دنوں میں اس علاقے کی تمام سرگرمیوں سے واقف ہو گیا۔ ان پانچوں نہروں کے درمیان صبح سویرے متحرک ہو جانے والی زندگی سر شام ہی ختم جاتی۔ چاند راتوں کے عاواہ مغرب کے فوراً بعد ہر سو گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ دن میں چھاؤں کی راحت دینے والے بڑے بڑے درخت سیاہ بیواؤں میں بدل جاتے۔ البتہ چاندنی راتوں میں دور دور تک زمینوں میں کھڑی لہلاہٹی فصلیں بڑا خوبصورت منظر پیش کرتیں۔ اگر آسمان بادلوں سے صاف ہو تو تارے غیر معمولی چمکتے دکھائی دیتے۔ میں نے کبھی کراچی میں اتنے تارے نہیں دیکھے

تھے۔ دیکھا لگتا کہ اس جنگل میں تاروں کی تعداد شہر سے زیادہ ہے۔

خز نورس کے بیشتر جوان بچکے کی چھت پر چار پائیاں بچھا کر سو جاتے، کچھ ہال میں اور کچھ سامنے کھلی جگہ پر۔ جبکہ چار جوان شام چھ سے رات بارہ اور چار رات بارہ سے صبح چھ تک اپنی رانگلیں لیے بند کے ٹیل پر ڈیوٹی انجام دیتے۔ یہ سلسلہ دن میں بھی جاری رہتا۔ یہ بند گھنٹی شہر کو دریائے سندھ والے کچے علاقے سے جوڑتا تھا۔

دن میں دو بار دو جوان بچکے کے سامنے مٹی کے تندور پر تمام لوگوں کے لیے کھانا پکاتے۔ اس کے لیے ہر ایک اپنی تنخواہ سے ماہانہ نوے روپے ادا کرتا۔ نختے میں دو بار گوشت کا سالن پکتا۔ صبح صرف چائے کی ایک پیالی ماتی۔ دوپہر کا کھانا گیارد بچے کھا لیا جاتا جبکہ شام کا کھانا پانچ بجے۔ صوبیدار آچر کے کہنے پر میں بھی نوے روپے کے اس میں میں شامل ہو گیا۔ یوں کھانا پکانے کے جینجھٹ سے بچ نکلا۔

پانچوں نہروں کے کناروں پر شیشم، نیم، برگد اور جامن کے درخت قطار در قطار دور تک چلے گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے تجسس ہوتا اور دل چاہتا کہ ان نہروں کے کنارے کنارے چلتا ان کے آخری سروں تک جا پہنچوں۔ لیکن میں کبھی چند فرلانگ سے آگے نہیں گیا۔

یہ جون کے گرم دن تھے۔ جامن کے درختوں پر بڑے آکر جھڑ چکا تھا۔ ننھے ننھے پھل دکھائی دینے لگے تھے۔ مگر ابھی ان کے پکنے میں شاید دو تین نختے باقی تھے۔ ایک درخت تو بالکل ہمارے کمرے کے سامنے بیس فٹ کے فاصلے پر اپنی طویل شاخیں پھیلائے لاقعدا پھلوں سے لدا کھڑا تھا۔ اسی درخت کی شاخ پر میں

نے باب لکھا تھا۔

خزوں سے میری قرابت قائم ہو چکی تھی۔ ان میں سے کچھ میرے دوست بھی بن گئے جیسے مشعل اور نور محمد۔ رات کو نماز کے بعد وہ درخت کی شاخ میں جھولتے باب کی روشنی میں اکثر میرے ساتھ پلنگ پر آ بیٹھتے۔ شاہ عبداللطیف ہشتائی کا کلام بلند آواز میں سناتے۔ نور محمد کی آواز بہت اچھی تھی۔

سائیں سدا میں کرئیں سندھ متھی سکار
دوست مٹھا دلدار عالم سب آباد کرئیں
(اے اللہ سائیں! آپ سندھ و ہرتی کو سدا آباد کر
دیں..... اے میرے پیارے دوست! میرے دلدار اللہ،
سارے عالم کو بھی آباد کر دیں)

کس قدر خوبصورت کلام ہے! پہلے اپنی زمین اور پھر تمام دنیا کے لیے دعا۔ یہی وہ محبت کا درس تھا جو شاہ صاحب کے کلام کا خاصا ہے جس نے سندھ کی سر زمین کو محبتوں کا گلزار بنا دیا۔ رفتہ رفتہ کھل مل جانے پر میں بھی ان کے ساتھ گانے کی مشق میں شامل ہو گیا۔ میں اکثر مہدی حسن کی گائی غزلیں یا پھر احمد رشیدی کے طرہ پہ نغمے سناتا۔ مشعل بہت ہی اچھا انسان تھا۔ باوجود اس کے کہ ہر شخص کو اپنی زبان سے محبت ہوتی ہے، وہ ہار ہا میرے ساتھ بیٹھے ہوئے کہا کرتا: "اوا، اوردو بڑی پیٹھی زبان ہے۔"

"مشعل سندھی بھی بہت اچھی زبان ہے۔" میں کہتا۔

"اوا! چنی بات یہ کہ اردو میں درائی ہے۔ سندھی میں گانے والے بس ایک ہی طرح سے گاتے ہیں۔" اس کی متوازن اور غیر متعصبانہ گفتگو سن کر کراچی میں سندھ کے حوالے سے سنے ہوئے تمام اعضاء اور

لوگ کیا کہیں گے؟

نوبہدگی کی غیر ضروری اور فضول رسوں سے لوگ تنگ ہیں۔ یہ رسمیں امراء تو اس لیے اپناتے ہیں کہ وہ بگڑ بھی سکتے ہیں لیکن غریب لوگ بھی نبھانا اپنا فرض سمجھتے اور یہی سوچتے ہیں کہ سب کر رہے ہیں اور اگر ہم نے نہ کیوں تو "لوگ کیا کہیں گے؟"

نوبہدگی والے گھر میں جہاں صدے کی وجہ سے چولہا تک نہیں چلایا جاتا تھا اور تین دن سوگ رہتا تھا، اب یہ حال ہے کہ وہاں اس دن دیکھیں پکائی جا رہی ہیں۔ قلم خوانی کے نام پر اس گھر میں تازہ پھولوں کی بے قدری ہوتی ہے۔ سات پھل پورے کیے جاتے ہیں۔ ٹینٹ نکلتے ہیں۔ دریاں بچھتی ہیں۔ مسجد میں انعام ہوتا ہے اور گھر پر بھی ہندو بست کیا جاتا ہے۔ دور نزدیک سے ڈھیروں مہمان آتے اور پیٹ بھر کر پھل اور کھانا کھاتے ہیں۔

چالیسویں تک ہزاروں روپے کا پھل لوگ کھا جاتے ہیں لیکن عموماً یہ ہوتا ہے مرنے والے کے لیے بیماری کے دنوں میں تو دھا کلا سیب اس لیے نہ آسکے کہ مہنگائی بہت ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور تقیین رکھتے ہیں کہ موت کا ایک دن تقیین ہے۔ لیکن مرنے والے کی رسوم ادا کرنے پر جتنا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس سے بھی بہت کم اسے زندگی میں دے دیا جائے تو یقیناً اس کی حالت بہتر ہو جائے۔

(سرمد، اسن کمال، یوٹوٹی، اسلام آباد)

نفرتوں کے تھے غار لگنے لگتے۔ میں سوچتا کہ سندھ کا عام سندھی تو اب بھی مقصود اور مہمان نواز ہے۔ اس نے سندھ میں آنے والے ہر مظلوم کو پناہ دی، غلطی سے لگایا، پیار دیا اور ان کی داد دی کی۔

لیکن قصور کا ایک دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ کچھ لوگوں نے ایک ماہ گزرنے کے باوجود کبھی مجھ سے علیک سلیک کیا تھا اور نہ میرے سلام کا بہتر جواب دیا۔ مجھے

واضح طور پر محسوس ہوتا کہ وہ دانستہ مجھ سے دوری برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی جب میں شام کو باہر پنگ پر لیٹا ہوتا تو دور سے مجھے ان کی نظریں چھینتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ خاص طور پر شمس جو اکثر چھوٹی نمبر کے پل کی منڈیر پر بیٹھا اپنی گھنٹی ڈال رہی اور ان میں گم ہوتی موچیوں میں گھنٹی کرتے مجھے گھورتا رہتا۔ نہانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ان لوگوں کو میری یہاں موجودگی اچھی نہیں لگتی۔ میں ان لوگوں کے اس ناروا رویے کی وجوہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو مجھے اس کے تانے بانے پاکستان اور خصوصاً سندھ کی گزشتہ دس سالہ سیاست سے جڑے نظر آتے۔

اپریل ۱۹۷۹ء میں ہونے والی ایوان انصاف کی ناانصافی نے اس سندھ کو بدگمان کر دیا۔ مگر وہ درو تو سا بچھا تھا، اسے محض سندھ کا دکھ کس نے بنا دیا؟ یقیناً یہ سازش تھی جبر سے بننے والے امیر وقت کی جس نے اقتدار کے لمحات طویل دینے کے لیے گورنر آغاؤں کا ’’تقسیم کر دھکومت کرو۔‘‘ والا پرانا آزمودہ نسخہ آزمایا۔ ہماری عاقبت نااندیشی نے اس کی افادیت کو نصف صدی بعد بھی کم نہیں ہونے دیا۔

یہ اسی سازش کا نتیجہ تھا کہ سندھ میں اردو اور سندھی بولنے والوں میں نفرتیں بڑھیں۔ ۱۹۸۰ء کے پورے عشرے میں دونوں قومیتوں کے درمیان خونریز نسلکداری دیکھنے میں آئے۔ بڑی تعداد میں اردو بولنے والوں نے سندھ کے دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کی۔ جبکہ کراچی اور دیگر شہروں میں آباد سندھی محفوظ مقامات پر منتقل ہونے لگے۔

کراچی میں لسانی بنیاد پر تفریق کی ابتدا غاصب اول کے دور میں ہوئی جب وہاں پشتونوں اور مہاجرین کا

تصادم کرایا گیا۔ غاصب سوم کے دور میں یہ عمل تیز ہو کر سرطان کی طرح دوسری قومیتوں تک پھیل گیا۔ یہاں تک کہ آج کراچی میں زبانوں کی بنیاد پر قائم حد بندیوں کے اثرات دو ملکوں کے درمیان سرحدوں کی طرح محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پاکستانی قوم کو کس طرح تقسیم کیا گیا، اس کی عملی صورت کراچی میں نمایاں ہے۔

لسانی سیاست میں ہم زبانوں کو عدم تعلق کا شکار کرنا مجبوری ہے۔ خصوصاً کراچی میں علاقائی طور پر راہنمائی کے خواہش مند لوگوں نے حالات کی ستم ظریفی کو اپنے لیے موقع غنیمت جانا۔ وہ علاقائی مسائل کو اپنے منشوروں میں جگہ دے کر انتخابی نعروں میں بدلنے لگے۔ ان لوگوں کو اپنی پہچان بنانے کے لیے ایسے مسائل اور تنازعات کی ضرورت تھی اور جاہر نکرانوں کو متضاد اور نام نہاد قوم پرست لیڈروں کی۔

رب نواز کا تعلق پنجاب سے تھا مگر وہ گزشتہ بیس برسوں سے گھونگی میں مقیم تھا۔ بہترین سندھی بولتا اور تقریباً روزانہ ہی شہر سے ایک سندھی اخبار ساتھ لے آتا جسے میں بھی پڑھ لیا کرتا۔ ایک اخبار صوبیدار آچر اور ان کے جوانوں کے لیے بھی آتا۔ اس بنا پر یہ اخبار ہی سندھ اور کراچی کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ تھا۔ اخبار کا اردکان زیادہ تر اندرون سندھ کی سیاسی و سماجی خبروں پر تھا تاہم کراچی میں جاری نسلکداری کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا۔ اکثر کراچی میں سندھی بولنے والوں پر حملوں کی خبریں شائع ہوتیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ دیگر زبانیں بولنے والوں سے متعلق خبروں کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی حالانکہ پنجابی، پشتو اور خود اردو بولنے والوں کے معاملات یقینی طور پر سندھی بولنے والوں ہی کی طرح سنگین تھے۔

مجھے شمس اور اس کے دیگر ساتھیوں کی اپنی جانب

چھیتی لگا ہوں کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ لوگ جب اخبار میں نسلکداری کی خبریں پڑھتے، تو میرے لیے ان کی نظروں میں نفرت مزید بڑھ جاتی اور اس کی واہدہ وجہ تھی میری زبان یعنی اردو۔ وہ زبان جسے بیٹھے لہجوں کی زبان کہا جاتا تھا، جو مختلف زبانیں بولنے والوں کو جوڑنے والی زبان کہلاتی تھی، جو صدیوں سے لوگوں کے درمیان رابطوں اور تبادلہ خیال کا ذریعہ بنی ہوئی تھی، کراچی سے پانچ سو کلومیٹر دور دیہات میں میرے لیے وجہ نفرت بن گئی۔

ان حالات میں کبھی کبھی میں انہماں خوف میں گرفتار ہو جاتا۔ ایک دو بار میں نے اس خوف کا ذکر رب نواز سے بھی کیا مگر وہ کہتا ’’یہ تمہارا وہم ہے۔ ہم سرکاری ملازم ہیں۔ یہ لوگ بھی سرکاری ڈیوٹی پر ہیں۔‘‘ میں اس بات پر خاموش ہو جاتا۔



ماہ جولائی اپنا نصف اول مکمل کر چکا تھا۔ جامن کے درختوں پر ننھے ننھے پھل روزانہ بڑی تعداد میں پک رہے تھے۔ صبح کمرے کے سامنے کچی زمین پر جامنی پھل ہر طرف بکھرے پڑے ہوتے۔ میں اکثر نماز فجر کے فوراً بعد کھجیوں کے جاگنے سے پہلے صاف پھل اٹھا لیتا۔ پھر برے کے صاف اور ٹھنڈے پانی سے دھو کر مزے سے کھاتا۔ ٹی بات تھی، ایسے بیٹھے جامن میں نے کراچی میں کبھی نہ کھائے تھے۔ نرم اتنے کے منہ میں رکھتے ہی کٹھن کی طرح کھل جاتے، ذائقہ بھی لا جواب اور سب سے بڑی بات بالکل مفت۔

باقر قریبی گاؤں میں رہتا تھا۔ روزانہ نماز فجر کے وقت بند پر آتا۔ نماز پڑھ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اس کا کام بند کے آئین دروازوں کی دیکھ بھال اور

مستحضرہ ٹیڈزول کے مطابق مختلف نمبروں میں پانی کے بیاد کو کنٹرول کرنا تھا۔ دو پہر کو وہ اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ پھر شام کو پانچ بجے دوبارہ بند پر آتا اور پھر نماز مغرب کے بعد لوٹ جاتا۔

باقر سندھ کے معصوم اور مہمان نواز روایتی کردار کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ جب سے میں یہاں آیا تھا، باوجود غربت کے تقریباً روزانہ دو سیرے لیے گھر سے کچھ نہ کچھ کھانے کو لے آتا۔ کبھی اپنی تھوڑی سی زرعی زمین پر اگنے والی تازہ سبزیاں، کبھی ساگ کے ساتھ باجرے یا چاول کے آٹے کی بنی روٹیاں۔ وہ ایک سیدھا سادہ بے ضرر انسان تھا۔

یہ جولائی کا ایک گرم دن تھا، رب نواز معمول کے مطابق ڈیوٹی پر پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں روزانہ کی طرح اخبار تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈائریس سیٹ کام نہیں کر رہا۔ عموماً وہ پہلے کچھ دیر اخبار پڑھتا تھا مگر ڈائریس سیٹ کی خرابی کا سن کر سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ کافی دیر کوشش کے باوجود جب وہ خرابی سمجھنے میں ناکام رہا تو ہیڈ کوارٹر اطلاع دینے کا کہہ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر سارا دن واپس نہ آیا۔

انگلی صبح میں فجر کے بعد معمول کی طرح زمین سے جامن اکٹھے کر رہا تھا کہ باقر نے دور سے مجھے آواز دی: ’’اوا! زمین سے مت اٹھا، میں تجھے درخت سے توڑ دیتا ہوں۔‘‘

’’نہیں باقر، یہ بالکل صاف ہیں۔ میں بس تھوڑے ہی کھاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا۔

مگر وہ آیا اور مجھٹ پٹ درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تازہ تازہ ڈھیر جامن اپنے دامن میں بھر نیچے اتر آیا۔ برے پر جا کر مٹی کے ایک کونڈے میں وہ جامن

دھوئے اور مجھے لاکر دیے اور کہا: ”یہ کھاؤ ادا نیچے تو ان کو مٹی لگ جاتی ہے اور تم ہمارے مہمان ہو۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، وہ ہنستا ہوا بند کی طرف چلا گیا۔ میں نے گونڈا پنگ پر رکھا اور آرام سے بیٹھ کر جامن کھانے لگا۔ یقیناً یہ باقر کا خلاص تھا کہ آج جامن روزانہ سے کہیں زیادہ مزیدار لگے۔ صبح کے چھ بجے تھے۔ نہروں کے درمیان زندگی متحرک ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شمس جو دیر سے نہر کے پل پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا، تیز تیز قدموں کے ساتھ میری جانب آ رہا ہے۔ وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ پہلی بار تھا کہ وہ میرے اتنا نزدیک آیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور جامن کھانے کا پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت غصہ تھا۔ اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے کہا: ”یہ جامن تم نے درخت سے کیوں توڑے؟“

”کیوں! کیا مطلب؟ ظاہر ہے کھانے کے لیے!“

میں نے نرمی سے کہا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ جامن توڑنے کی؟“ وہ غصے سے چلایا۔

”ارے بھائی اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ کیا یہ درخت تمہارا ہے؟“

میں اتنا سنا تھا کہ اس نے جامن سے بھرے گونڈے پر ہاتھ مار، سارے جامن زمین پر دور تک بکھر گئے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑا اور منہ سے گالیاں بکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے مجھے مارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں ہرگز اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنے دفاع میں غیر ارادی طور پر تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی

سے پکڑ لیے۔ وہ طاقتور تھا لیکن پولیس کی تربیت نے مجھے بھی مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ”تم کڑ یہ جامن نہیں کھا سکتے۔ اسی جبو سندھ جو آ۔“ (یہ جامن سندھ کے ہیں)

قریب موجود لوگ بھاگتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ نہر کے دوسری جانب سے بھی پوپاری، خریدار اور دکاندار بیچ بچاؤ کرانے دوڑ پڑے۔ لوگوں نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ صوبیدار آہر بھی وہاں آ گئے۔ انھوں نے مجھے سے پوچھا ”کیا ہوا، کیوں جھگڑ رہے تھے؟“

میں نے ان سے کہا، اسی سے پوچھ لیں۔ لوگوں نے شمس سے پوچھا، تو وہ یہی بات کہہ رہا تھا کہ اس نے درخت سے جامن توڑ کر کھائے ہیں۔ یہ جامن سندھ کے ہیں۔ یہ انھیں کیسے کھا سکتا ہے؟

لوگوں نے مجھے کمرے میں جانے کا کہا اور اسے لیے نہر کے دوسری طرف چلے گئے۔ میں دائر لیس روم میں بیٹھا سارے واقعہ پر حیرت سے غور کرنے لگا۔ دور سے مجھے لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں:

”اس نے شمس کا گریبان پکڑا، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”شرم کرو، وہ غریب بازو ہے، مہمان ہے۔“ یہ آواز مٹھل کی تھی۔

”یہ لوگ کراچی میں ہمارے بے گناہ اور غریب سندھی بھائیوں کو مار رہے ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟ یہ سندھ ہمارا ہے۔ کراچی بھی ہمارا ہے۔ یہ ہمارا سندھ اور کراچی ہم سے چھین رہے ہیں۔ اور یہ بھی ان میں سے ہے۔“

”اڑے شمس..... وہ اگر ان میں سے ہوتا تو اپنے

گھر سے اتنی دور تھوڑی سی تنخواہ پر ملازمت کرتے یہاں نہ آتا۔“ یہ دوسری ہمدرد آواز نور محمد کی تھی۔

”نور محمد اور مٹھل، تم دونوں چپ کر جاؤ، تم بزدل اور غدار ہو۔ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے سندھ ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔“

مجھے دیر تک بحث کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ لیکن شروع میں انہی چند آوازوں کے بعد پھر کوئی آواز میری حمایت اور حق میں سنائی نہ دی۔ میں بڑے غور سے مٹھل اور نور محمد کی آوازیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ وہاں سے چلے گئے یا پھر خاموش ہو گئے۔ رفت رفت شور کم ہوتا

لیکن وہ صبح سویرے بند پر چکر لگا کر جا چکے تھے۔ اب انھیں اگلے دن ہی بند پر آنا تھا۔ گویا میں کل صبح تک کسی کو بھی اس واقعہ سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔

نماز مغرب کے بعد تہر کی دوسری طرف سے ایک بار پھر شور سنائی دینے لگا۔ صوبیدار آج اور بہت سے دوسرے لوگ پھر اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ ایک بار پھر شمس کی تیز آواز میرے کانوں سے نکل آئی۔ وہ اب تک غصے میں تھا۔ اگرچہ میں زیادہ سندھی نہیں سمجھتا تھا لیکن جو کچھ میں سمجھ پایا، اس کے مطابق شمس اور کچھ لوگوں کے ارادے میرے لیے اچھے نہ تھے۔

ایک مہم سی امید تھی کہ صوبیدار آج تھوڑی دیر میں مجھے بلائیں گے۔ اگر وہ شمس کو سرزنش نہ بھی کریں، تو اتنا ضرور کریں گے کہ ہم دونوں کو گلے مار کر بات رفع دفع کرا دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ



پھلوئی میں واقع نہر

چلا گیا۔ اور پھر قسم کیا۔ میں دیر تک اپنے کمرے کے اندر بیٹھا رہا۔ کھانا لینے بھی باہر نہیں گیا۔ نہ ہی کوئی مجھے کھانا دیتے میرے پاس آیا۔ مجھے امید تھی کہ مٹھل ضرور میرے پاس آ کر مجھے حوصلہ دے گا مگر وہ نہیں آیا۔

میں اپنے ہیڈ کوارٹر سارے واقعہ کی اطلاع دینا چاہتا تھا مگر دائر لیس سیٹ اب تک خراب تھا۔ شام کے وقت صرف ایک بار میں پانی بھرنے برے گیا تو مجھے دور سے ساری نگاہیں اپنے وجود میں اتنی محسوس ہوئیں۔ آج مجھے یہاں کوئی اپنا ہمدرد نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے میجر اشفاق کو مطلع کرنا چاہیے

شور رات عشا کی نماز تک کم ہوتے ہوتے رک گیا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ شمس کے ساتھ چند لوگ اب بھی جمع تھے جو سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے ان کی باتیں سنائی نہیں دیں۔

میں بڑا مایوس ہوا۔ سوچنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد ایک غلط بات کو محض تعصب کے سبب غلط نہ کہے؟ کسی بھی قومیت میں سارے لوگ کبھی خراب نہیں ہوتے بلکہ بڑے لوگوں کی تعداد ہمیشہ اچھوں سے کم ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چند بڑے



نیاسال مبارک

نیاسال مبارک ہو



اپنے ساتھ
بادلوں کی برسات
اور دعاؤں کی سوغات
اور
آنسوؤں کے بیش بہا خزانے لٹاؤ
تمھاری منظر آگئیں
ہمارے لیے خوشیوں کی کلیاں ڈھونڈ رہی ہیں
اور کہتی ہیں
اے دل کے مکین
نیاسال مبارک ہو

میری دعا ہے

نیا برس ہو تمھارے جیسا
نہ دل کسی کا دکھانے والا
تختوں کے رفیقوں کے
چراغ ہر سو جانے والا
جہاں میں کوئی نہیں ہے جن کا
انہیں گلے سے لگانے والا
اجاز آنکھوں کو زندگی کے
دوبارہ سپنے دکھانے والا
اواس لوگوں کے آنکھوں میں
خوشی کی بلیں لگانے والا
لفظ محبت، لفظ محبت!
لفظ محبت سکھانے والا



حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ
آز نماز کی طرف
حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ
آز فلاح کی طرف

اذان کی آواز نے مجھے ہر خوف سے بے نیاز کر دیا۔ کمرے سے باہر نکلا اور شہر کے پل سے گزر کر مسجد پہنچا۔ مسجد میں معمول کی طرح نماز کے بعد سب نے ایک دوسرے سے سندھ کے مخصوص انداز میں انگلیں ہوتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کسی کے چہرے پر کل کی بات کا کوئی تاثر نہ تھا۔ کسی نے مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ میں نے بھی گریز کیا۔ مسجد سے باہر نکلا تو پوچھ چکی تھی۔ سرچشمہ نور رونمائی سے قبل ہی ہر سو رنگ بکھیر چکا تھا۔ دور دور تک پھیلے کھیتوں کا منظر بڑا دلکش تھا۔ نہروں کے پانی سے نکرا کر آتی صبح کی شہنشاہی ہوا فرمت بھری تھی۔

میں آہستہ آہستہ چھوٹے پل سے گزر کر اپنے کمرے کے دروازے تک آیا۔ قریب پہنچ کر میری نظر پلنگ پر پڑی جس پر ایک نئی اجڑک اور نزدیک ہی مٹی کا کونڈا صاف ستھرا کپڑے سے ڈھکا رکھا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی میری جانب متوجہ نہ تھا۔

میں آہستگی سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور کونڈے پر ڈھکے کپڑے کو ہٹایا۔ پلے اور دھلے ہوئے کالے کالے جامنوں سے کونڈا اوپر تک بھرا تھا۔ میں نے حیرت سے ایک بار پھر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بند پر موجود ہر شخص مسکرا کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ نہر کا پل پار کر کے ٹمس میری طرف آ رہا تھا مگر آہستہ آہستہ..... اور اس کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی!

اپنی چرب زبانی سے اکثریت پر حاوی ہو کر پوری قومیت کے عکاس بن جائیں۔ مگر یہاں سب لوگ شمس کو غلاما کہنے سے کیوں گریزاں تھے؟ محض دو آوازیں تھیں جنہوں نے سچ کہا مگر وہ بھی نہ جانے کہاں گم ہو گئیں؟

جوں جوں رات گہری ہوئی میرا دل گھبرانے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے رات میں کوئی نقصان پہنچایا، تو یہ بڑی آسانی سے اسے ڈاکوؤں کی کارروائی قرار دیں گے۔ میرے ٹکے اور گھر والوں کو کبھی اصل بات پتا نہیں چل سکے گی۔

میں بزدل نہ تھا مگر مجھے یہ دکھ ضرور ہوا کہ اگر ان لوگوں نے ایسا کیا، تو یہ مجھے ایسے جرم کی سزا دیں گے جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔ کم عمر ہونے اور معمولی سیاسی شعور رکھنے کے باوجود میں نے کراچی میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان نفرت اور لڑائی کو کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان پر یہاں بسنے والی تمام قومیتوں کا حق برابر ہے۔ بلکہ ان قومیتوں کے درمیان درحقیقت کوئی کلیدی اختلاف بھی نہیں۔ یہ تو سیاستدان اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو زبان اور علاقوں کے نام پر لڑاتے ہیں۔

تمام تر حوصلہ جمع کرنے کے باوجود میں پریشان تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ اندھیرے میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ بہر حال وہ ساری رات میں نے کانٹوں پر گزار دی۔ ہر آہست پر دل دھڑکنے لگا۔ میں بڑا مایوس تھا۔ اسی کیفیت میں نہ جانے رات کے کس بہر میری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی!

مجید امجد جب تباہی ہوئی

دلچسپ اور نایاب معلومات سے بھرپور
اُردو کے طرح دار شاعر کا اچھوتا خاکہ

بشیر اعجاز چودھری

مجید امجد مرحوم سے میری طویل دوستی رہی۔ روزنامہ نوائے وقت میں ملازمت ملی، تو ٹیکے ساہیوال چھوڑ کر تھکن ہونا پڑا جہاں میں نے ۳۵ برس گزارے ہیں۔ اب تین برس سے وہاں اپنے پرانے آشیانے (ساہیوال) میں مقیم ہوں۔

میاں مجید امجد جہاں معروف و باکمال شاعر تھے، وہیں وہ نکلے خوراک کے ایک دیانت دار اور درویش صفت انسان بھی رہے۔ یہی نہیں وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں پر بھی مہربان انسان تھے۔ دفتر میں ان کے کئی ساتھی بعد میں کروڑ پتی بن گئے، لیکن انہوں نے کبھی سرکاری گندم کا بلا قیمت ایک دانہ تک اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیا۔

میاں مجید امجد جھنگ کے ایک متوسط آرائیں برادری کے سپوت تھے۔ ان کے والد نے مجید امجد کی



والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کے دو سونیلے بھائی بھی تھے۔ بعد ازاں جھنگ کی ایک معلمہ سے آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ مرحوم قریباً ساری عمر ملٹنمری (اب ساہیوال) میں رہائش پذیر رہے۔ جبکہ ان کی بیگم اپنی بیٹی سمیت جھنگ ہی میں رہی۔

مجید امجد ہر عید کا دن ساہیوال میں گزارتے۔ عید کے دوسرے دن وہ اپنی بیگم اور اکلوتی بیٹی کے پاس جھنگ چلے جاتے۔ ایک یا دو دن وہ کر واپس ساہیوال آتے۔ بیگم اور بیٹی نے آپ کی زندگی میں ایک بار بھی ساہیوال آنا پسند نہ کیا۔ جب مجید امجد کا انتقال (۱۹۷۳ء) میں ہوا، تو ان کی میت بذریعہ ٹرک جھنگ بھیج دی گئی۔ وہ مقامی قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کی تربیت پرائمری کا ایک معروف شعر تحریر ہے۔

تیری معاف وہ ہر اک خطا کرے
تجھے ایسے ہی رب عطا کرے

☆☆

نیا سال، نئی امید

رہنمائی ڈور کی طرح

ہاتھ سے پھسلتا ہوا

یہ سال بھی جا رہا ہے

گزرتے اس سال سے

حساب کچھ لینا ہے

ڈٹم جو دیے ہیں اس نے

ان کا مرہم پوچھنا ہے

اور پوچھنا ہے.....!

جو کھو دیا، اسے پائیں کہاں

یا وہاں کو ساری، دفنائیں کہاں

آگہی اپنی سلاخیں کہاں

پایوں کر لیں

روٹھا پچھلا سال بھلا کر

آنے والے سال سے

دوستی کر لیں

یہ سال بھی آخریت گیا

کوئی بار کیا کوئی بیت گیا

تجھے سال بھی آخر بیت گیا

کبھی پیٹے پیے آنگھوں میں

کبھی بیت مجھے پل باتوں میں

کچھ تلخ سے لکھتے بھی تھے

کچھ بے رخی، کچھ بے چینی

کچھ سن میں کسکی ویرانی

کچھ لئے تھے یادگار بیت

کچھ لہجوں کو برباد کیا

پر اب کے برس اسے دوست میرے!

مجھے رب سے دنا یہ مانگے دو

کوئی پل نہ تیرا اداس گزارے

کوئی روگ نہ تجھے اس گزارے

تو پھولوں کی طرح کھلا کرے

کوئی شخص نہ تجھ سے گلا کرے

تو خوش رہے، آہاں رہے

تو جو چاہے وہ مل جائے

کئی عمر بہاروں کے سوگ ہیں امجد
میری لہجہ پہ کھلیں جاوےاں گلاب کے پھول
ساہیوال میں آپ کی جائداد فرید ناؤن میں ایک
ڈی طرفہ کے کوارٹر اور ایک پرانا ریپلہ ہاسٹل پر مشتمل
تھی۔ یہ سائیکل انھوں نے کئی برس پہلے اس وقت خریدی
جب محکمہ خوراک کی دسالت سے ملازمین کو پرمٹ پر
ایک سو روپے کے عوض ملتی تھی۔ یہ شروع سے لے کر آخر
تک بغیر کیڑیوں میں امجد کے ہم رکاب رہی۔ آپ
جب محکمہ خوراک کے انسپکٹر بن کر ساہیوال آئے، تو
پاکستان عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس دور میں محکمہ سول
سپلائز کھلتا تھا۔ شہریوں کو چینی و آٹا یا گندم حاصل کرنے
کے لیے وہیں سے راشن کارڈ بنوانے پڑتے۔ یہی محکمہ
لوگوں کو راشن بھی فراہم کرتا۔

اس دور میں ساہیوال کی آبادی کم دہائیوں کے لاکھ
افسوں سے بھی کم تھی۔ زیادہ تر لوگ ہندو یا سکھ تھے۔
اس طرح اکثر دکانیں غیر مسلموں ہی کی تھیں۔ صرف
چند دکانیں مسلمانوں کی ہوا کرتیں۔ مسلمان
دکانداروں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ محکمہ سول سپلائز
میں ایک مسلمان بطور انسپکٹر آیا ہے، تو انھوں نے مہیاں
مجید امجد کا شاندار استقبال کیا۔ ان کے اعزاز میں
عصرانہ بھی دیا گیا۔

جب پاکستان بنا، غیر مسلم اپنے گھر اور دکانیں چھوڑ
کر ہجرت چلے گئے۔ تب ساہیوال کے پہلے ڈپٹی کمشنر،
راجا حسن اختر نے مجید امجد کو بطور عارضی انسپکٹر بمسٹریٹ
قلہ منڈی کی متروکہ دکانیں مہاجر مسلمانوں میں الاٹ
کرنے کے اختیارات تفویض کیے۔ مجید امجد نے دکانوں
کی الاٹ منٹ کے دور ان نہایت لایمانداری سے اپنے
فرائض انجام دیے۔ وہ اسی دور میں نیک نام اور اعلیٰ افسر

قرار پائے۔

محکمہ خوراک ساہیوال کے دفتر کا ایک چہرہ امجد
امجد کے ساتھ ان کے گھر میں بلا کرایہ برسوں تک رہا۔ وہ
اس چہرہ کے خوردنوش کا خرچہ خود برداشت کرتے
رہے۔ مجید امجد عموماً دوپہر کے وقت کیفے ڈی روز آ
جاتے۔ وہاں ایک روٹی یا ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور دو
شامی کباب خرید کر تناول فرماتے۔ یوں وہ صرف تین
روپے میں ظہرانہ کر لیا کرتے۔ شام کے وقت اسٹیڈیم
ہوٹل میں اپنی مخصوص محفل سجایا کرتے۔ رات کا کھانا بھی
وہیں کھاتے۔

آپ کی زندگی میں پریشانیوں اور تکالیف کا دور اس
وقت شروع ہوا جب ملازمت سے ریٹائر ہونا پڑا۔ معمولی
رقم پاس تھی۔ جھنگ میں آبائی جائداد پر چھوٹے سونیلے
بھائی قابض تھے۔ وہاں انھیں بہت کم اوگ جانتے
پہچانتے تھے۔ انھوں نے اپنی وراثتی جائداد کے حصول کی
خاطر جھنگ میں دعویٰ دائر کر رکھا تھا۔ بیرونی کے لیے
انھیں ہر تاریخ پیشی پر جھنگ جانا پڑتا۔ ادھر حصول پیشی
کی خاطر ساہیوال کے دفاتر میں چکر لگانے پڑتے۔

اسی بھانگم دور میں وہ سانس کے مرض میں مبتلا ہو
گئے۔ پس انداز کی گئی رقم قریباً ختم ہونے والی تھی۔ وہ پھر
چھوٹے موٹے ہوٹلوں سے کھانا کھانے لگے۔ ان کی
صحت پہلے ہی کمزور تھی، ناقص غذا کھانے سے وہ دن بدن
کمزور ہوتے چلے گئے۔ مجید امجد بلا کے خود دار تھے۔ کسی
دوست کو اپنی پریشانیوں کا ذکر تک کرنے کے لیے تیار نہ
ہوئے۔ آخر کار اس قدر نحیف ہو گئے کہ ہائیکل چلانا بھی
ممکن نہ رہا۔ بیماری کے اس عالم میں بھی دعویٰ کی بیرونی
کے لیے جھنگ جانا پڑا۔ وہیں اثنا آپ کی ٹیم کی چیلانی
قریباً ختم ہو گئی۔ یہ مرحوم کے لیے ایک اور صدمہ تھا۔

بینائی چلے جانے کے حادثے سے وہ خود بھی دوچار
ہو چکے تھے۔ وہ یوں کہ قیام پاکستان سے قبل جب وہ
ساہیوال میں ملازمت کر رہے تھے، انھیں شدید بخار ہوا۔
اس دور میں بخار کا موثر علاج کوئین مکسچر دوا ہوتی تھی۔
ڈاکٹر نے کوئین مکسچر کی ایک شیشی بھر کر انھیں دی اور بتایا
کہ یہ دو دنوں کا خوراکوں پر مشتمل تین دنوں کے لیے ہے۔
مجید امجد جب واپس گھر آئے، بخار شدت اختیار کر چکا
تھا۔ آپ نے نیم بے ہوشی کے عالم میں کوئین مکسچر کی
بھری ہوئی شیشی منہ کو لگائی۔ کڑوی ہونے کے باوجود
شیشی کو اسی وقت منہ سے علیحدہ کیا جب دوا ختم ہو گئی۔

کوئین کی تاثیر نہایت گرم تھی۔ جب صبح بیدار
ہوئے تو انھیں بخار تو نہ تھا لیکن آنکھوں کی ۸۰ فیصد بینائی
چاہکی تھی۔ خوش قسمتی سے بروقت علاج کرانے پر بینائی
کافی حد تک واپس آ گئی۔ لیکن آنکھوں سے موٹے شیشے
والی عینک کا رشتہ ہمیشہ کے لیے جڑ گیا۔

پاکستان معرض وجود میں آیا تو محکمہ سول سپلائز کا نام
نہدیل کر کے محکمہ خوراک رکھا گیا۔ تب مجید امجد اسٹنٹ
فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ برسوں تک اسی عہدے پر فائز
رہے۔ محکمہ خوراک کے اعلیٰ حکام نے انھیں متعدد بار
ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے کی پیش کش کی۔ ... شرط یہ
تھی کہ انھیں ساہیوال چھوڑنا ہو گا۔ مگر مجید امجد نے
ساہیوال سے کسی دوسرے ضلعی صدر مقام جانا پسند نہ کیا۔
وہ کہا کرتے تھے "ساہیوال جیسا شہر کوئی اور نہ ہو گا۔"

تب ساہیوال میں ہر طرف بڑے بڑے سرسبز
درخت اور صاف ستھری اور کشادہ سڑکیں تھیں۔ وہاں
کوئی کاغذ خانہ تھا نہ ہی چیتوں سے اٹھنے والا زہریلا
دھواں۔ شور شرابہ اور نہ ہی ٹریفک کا غل غپاڑو۔ دریا کی

مصرف و قیمت

عظیم انگریز مصنف ایچ جی ویلز جب سخت بیمار ہوا
اور زندگی کو کوئی امید باقی نہ رہی تو اس کے رشتے دار،
دوست اور لواحقین کی خواہش تھی کہ اس کے منہ سے
کچھ ایسے کلمات نکلیں جو بطور یادگار ہمیشہ یاد رکھے
جائیں۔ جب ان لوگوں نے اس عظیم ادیب کو بار بار
تنگ کیا، تو اس نے تلخ لہجہ میں جواب دیا: "آپ دیکھ
نہیں رہے کہ میں مرنے میں مسروف ہوں؟"

(مرسلہ: احمدق امین، واہ کینٹ)

طرح لمبی چوڑی نہر، اور ہادی دو آب بہتی جس کے
دائیں جانب عدالتیں، دفاتر، کالونیاں اور کھیلوں کے
میدان واقع ہیں۔ بائیں جانب غلہ منڈی، تجارتی
ادارے اور بسوں و دیکھوں کے اڈے ہیں۔

ایک بار آپ کا تبادلہ اذکارہ کر دیا گیا تھا۔ وہ
ساہیوال سے صحیح اذکارہ جاتے اور شام کو واپسی ہوتی۔
ایک سال بعد محکمہ کے حکام نے مجید امجد کی حالت پر رحم
کھاتے ان کا دوبارہ تبادلہ ساہیوال ہی کر دیا۔ مجید امجد کی
سیت ساہیوال میں سپرد خاک ہونی چاہیے تھی۔ جھنگ
میں تو انھیں کوئی جانا تک نہ تھا۔

مجید امجد نے عمر کے آخری حصے میں اپنا وراثتی اثاثہ
حاصل کرنے کے لیے مقدمہ دائر کیا تھا۔ شوکی قسمت، نہ
آبائی جائداد ملی اور نہ ہی پیشی ان کا مقدر بن سکی۔ انھوں
نے ساری زندگی ایک درویش، صابر، خوددار اور قناعت
پسند انسان کے روپ میں گزار دی۔ ان جیسا حصول پسند
انسان آج کے زمانے میں شاید ہی مل سکے۔

(مضمون نگار روزنامہ نوائے وقت، ملتان سے بطور سینئر
اسٹاف رپورٹر اور سب ایڈیٹر منسلک رہ چکے ہیں) ◆◆◆

آخری سانس

شقی القلب، ظالموں نے ایک لمحے
میں خوشی سے چمکتے سیکڑوں انسانوں
کی معصوم خواہشوں کا خون کر ڈالا

بشری رحمن

عصری ادب
انس
نانک عبدالرؤف اسٹاپ پر آیا، تو بس تیار
کھڑی تھی۔ جیسے انتظار ہی اس کا تھا وہ اپنی
نشست پر بیٹھا تو بس چل پڑی۔ یہ تو اچھا ہوا
کہ چند گھنٹے پہلے اس کا بھائی نکلتے آئے اور نشست
بک کرا گیا۔ آج سارے کام خود بخود ہی ٹھیک ہو رہے
تھے۔ دن بھی بڑا روشن تھا۔ اس کا اچالا عبدالرؤف کے
سانولے چہرے پر بھی دکھائی دیا جس میں سے سرخی
امنڈی آتی تھی۔
بس تھوڑی دور آگے گئی، تو پہاؤ



والی بیب میں پڑا فون پھرنے لگا۔ کون ہے؟ اس نے
جیب سے فون نکال کے نمبر دیکھا۔ نمبر کیا دیکھا اس کے
ارد گرد گلستان کھل اٹھا..... زیو کا نمبر تھا۔
وہ یوں جھجکتا شرماتا رہا جیسے بس کے سارے مسافر
اسے گمراہ رہے ہوں۔ ہمت کر کے فون دیا اور زیو کو کہا تو
ادھر سے فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

عبدالرؤف ہنس اور سوچا، شرمائی۔
لاکھی پر سوں جنت الہیہ کو اس کا نکاح چھوڑ بھی زاد
زہیدہ سے ہوا تھا۔ شاید گھر میں کچھڑی کافی دنوں سے
پک رہی تھی۔ مگر جب وہ میدان لکھی پر ایک نئے کے لیے
آیا، تو ماں نے اسے خوش خبری سنائی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا
رہا۔

”ارے روئی تو بولتا کیوں نہیں گھنٹے؟“
ماں نے پیار سے ڈانٹا تو بغیر سرائے بولا ”کیا
بولوں ماں؟“
”خوش ہے کہ نہیں؟“
وہ ہنسا بولا ”ماں تجھے تو پتا ہے، میری خوش تیری
خوشی میں ہے۔“
ماں نے بڑھ کر اس کا سراپے کلیجے سے لگا لیا اور کہا
”جیوند رہ..... اللہ تیروں بخت لاوے..... (جیتا رہے،
اللہ تجھے بخت لگائے)

وہ کہنا چاہتا تھا، ماں اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو جوان
ہمیں گھر نہیں ہے۔ لیکن لفظ اس کے گلے میں پھنس
گئے۔ زہیدہ کا سراپا اس کی نگاہوں میں لہرا گیا۔ ہمیشہ
جب وہ چہنیوں میں گھر آتا، وہ خوش خوشی اسے ملنے آتی۔
اس بار بس دور کھڑی اسے دیکھ دیکھ کر سکرانی رہی۔
”میں صدقے جاؤں، میرے پتر کے ہاتھ کیسے
کالے ہو گئے..... انگلیاں کھر روئی ہو گئی ہیں۔“

من کہ لکھاری
ملکہ سخن کے خطاب
سے مشہور بشری رحمن ۲۹
اگست ۱۹۵۳ء کو بہاول پور
میں پیدا ہوئیں۔ ایم
اے جزمزم کرنے کے
بعد کالم لکھنے شروع کیے

مگر ادب کے میدان میں بھی اپنا سکہ جمایا۔ آپ کے
افسانے معاشرتی مسائل بڑی خوبی سے اجاگر کرتے ہیں۔
زیر نظر افسانے میں اس انتہا پسندی کو نمایاں کیا گیا ہے جو
وطن عزیز میں بد قسمتی سے اپنی جڑیں پھیلا چکی۔

”ماں! وہاں تو پورا سال برنہاری ہوتی ہے جہاں
میری ڈیوٹی لگی ہے۔“
”ہائے میرے پتر کو سروی نہیں لگتی؟“
”وہ ماں! فوجی کو نہ سروی لگتی ہے نہ گری..... نہ
برف باری اس کا کچھ بگاڑتی ہے۔ وہ تو اس خیال ہی
سے ٹکرا رہتا ہے کہ اپنے وطن کا محافظ ہے۔“
”میں داری..... میں صدقے.....“ ماں اس کی
بائیں لینے لگی۔

”پتر! تو اب انکار نہ کرنا۔ میرے دل میں تیرا سہرا
دیکھنے کا بڑا ارمان ہے۔“
عبید سے اگلے دن گھر میں ڈھولک بجنے لگی۔ پہلی بار
عبدالرؤف کو احساس ہوا کہ ڈھولک کی تھاپ بھی دل میں
گدگدی کرتی ہے۔ آتے جاتے وہ لڑکیوں کے گائے
سہاگ کے گیت سنتا تو ان کے مطلوبہ سے خود ہی شرماتے
لگتا۔ رات گئے شوخ لڑکیاں چیمت پر پینھی لاپ کرتیں،
ماتے دی گلی گھن آ.....

وے سدا جیوں ماسے دی گلی گھن آ.....
 میں تاں عطر ملیساں میڈیاں تلیاں.....
 وے پتل نیریندا آ.....
 وے سدا جیوں ماسے دی گلی گھن آ.....

”تو جگ جگ جیے محبوب! میری ذولی مہرے ماموں کی گلی میں لے آنا۔ تو جب پھول بکھیرتا ہوا میرے چمپرکٹ پر آئے گا، میں تیرے پاؤں کے ٹکڑوں پر عطر ملوں گی..... تو جگ جگ جیے محبوب!“

اس کی جیب میں پڑا فون پھر پھرنے لگا..... نمبر دیکھا، زیوٹی۔ شاید دوبارہ اس نے حوصلہ کر لیا تھا۔ عبدالرؤف نے بھی جلدی سے مٹن دبا کر بلیو کبلا۔ ساتھ ہی بولا ”زیو بات کیوں نہیں کرتی۔ زیادہ دور جانے سے سنگٹل نہیں آئیں گے۔“

”نہستی ہوئی زیو کی آواز آئی ”اڑیا، تو مجھے مل کر کیوں نہیں گیا؟“
 ”کیسے ملنے آتا؟ ہر وقت تو دروازے میں پھوپھا پھوپھی بیٹھے رہتے ہیں۔“

”بہت تو سب سے مل رہا تھا، میں کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تو نے میری طرف دیکھا ہی نہیں.....“
 ”بزرگوں کے سامنے کیسے نظر اٹھاتا، شرم آتی تھی۔“
 ”تو ساری زندگی شرم ہی کرتا رہے گا یا.....“
 یکا یک ایسا سوڑ آیا کہ زیو کی آواز کٹ گئی اور سنگٹل آبا بند ہو گئے۔

وہ بے جان فون کو دیکھ کر نجانے کتنی دیر تک مسکراتا رہا، ایسی کیف آور مسکراہٹ جو آنکھوں سے بھی چھلک رہی تھی.....
 اس نے خود زیو کا نمبر مانے کی کوشش کی۔ بیکار تھا، سنگٹل واقعی بند ہو گئے تھے۔ اس نے فون جیب میں ڈال

لیا۔ آنکھیں بند کر کے سر بس کی کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا زیو کی بات کا جواب سوچنے لگا۔ یا..... اس کے آگے ایک بڑا سوال تھا! یہ گاؤں کی لڑکیاں اتنی ہوشیار کیسے ہو جاتی ہیں؟ گھر بیٹھے بیٹھے پاتیں پٹائی سیکھتی یا پیدائشی ہی رومانی ہوتی ہیں؟

زیو نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ ہاں رسالے پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ مگر اب لڑکیاں، ٹیلی ویژن سے سب کچھ سیکھ لیتی ہیں۔

اگر فون بند نہ ہوتا، تو وہ بھلا اس کی بات کا کیا جواب دیتا؟ وہ مستی میں مسکرایا۔ سامنے کھڑی ہوئی تو وہ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھاتا۔

سوچتے سوچتے وہ اس زمانے میں پہنچ گیا جب وہ اس کے لیے لیے ہال کھینچ کر بھاگ جاتا تھا اور وہ شور مچاتی رہ جاتی۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ بیچ میں ایک دروازہ تھا۔ سارا دن ادھر ادھر آنا جانا لگا رہتا۔ اس کے ابا کی تو وہ لاڈلی تھی۔ ذرا سی دیر میں کچھ اٹھائے آ جاتی ”ماموں دیکھیں، میں نے آپ کے لیے گاجر کا حلوہ بنایا ہے.....“

”دیکھیں ماموں یہ آلودہ لاپرائیٹا ہے۔“
 ”ماموں چائے کے ساتھ پکاوڑے کھا لیں گے.....“
 کیسی ہوشیاری سے سارے گھر کو مسخر کر لیا اس نے! ماسے دی گلی گھن آوے سدا جیوں ماسے دی گلی گھن آ..... یہ گیت اس نے فون میں ریکارڈ کر لیا تھا۔ اس نے ٹیپ آن کر دی۔ عبدالرؤف کے کانوں میں گیت گھولنے لگا۔ گیت کیا تھا ایک مدھر مست لورنی تھی..... دھیرے دھیرے وہ تیندگی والوں میں اتر گیا جہاں نیم کے کھنکے پیڑ پر جھولا تھا۔ جھولے میں بلورے کھائی زیو کے لیے لیے بال فرش کو چھو لیتے۔ کبھی وہ اسے جھولا جھلاتا اور کبھی

لیے ہال کھینچ کر بھاگ جاتا۔

بس کئی جگہوں پر رکی، چھابڑی فروشوں کی کیسی کیسی آوازیں آئیں، کون کب اترا کب چڑھا اسے کچھ معلوم نہیں! وہ تو ایسی نشہ آور بیٹی نیند سویا کہ آگے اس وقت کھلی جب بس شہر کے اڑے پر رکی اور کئی کئی زور زور سے آوازیں لگانے لگا۔ وہاں بس نے خالی ہو جانا تھا۔ وہ اپنا سامان ٹھا کر نیچے اتر آیا۔ گو اس کی منزل بہت آگے تھی لن پہاڑوں اور برف زاروں پر..... مگر وہاں اسے ایک رات رکنا تھا۔ اس جگہ زہیدہ کا بڑا بھائی غلام قادر اے اس آئی لگا ہوا تھا۔ پھوپھی نے بڑے چاڑ سے نکاح کی مٹھائی اور گاجر کا حلوہ بنا کر اسے دیا تھا کہ جاتے جاتے بھائی کو دیتے جانا۔ ان دنوں شہر کے حالات ٹھیک نہیں تھے، اس لیے غلام قادر کو نکاح میں شریک ہونے کی چھٹی نہیں ملی۔

عبدالرؤف نے اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھایا اور ساتھ وہ کھڑکی بھی جو پھوپھی نے بڑے سلیقے سے غلام قادر کے لیے بنا کر دی تھی۔ وہاں سے اس نے رکشا پکڑا اور غلام قادر کے دفتر آ گیا۔ پولیس اسٹیشن شہر کے ایک گلیخان علاقے میں تھا۔ وہ رکشے سے اترا، تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ سامان اٹھا وہ دفتر کے اندر چلا گیا۔

وہاں ایک محرر اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ غلام قادر سامنے والی مسجد میں نماز پڑھنے گیا ہے اور اسے پابند کر گیا کہ جب اس کا بھائی آئے، تو بٹھالے۔

”مسجد کہاں ہے؟“ عبدالرؤف نے پوچھا۔
 ”سامنے گلی میں۔“ محرر بولا۔
 عبدالرؤف نے سوچا ”وہ بھی مسجد میں جا کر نماز ادا کر لے۔ وہیں بھائی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“
 سامان محرر کے حوالے کر اس سے مسجد کا محل وقوع پوچھ وہ

باہر نکل آیا۔ سامنے ایک بڑا ہی مسروف بازار تھا۔ بازار کیا تھا زندگی سے مضمور ایک میلا تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی..... حیات انسانی کا سارا ساڑوسامان، کپڑے، زیور، ملبوسات، پارچہ جات، اور اشیائے خوردنی وہاں دستیاب تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے گھن و مست، کسی کو کچھ خریدنا تھا، کسی کو گھر بیٹھنے کی جلدی تھی۔

اس وقت تھانے کے آگے ایک بس آ کر رکی۔ بس سے پہلے بیٹڈ والوں کا گروپ اترا۔ نظم میں آتے ہی وہ اپنی دھن بجانے لگا..... دیر میرا گھوڑی چڑھیا۔ یہ گیت عبدالرؤف نے اپنے گھر میں بھی سنا تھا۔ مگر بیٹڈ کی دھن پر سنا تو اسے اپنے سر پہ پھولوں کا سہرا لگا محسوس ہوا..... کیا جذبہ ہے اس گیت میں! دو لہجہ اس سے اتر آیا اور اس کے ساتھ بارانی بھی..... عورتیں، بچے، بوڑھے رنگ رنگے ملبوسات میں ملبوس تھے۔ ایک سیانا آئی ساری بارگت کو ترتیب دینے لگا۔ عورتیں بچوں پر چلانے لگیں..... بچے دوڑ دوڑ کر کھلونوں کی دکانوں کی طرف جا رہے تھے۔

بیٹڈ زور زور سے دھن بجانے لگا:
 ادا دے دے کھڑکی تیری، ہاتل دی جانی
 دے جاوے دے ویراوے داگ پھڑائی.....
 یہ سن کر عبدالرؤف مسکرائے لگا۔ اس کی انکلوٹی بسن، کا کو نے نکاح کے بعد کہا تھا: لالہ، تیری داگ پھڑائی پر میں تو متھے کا نکالوں گی۔“

تب اس نے ہنس کر سوچا تھا ”کا کو! میں تجھے سر سے پاؤں تک زیور سے لادوں گا۔“
 اتنے میں بھاگتی ہوئی دوڑ لڑکیاں آئیں۔ عبدالرؤف کے قریب کھڑی ہو وہ رکشا رکھنے لگیں..... اس وقت کوئی رکشا خالی نہیں جا رہا تھا۔ وہ گھبرا گھبرا کر ہر رکشے کو ہاتھ

مصباح الحق خان سے ملیے

پاکستانی کرکٹ تاریخ کے کامیاب ترین کپتان اور
تیز ترین پٹھری بنانے والے کھلاڑی کا سفر زیست

ابوسارم



۱۳ نومبر ۲۰۱۳ء کو جب دہلی میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نے نیوزی لینڈ کو شکست دی، تو یہ خصوصاً کپتان مصباح الحق کے لیے یادگار لمحہ بن گیا۔ یہ فتح انہیں پاکستان کے کامیاب ترین کپتان ہونے کا اعزاز دے گئی۔ یوں مصباح جو خاصے عرصے شدید تنقید کی پٹھری تلے کابلہ رہے تھے، شہرت، عزت کی نئی بلندیوں پر چا

ساری زمین ہلا دی۔ زمین پر پڑتی ہوئی ہر شے تہ و بالا ہو گئی۔ زمان اور مکان دھوئیں کے ایک بہت بڑے گرداب میں گھوم گئے۔ دھواں جو سیاہ رنگ میں اٹھ رہا تھا، سفید ہو کر پھیلتا چلا گیا۔ دھوئیں کے جلو میں شعلے تھے اور شعلوں سے زیادہ چیخیں، واویلا، گرائیں، کراہٹیں اور فریادیں بلند ہو رہی تھیں۔

یہ قیامت تھی یا اس کا عکس!

تھوڑی دیر کے لیے بازار کا سارا منظر غائب ہو گیا۔ اس جگہ مشہدم عمارتیں تھیں اور آسمان کی جانب تیزی سے بڑھتا ہوا دھواں جو بڑی تیزی سے انسانی شقاوت کا اشتہار بننا جا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد امدادی ٹیمیں آئیں۔ پولیس آئی۔ کیمرے اور فائر بریگیڈ والے آئے۔ دھوئیں پر پانی کے فوارے چھوڑے گئے۔

بس کا نام و نشان نہیں تھا۔ دکان کے ایک چیمبے پر دو لہما کا سہرا لٹکا تھا۔

دور اندھ جلا پھانسی کا دوپٹہ کھجے سے چٹا ہوا تھا..... انسانی اعتنا ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی طرح بکھرے تھے..... جن ٹکڑوں میں تھوڑی جان تھی، وہ ابھی تھرک رہے تھے۔ جن آنکھوں میں کوئی انتظار تھا، وہ کھل رہ گئی تھیں..... لوتھڑے بھی کبھی بولتے ہیں؟ بوٹیوں کی بھی کوئی شناخت ہوتی ہے۔ نوٹے ہوئے کھلونے بھلا شکوہ کرتے ہیں؟ البتہ مشائی وائی دکان کے آگے ایک موبائل فون صحیح سلامت پڑا تھا۔ اس سے آواز آ رہی تھی:

مائے دی گلی گھن آ.....

اے سدا جیواں مائے دی گلی گھن آ.....

میں تاں عطر ملیساں میڈیاں تلیاں.....

دے پھل نیر بندا..... آ.....؟

دے رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے پھانسی کی چادر اوڑھ لی ہوئی تھی اور زرد رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ ہنس سوت والی لڑکی سے کہہ رہی تھی: ”اے کو معلوم ہو گیا کہ میں تیرے ساتھ بازار آئی ہوں۔ فون پر انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں، مغرب کے مائیوں کی رسم ادا کرنے سسرال والے آ جائیں گے اور تم ابھی گھر نہیں پہنچی۔“

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”جی کہ راستے میں ہوں۔ تم رکشہ روکنا، ایک ٹویہ بس آ کے کھڑی ہو گئی ہے۔“

”یہ بھی بڑا اچھا شگون ہے۔“ اس کی سہیلی ہنس کر بولی۔

”یہاں تو خالی رکشہ نظر نہیں آ رہا۔ آخر تمہیں میرے گھر کا بھانہ بنا کر نکلنے کی کیا سوچھی.....“

”اس کم بخت درزی نے میرے گھنا گھر سے پر گھوٹلیر یا نہیں لگائی تھیں۔ اگر آج اس کی دکان پر بیٹھ کر نہ لگواتی، تو اس نے ماننا ہی نہیں تھا۔“

”وہ دیکھو دور ایک رکشہ خالی ہوا۔“ ہنس سوت والی بولی ”میں دوڑ کر جاتی ہوں۔ تم یہیں کھڑی رہنا۔“

عبدالروف کو لڑکیاں دیکھتے اور ان کی باتیں سننے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مگر آج وہ بار بار پیلے سوٹ والی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ دوری رنگ شدت جذبات سے لال ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے میں اسے نریو کا چہرہ سا نظر آتا تھا۔

”نریو تو نے میری سوچ ہی بدل دی۔“ اس نے سوچا۔

بارت تریب پا کے کلی کی طرف مڑنے والی تھی۔ اس نے بھی سڑک پار کرنے کے لیے قدم بڑھائے۔ وہی وقت ایک وحشت ناک اور خوفناک دھماکا ہوا جس نے

پہنچے اور یوں انہیں اپنے صبر کا پلٹھا پھیل مل گیا۔

☆☆

مصباح الحق خان ۲۸ مئی ۱۹۷۳ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق نیازی قبیلے سے ہے۔ یہ حقیقت انہیں پاکستان کے لجنڈری کرکٹ کھلاڑی عمران خاں کا خوبی رشتے سے عزیز بنا ڈالتی ہے۔ بچپن سے کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا، لیکن والدین چاہتے تھے کہ مصباح پہلے تعلیم مکمل کریں۔ اسی لیے وہ خاصی دیر سے دنیاے کرکٹ میں داخل ہوئے۔

جب مصباح ساڑھے چوبیس سال کے تھے، تو انہوں نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا۔ حالانکہ ۲۳ سال کی عمر میں بیشتر کرکٹ کھلاڑی انہیں خاصے تجربے کا رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور پاکستانی بلے باز، مشتاق احمد نے پہلا ٹیسٹ میچ ساڑھے پندرہ سال کی عمر میں کھیلا تھا۔

مصباح نے ۱۰ فروری ۱۹۹۹ء کو قائد اعظم ٹرافی میں پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا۔ تب وہ سرگودھا کی ٹیم کا حصہ تھے۔ انہوں نے اچھی کارکردگی دکھائی چنانچہ ۲۰۰۱ء میں نیوزی لینڈ کا دورہ کرنے والی پاکستانی کرکٹ ٹیم میں انہیں شامل کر لیا گیا۔

انہوں نے ۳ مارچ کو کیویز کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ پہلی اننگ میں ۲۸ اور دوسری میں ۱۰ رنز بنائے۔ ۲۷ اپریل ۲۰۰۲ء کو نیوزی لینڈ کے خلاف ہی پہلا ایک روز بین الاقوامی میچ کھیلا۔ انہوں نے دونوں اصناف کرکٹ میں ٹی جلی کارکردگی دکھائی مگر پراسرار وجوہ کی بنا پر وہ قومی کرکٹ ٹیم سے دور رکھے گئے۔

پاکستان کے ممتاز سفارت کار اور چیئر مین کرکٹ بورڈ، شہریار خان نے اپنی تازہ کتاب "کرکٹ

اردو ڈائجسٹ 74

کاؤنڈروں: دی ٹریبونٹ پابلیکس آف اسپورٹس ان پاکستان" (Cricket Cauldron: The Turbulent Politics of Sport in Pakistan) میں لکھا ہے کہ انضمام الحق نے مصباح کو قومی ٹیم سے دور رکھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین مصباح ان سے کپتانی چھین لیں گے۔

تاہم منسٹر المزاج اور امن پسند مصباح اس استدلال سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے "اس زمانے میں محمد یوسف، انضمام الحق اور یونس خان بہترین ڈل آرڈر بلے باز تھے۔ اس لیے میری جگہ نہیں بن سکتی ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی۔"

بہر حال مصباح نے اگست ۲۰۰۳ء میں آخری ٹیسٹ اور اکتوبر ۲۰۰۳ء میں آخری ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلا۔ وہ پھر تین سال کے لیے عالمی کرکٹ سے دور ہو گئے۔ کوئی اور کھلاڑی ہوتا، تو گھر چلا جاتا۔ ویسے بھی مصباح نے ایم بی اے کر رکھا تھا۔ انہیں کہیں نہ کہیں اچھی ملازمت مل ہی جاتی۔ مگر کرکٹ سے دلی الفت نے انہیں اپنے پسندیدہ کھیل سے دور نہ جانے دیا۔

آخر انضمام الحق کی رخصتی کے بعد پاکستان کرکٹ بورڈ کو دو بارہ یاد آئے۔ مدعا یہ تھا کہ مصباح کی شمولیت سے ڈل آرڈر بیٹنگ کو مستحکم کیا جائے۔ مصباح الحق کو آتے ہی کرکٹ کی نئی قسم، ٹی ٹو ٹی سے واسطہ پڑ گیا جب پاکستانی ٹیم ستمبر ۲۰۰۷ء میں اس کا پہلا عالمی ٹورنامنٹ کھیلنے جنوبی افریقا پہنچی۔

اس ٹورنامنٹ میں مصباح الحق نے شاندار بلے بازی دکھائی اور پہلی باؤنڈری اننگ پر نمایاں ہوئے۔ اچھے کھیل کی بدولت پاکستانی ٹیم فائنل میں جا پہنچی جہاں اس کا مقابلہ روایتی حریف بھارت سے ہوا۔

اردو ڈائجسٹ 74

جب مصباح میدان میں آئے، تو کئی روز پریشانی دیکھیں مگر چکی تھیں اور منزل ابھی دور تھی۔ مصباح نے بالروں کے ساتھ مل کر زبردست جنگ لڑی اور پاکستان کو فتح کے قریب لے گئے۔ بد قسمتی سے آخری اور میں چھکا مارنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ آؤٹ ہو گئے۔ بہر حال مصباح کی عمدہ کارکردگی نے قومی ٹیم میں ان کے لیے جگہ پکی کر دی۔

لیکن انضمام الحق کے بعد طویل عرصہ پاکستانی ٹیم کو موزوں کپتان نہ مل سکا۔ یکے بعد دیگرے شعیب ملک، یونس خان، شاہد آفریدی اور سلمان بٹ کپتان بنائے گئے لیکن کوئی بھی زیادہ عرصہ نہ چل پایا۔ آخر مصباح الحق کے کندھوں پر کپتانی کی ذمے داری ڈال دی گئی۔ یہ اواخر ۲۰۱۱ء کی بات ہے۔

جب مصباح کپتان بنے، تو ٹیم انتشار کا شکار تھی۔ "اسپاٹ فلٹنگ اسکینڈل" کے اثرات اب تک موجود تھے۔ یہی نہیں، پاکستان بھی سیاسی لحاظ سے دہشت گردی کا

نشانی بنا ہوا تھا۔ ایسے ناگفتہ حالات میں مصباح نے بڑے عزم و ہمت کا ثبوت دیا اور بکھری ٹیم کو متحد و یکجا کرنے لگے۔

مصباح نے کئی میچ ڈیمانٹ کی چالیں چلی کر جیتے اور اپنے بہترین کھیل کا بھی تسلسل جاری رکھا۔ اگرچہ انہیں تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کبھی کہا گیا کہ وہ دفاعی کھیل کھیلتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہیں "ٹک ٹک" کا خطاب بھی ملا، مگر مصباح نے تنقید کی پروا نہ کی۔ ان کی سعی رہی کہ اپنی

اردو ڈائجسٹ 75

بہترین صانع جیتیں دکھا کر پاکستان کو فتح دلوائی جائے۔ مثبت سوچ رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی عالمی مقابلوں میں شکستیں ہونے کے باوجود جیت بھی پاکستانی ٹیم کا مقدر بنتی رہی۔ گویا مصباح الحق نے کسی بار پر حوصلہ نہیں کھویا۔ انہوں نے نہ صرف اپنی ہمت، جوانی رکھی بلکہ ساتھی کھلاڑیوں کا بھی جوش و جذبہ بڑھاتے رہے۔ ایک عمدہ لیڈر کی یہی بہت بڑی نشانی ہے۔

مصباح الحق کا عزم منعم رنگ لایا جب پاکستانی ٹیم نے نیوزی لینڈ کو پہلے ٹیسٹ میں شکست دی، تو انہیں پاکستان کے کامیاب ترین کپتان بننے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ وہ یوں کہ ان کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے "۱۵" فتوحات حاصل کر لیں جو تمام کپتانوں سے زیادہ ہیں۔ پاکستانی کرکٹ کی کپتانی سے متعلق اعداد و شمار ایک دلچسپ تصویر سامنے لائے ہیں۔

اب تک ۳۰ کھلاڑی ٹیسٹ کرکٹ پاکستانی ٹیم کی قیادت کر چکے۔ یہ لحاظ لیجیوں کی تعداد سر فہرست عمران

خان ہیں۔ ان کی کپتانی میں ۲۸ ٹیسٹ کھیلے گئے۔ ۱۳ پاکستان نے جیتے، ۸ ہارے اور ۲۸ برابر رہے۔

اس کے بعد جاوید میاں داد کا نمبر ہے جو وفاقاً نو کپتان بنتے رہے۔ ان کی قیادت میں پاکستان نے ۳۳ ٹیسٹ کھیلے۔ ۱۳ جیتے، ۶ ہارے اور ۱۴ برابر رہے۔ پھر مصباح الحق آتے ہیں۔ ان کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے ۳۳ ٹیسٹ کھیلے۔ ۱۵ جیتے، ۹ ہارے اور ۹ برابر رہے۔ دیگر اہم پاکستانی کرکٹ کپتانوں میں انضمام الحق

اردو ڈائجسٹ 75



(۳۱ کھیلے، ۱۱ جیتے، ۱۱ ہارے اور ۹ برابر) وہیم اکرم (۲۵ کھیلے، ۱۲ جیتے، ۸ ہارے اور ۵ برابر)، عبدالحمید کاردار (۲۳ کھیلے، ۶ جیتے، ۶ ہارے اور ۱۱ برابر) اور مشتاق محمد (۱۹ کھیلے، ۸ جیتے، ۴ ہارے اور ۷ برابر) شامل ہیں۔

درج بالا اعداد سے عیاں ہے کہ مصباح الحق نے صرف ۳۲ میچوں میں کپتانی کے بعد ۱۵ ٹیسٹ جیت لیے۔ گویا ان کی شرح کامیابی دیگر کپتانوں سے بہتر ہے۔ لیکن جاوید میاں داو نے اپنے دور کپتانی میں صرف ۶ میچ ہارے۔ یوں جیت اور ہارے کے شعبے میں ان کی شرح کامیابی سب سے بہتر ہے۔

۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۳ء وقفے وقفے سے عمران خان اور میاں داو نے کپتانی سنبھالے رکھی۔ تب پاکستانی کھلاڑی ہر مضبوط ٹیم سے ٹکرائے، خوب تجربہ حاصل کیا اور فتح کے علاوہ ہار کا مزہ بھی چکھا۔ اس دوران ۹۶ ٹیسٹ کھیلے گئے۔ ۱۴ ٹیسٹوں میں کپتانی کے فرائض ظہیر عباس نے انجام دیے۔

مصباح الحق کا دور یوں مختلف ہے کہ وہ پچھلے چار برس سے بحیثیت کپتان چلے آ رہے ہیں۔ اب تک وہ ۳۳ ٹیسٹ میں کپتانی کر چکے۔ جبکہ میاں داو کا دور کپتانی ۱۳ برس تک پھیلا ہوا ہے۔ عمران خاں نے دس برس تک کپتانی کے فرائض انجام دیے۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ عمران اور میاں داو دونوں کی ٹیم میں ممتاز کھلاڑی شامل تھے۔ یہ امر دیکھتے ہوئے مصباح الحق ٹیم کی کارکردگی عمدہ نظر آتی ہے۔

زبردست کھیل کا مظاہرہ

آسٹریلیا کے ساتھ تیسرا ٹیسٹ ۳۰ اکتوبر تا ۳ نومبر ابو ظہبی میں کھیلا گیا۔ اس میں مصباح الحق نے میجرانگول تیز رفتار بے بازی کے مظاہرے سے اپنے ناقدین کے

منہ بند کر ڈالے۔ چوتھے دن کھیلنے ہوئے انھوں نے ٹیسٹ کرکٹ کی تیز ترین فنٹھی (۵۰ رنز) بنا ڈالے۔ مصباح نے صرف ۲۱ گیندوں پر فنٹھی کی۔ اس سے قبل یہ اعزاز جنوبی افریقین کھلاڑی، جیکوئس کیلاس کے پاس تھا۔ اس نے ۲۰۰۳ء میں زمبابوے کے خلاف ۲۳ گیندوں پر فنٹھی بنائی تھی۔ پاکستان ہی کے شاہد آفریدی ۲۰۰۳ء میں بھارت کے خلاف ۲۶ گیندوں پر پچاس رنز بنا چکے۔ مصباح کی فنٹھی نے وقت کے حساب سے بھی نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ صرف ۲۳ منٹ میں انجام پائی۔ پہلے یہ ریکارڈ بنگلہ دیشی کھلاڑی، اشرف نل کے پاس تھا۔ انھوں نے ۲۰۰۷ء میں بھارت کے خلاف ۲۷ منٹ میں فنٹھی بنائی تھی۔

مصباح نے پھر اسی انگ میں تیز ترین سچری کا



بڑی بچوں کے ساتھ شہلا اور لالی

۶۵ ایک سال (۲۰۱۳ء) میں ایک روزہ بین الاقوامی مقابلوں میں سب سے زیادہ نصف سچریاں بنا کیں۔ ۶۵ برس پھر پاک و ہند کے پہلے کپتان جنھوں نے جنوبی افریقہ ٹیم کو اسی کی سرزمین پہ شکست دی۔

۶۵ ٹیسٹ کی دونوں انگلوں میں سچریاں بنانے والے آٹھویں پاکستانی کھلاڑی۔

مصباح الحق شادی شدہ ہیں۔ ایک پیارے سے بیٹے اور ایک بیٹی کے والد ہیں۔ شہناز امراں رکھتے ہیں۔ نظری طور پر منکسر المزاج ہیں اور بعض کھلاڑیوں کی طرح



”بچوں پچاں“ سے لگاؤ نہیں رکھتے۔ غصے کو پچھاڑ دینے والے پہیلوان ہیں جسے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا ہے۔ انہی خوبیوں کے باعث خدائے برتر نے انھیں عزت و شہرت بھی بخشی۔ مصباح ایک منفرد اعزاز بھی رکھتے ہیں..... وہ ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے والے سب سے بوڑھے کرکٹر ہیں۔ یہ سطور قلم بند ہونے تک ان کی عمر

۳۰ سال ۶ ماہ ہو چکی۔ مصباح کے بعد ویسٹ انڈین کھلاڑی، شیو نارائن چندر پال کا نمبر ہے جو ۳۰ سال ۳ ماہ ۱۸ دن عمر رکھتا ہے۔

مصباح الحق نے مناسب نما اور ورزش کے ذریعے خود کو چاق و چوبند رکھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ انجی مزید چند سال کرکٹ کھیل سکتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق برطانوی کھلاڑی، انفریڈ روڈس ۵۲ سال ۱۶۵ دن کی عمر تک ٹیسٹ میچ کھیلا رہا تھا۔ گویا اس کے سامنے تو مصباح ابھی دور جوانی میں ہیں۔

اردو ڈائجسٹ 77 جنوری 2015ء

ریکارڈ بھی برابر کر دیا۔ انھوں نے صرف ۵۶ گیندوں پر سچری بنائی۔ اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں مشہور ویسٹ انڈین بے باز، ویوین رچرڈز نے اتنی ہی گیندوں پر برطانوی ٹیم کے خلاف سچری بنائی تھی۔

وقت کے لحاظ سے یہ سچری بنانے میں مصباح کو ۷۲ منٹ لگے۔ تاہم آسٹریلیوی کھلاڑی، جے ایم گرینوری نے ۱۹۲۱ء جو ہانسبرگ میں جنوبی افریقا کے خلاف ۷۰ منٹ میں سچری بنائی تھی۔ گویا یہ ریکارڈ پچھلے ترانوے سال سے برقرار ہے۔

مصباح نے اپنی انگ میں ۵ چھکے اور ۱۱ چوکے ہارے۔ دراصل ضرورت اس امر کی تھی کہ تیز کھیل دکھایا جائے تاکہ جیت کی راہ ہموار ہو سکے۔ یوں مصباح نے ثابت کر دیا کہ وہ موقع نکل دیکھ کر بے بازی کرتے ہیں..... کبھی ٹک کرتے، تو کبھی خوب چوکے چھکے لگاتے ہیں۔ یاد رہے، ٹیسٹ کرکٹ کا اپنا مزاج ہے اور جو کھلاڑی اسے سمجھ جائے، بہترین و تجربے کار گراڈا جاتا ہے۔

مصباح الحق تاہم تحریر ۵۲ ٹیسٹ کھیل کر ۳۶۸۶ رنز بنا چکے۔ انھوں نے ۸ سچریاں اور ۲۶ نصف سچریاں بنائی ہیں۔ ۱۵۱ ایک روزہ عالمی مقابلوں میں حصہ لیا اور ۳۶۰۹ رنز بنائے۔ ۳۹ ٹی ٹو ٹی میچ کھیل کر ۸۸۸ رنز بنا چکے۔

پاکستانی کپتان کے دیگر اہم ریکارڈ یہ ہیں: ۶۵ کپتان کی حیثیت سے سب سے زیادہ رنز بنانے والے پاکستانی کھلاڑی۔

اردو ڈائجسٹ 77 جنوری 2015ء

”دادا! وہیر سے جانے پڑ مار نہ پڑی، تو سبق یاد نہیں ہونے پر پڑ جائے گی۔۔۔۔۔ اگر سبق یاد کر لیا، تو یونیفارم میلا ہونے پر پڑے گی۔ وہاں سے بھی بچ گیا، تو ٹوٹی چپل اسکول پہن کر جانے پر پڑ جائے گی۔ دادا! یہ اسکول بنا ہی اس لیے ہے کہ وہاں بچوں کو ماریں اور بے عزتی کریں۔“ کا کا اب مکمل جاگ چکا تھا۔

”ہاں ہاں دماغ میں گانے بھرے ہوں۔ سارا دن تک منک کر ڈانس کرتے پاؤں ہوں، تو عقل تو موٹی ہو ہی جاتی ہے۔ او بے بدایتا دو لفظ پڑھ لے تو حساب کتاب آ جائے۔ بجلی کا بل بھی آ جائے تو ہم جاہل کٹر والی دکاں پہ جا کر پڑھواتے ہیں۔ اچھے سے اچھا سو بائل رکھا ہے پر پتا ہی نہیں چلتا کہ فون کس کا آ رہا ہے۔ اور فون میں چشمی کس کی آئی ہے۔ کاروبار کے لیے بھی تقسیم ضروری ہے۔“ دادا اب کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

”دادا! سو بائل والی چشمی کو سچ کہتے ہیں۔“ کا کے نے دادے کی غلطی پکڑی۔

”تعمیر ہی نے تجھے یہ بات بتائی ہے نا۔“ دادا پھر بولا۔

”ارے دادا! پانچویں تک کی پڑھائی سے مجھے گفتنی آگئی ہے، سو سے بھی زیادہ ہزار تک۔۔۔۔۔ جمع تفریق بھی کر لیتا ہوں۔ اب اس سے زیادہ کیا پڑھوں؟ میں نے کوئی مل کھولنی ہے! تیرے ساتھ چائے کے بوتل پہ بیٹھوں گا یا اماں اور تیرے ساتھ جھاڑو لگاؤں گا۔ ان دونوں کاموں میں کون سی سائنس لگتی ہے۔ بس جتنا علم چاہیے اتنا حاصل کر لیا۔ مجھے اسکول نہیں جانا۔“ کا کا تن کر بولا۔

”اچھا پتھر یوں کر گرمیوں کی چشمیوں تک تو اسکول جا، پھر میں تجھے کام پر لگاؤں گا۔ تین ماہ کی چشمیوں میں تو دیکھ لینا کہ کون سا کام آسان ہے۔ جھاڑو بوتل یا اسکول

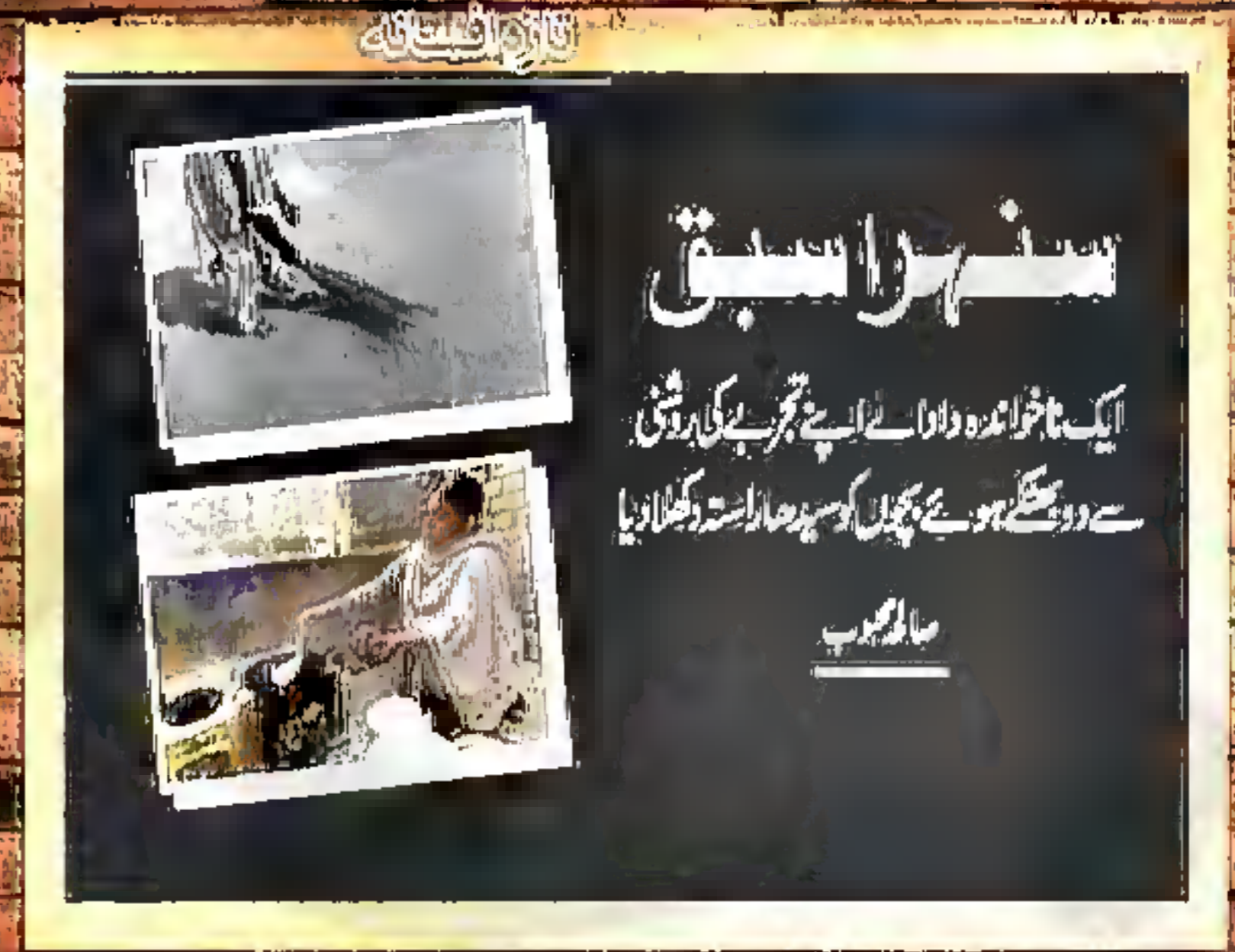
”دادا! وہیر سے جانے پڑ مار نہ پڑی، تو سبق یاد نہیں ہونے پر پڑ جائے گی۔۔۔۔۔ اگر سبق یاد کر لیا، تو یونیفارم میلا ہونے پر پڑے گی۔ وہاں سے بھی بچ گیا، تو ٹوٹی چپل اسکول پہن کر جانے پر پڑ جائے گی۔ دادا! یہ اسکول بنا ہی اس لیے ہے کہ وہاں بچوں کو ماریں اور بے عزتی کریں۔“ کا کا اب مکمل جاگ چکا تھا۔

”ہیرو صاحب! تو سبق یاد کیا کرتا کہ ماسٹر سے مار نہ پڑے۔ سبق تجھ سے یاد نہیں ہوتا اور گانے اور ناچ ایسے آتے ہیں جیسے ماں کی گود ہی سے تربیت لے کر آیا ہے۔ اتنا بڑا ہو کر ابھی تک پانچویں جماعت میں بیٹھا ہے۔ تیری دیکھا دیکھی یہ چھوٹا بھی اسکول نہیں جاتا۔ کچھ عقل کر، پڑھ لے۔ کیا کرے گا ساری عمر؟“ دادا مار پیٹ کا ارادہ چھوڑ کا کے کو سمجھانے لگا۔

”دادا! ہماری تو نسلوں میں کوئی نہیں پڑھا، تو میں کیوں پڑھ جاؤں؟ ابا نہیں پڑھا، یقیناً تیرے ابا اور دادا بھی نہیں پڑھے ہوں گے۔ بھلا ہم جو مدارس کے گھروں میں کتابوں کا کیا کام؟ میں نے اسکول نہیں جانا، ہر سال لٹل ہونے پر مجھے برا لگتا ہے۔“ کا کے نے فیصلہ سنا دیا۔

دادے نے کا کے کو دیکھا۔ سیاہ کالی رنگت پر لمبے لمبے بال کچھ اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ سر پر سیدھے نوکیلے کھڑے تھے۔ ایک کان میں سوراخ کر کے بالی بپنی ہوئی تھی۔ سرخ ٹی شرٹ جی بھر کر میلی تھی اور نیچے پہنا ٹیکر شاید کبھی پتلون رہا ہوگا۔ اب وہ گتھنوں سے نیچے تھا اور خاصا بد وضع بھی۔۔۔۔۔ ٹیکر کمر سے اس قدر نیچے تھی کہ دادا کو شدید کوفت ہونے لگی۔

”اچھا! تو تیری بے عزتی ہوتی ہے؟ کا کے یہ تیری عزت کب ہوتی تھی جو بے عزتی بھی ہونے



بھرا کھڑا تھا۔

”ارے! اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ اپنے باپ کو جواب دینا ہے۔ اسکول نہیں جائے گا۔۔۔۔۔ کیوں؟ مار پڑنی ہے، لے لے یہ گھر میں بھی تجھے ماری پڑے گی۔ بتا میری ماں کھائے گا یا ماسٹر کی نا؟“ دادا نے اپنی جوتی اتار کر ہاتھ میں پکڑی تو کا کے کی جان ہی نکل گئی۔ پھر بھی ہمت کر کے بولا:

”دادا! تو ہی مار لے۔ صرف ماری کا درد ہو گا نا۔ اسکول میں ماسٹر مارے گا، تو درد ہو گا اور بے عزتی بھی! سارا دن لڑکے میرا مذاق اڑائیں گے۔“ وہ پھر زور سے رونے لگا۔

”تو سویرے اٹھتے تھے موت آتی ہے۔ سویرے وقت پہ اسکول جا، تو جوتے نہ پڑیں۔“ دادا جوتا بھرا کر بولا۔

میں نے اسکول نہیں جانا۔ مجھے سونے وہ ”ابا! سویرے سویرے اٹھا کر بھیج دینے ہو۔ ماسٹر روز باراتا ہے کہ وہیر سے آئے ہو، مار بھی کھاتا اور بے عزتی لگے! پانچ جماعتیں پڑھ لیں، بس اب دماغ نہیں چلتا اس پڑھائی میں۔“

غیند میں ڈوبا کا کا اٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، اسی لیے ابا کو بتا کر دست بدل دو بارہ کھیس تان لیا۔ اچانک چار پائی بٹنے لگی اور کا کا اپنے کھیس اور نیچے سمیت زمین پر آن پڑا۔

”ابا! زٹل۔۔۔۔۔“ وہ زور سے چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھیس بنوز اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ مگر سامنے ابا کے ہجائے دادا کو دیکھ کر ساری جھینس دب گئیں۔ وہ ٹھسے میں

اور اسکول کا کام۔" دادا انہام و تقسیم سے بولا جس کی جہاں دیدہ نگاہیں کا کے کے چہرے پر بغاوت کے آثار دیکھ چکی تھیں۔

"اس - جاہلے میں میرے ساتھ منا بھی شامل ہو گا۔ چوتھی تک تو یہ بھی پڑھ چکا۔۔۔۔۔ یہ بھی اب کام کرنا چاہتا ہے، پڑھائی نہیں۔" کا کے نے ایک سال چھوٹے بھائی کا مقدمہ بھی دادا کی عدالت میں پیش کر دیا۔

"اچھا منظور ہے۔۔۔۔۔ اب دونوں بھائی اٹھو تیار ہو کر اسکول جاؤ۔ اور ہاں یہ اپنے کزنٹ لگے ہاں سیدھے کر دے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے محبت کہیں جا رہے ہیں۔"

یوں دادا نے گرمیوں کی چھٹیوں تک دونوں بھائیوں کو اسکول جانے پر تیار کر لیا۔ محنت کے کونے میں بنے چولہے پر پیٹھی کا کے اور سنے کی ہاں دونوں کے لیے گرما گرم پرائیوٹ بنا رہی تھی۔ ساتھ میں چائے کی خوشبو بھی صحن میں پھیلی تھی۔ دونوں بچوں کو اسکول بھیجنا دادا اور ماں کی شدید ترین خواہش تھی۔

☆☆

یوسف مسیح کا غریب خاندان نسلوں سے شہر کی میونسپل کمیٹی میں ملازم تھا۔ خاندان کے مرزا عورتیں کبھی سرکاری ملازم تھے۔ ان کی معاشی حالات بہتر ہو گئے تھے۔ مگر بچوں کا پڑھائی کی طرف بالکل رجحان نہ تھا۔ بھارتی فلموں اور گانوں کا شوقین تو پورا ہی معلقہ تھا۔ تمام عورتیں کاموں سے فارغ ہو کر فلمیں دیکھتیں اور بچے گانوں پر ناچ کی مشق کرتے۔ سا انہ نتیجے والے دن محلے بھر کے بچے فیل ہو کر آتے اور ہر جماعت میں تین سال لگاتے۔

یوسف مسیح کے دونوں بیٹے کبھی کمیٹی میں ملازم تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یوسف نے محلے میں چائے کا کھوکھا

کھول لیا۔ سارا دن وہاں چائے بنتی اور پی چلتا۔ کا کا اور سارا دنوں ہوتے کام میں اس کا ہاتھ بناتے اور اسکول سے بھاگنے کے نئے طریقے ڈھونڈتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں دو ہفتے باقی تھے کہ دادا نے انہیں عملی میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دے دی۔ یوسف کا تجربہ تھا کہ عملی زندگی شروع کرنے کے بعد کبھی کوئی واپس اسکول نہیں گیا۔ ہاں زندگی کے ہر موڑ پر تقسیم کی کمی پر افسوس ضرور کیا جاتا۔ کا کے نے رو دو تھو رو ہفتے گزارے اور آخر گرمیوں کی چھٹیاں بھی آن پہنچیں۔

"او کا کا۔۔۔۔۔! او منا اٹھو سویر ہو گئی ہے۔" منہ اندھیرے دادا نے آواز دی اور وہ اس دیر ہونے پر پانی کا بھرا ہوا جگ ان دونوں کے منہ پر اندھیل دیا۔ دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دادا! یہ اتنی سویرے کیا ہو گیا؟" دونوں حیران تھے۔

"پترا! سڑکوں پر جھاڑو کیا بارہ بجے لگاؤ گے؟ آج اپنی ماں کی جگہ تم دونوں جاؤ گے۔ چلو سائیکل نکالو۔ کا کا سائیکل چلائے گا۔ سنا جھاڑو پکڑ کر آگے پیٹھے گا اور میں پیچھے۔"

یوں دادا دونوں کو ساتھ لیے کام پر روانہ ہوا۔ اس لمبی سی سڑک پر ساری دکانیں بند تھیں۔ سڑک کی صفائی کر کے مخصوص مقامات پر کوڑا اکٹھا کرنا تھا۔ کا کے کا باپ ٹرائل ڈرائیور تھا۔ چاچا ٹرائی میں کوڑا ڈالتا تھا۔ دادا دونوں کے مردوں پر کھڑا ہو کر کام کرانے لگا۔ کسی غلطی یا سستی کی صورت میں انہیں جھڑکیاں بھی دیتا۔

"ہمارا دادا بچھلے جنم میں یقیناً گویا گدوہ تھا۔" کا کے نے منہ کے کان میں کہا۔ بھارتی فلمیں دیکھ دیکھ کر کئی جنموں کا تصور بچوں کے ذہن میں خاصا پختہ ہو

چکا تھا۔ منے نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی اور ابھی جواب دینے ہی والا تھا کہ دادا پیچھے سے جلدی کام کرنے کی صدائیں لگانے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹوں میں سڑکیں صاف ہو گئیں پھر پانی والی ٹینکی آ کر چھڑکاؤ کر گئی۔ سڑک کے درمیان لگے پورے ڈھل کر صاف ہو گئے اور دونوں بچے تھکن سے چور۔

"اولر! کوا جلدی ناشتا کرو پھر ہوٹل چلیں۔" دادا بولا۔

ان دونوں کی عملی زندگی کا پہلا دن تو خاصا کٹھن تھا۔ "یہ صفائی دن میں دو دفعہ کرنا ہوتی ہے۔ دوسری دفعہ دن تین سے پانچ بجے تک۔" دادا سے پہلے ماں نے اطلاع دی جس کی ڈیوٹی اب بچوں نے سنبھال لی تھی۔ سارا دن کے کام اور رات گئے تک ہوٹل میں ڈیوٹی۔۔۔۔۔

چند ہی دن میں دونوں بھائیوں کی امت جواب دے گئی۔

"کا کے! یہ کام تو بڑا مشکل ہے۔ ہم غنڈے نہ بن جائیں۔" منی فلم دیکھ کر یہ آمیز یا منے کے دماغ میں آیا۔

"ہاں یہ اچھا ہے۔ غنڈے صبح سے شام تک کام نہیں کرتے، صرف رعب جھاتے ہیں۔ مگر یہ غنڈے بنتے کہاں ہیں؟" کا کے نے ہاتھوں پر بنے چھالے پھوڑتے ہوئے منے سے پوچھا۔

"یہ تو پتا کرنا پڑے گا۔ دادا سے پوچھیں گے۔" منا بولا۔ دادا کا علم بہر حال ان سے زیادہ تھا۔

"ہاں اور دادا پہلے تو مارے گا۔۔۔۔۔ پھر پوچھیں گا کہ غنڈوں سے کیا کام ہے؟ اپنے ہوٹل پہ وہ جیرا آتا ہے نا۔ اس سے دادا بھی ڈرتا ہے۔ وہ غنڈہ ہے۔ اس سے پوچھتے ہیں۔" کا کا سمجھ داری سے بولا۔

اگلے روز جیرے سے غنڈہ بننے کا طریقہ پوچھنا

دونوں کو کافی مہنگا پڑا۔ مار پڑی، بے عزتی ہوئی اور جواب بھی نہ ملا۔ عملی زندگی تو بڑی مشکل تھی۔ اس کا سبق جماعت کے اسباق دوسرے سے مختلف اور مشقت طلب تھا۔

ماشرچی کبھی کبھی شاباش بھی دیتے تھے۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے اور باتیں کرنے کا موقع بھی مل جاتا۔ اماں سویرے سویرے پرائیوٹ، انڈے کھلاتی تھی اور ساتھ میں روٹی کا ڈبا بھی دیتی کہ اسکول میں کھا لیں۔۔۔۔۔ امتحانوں میں دادا دودھ میں بادام ڈال کر خود انہیں پلاتا۔ ابارت کو موٹنگ پہنچا لانا کہ بچے پڑھ رہے ہیں، انہیں طاقت ملے گی۔۔۔۔۔ منے کو سب یاد آنے لگا۔

"ہائے ہائے! اب سارا دن کام کام کام۔۔۔۔۔ اور دادا

کی گالیاں، اماں کی جھڑکیاں، گا بوں کی آوازیں اور ابے کی دھمکیاں اور تو اور گانوں پر ناچ کی مشق کا وقت بھی نہیں ملتا۔" کا کے نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور میسے کپڑوں میں کہیں جذب ہو گئے۔

☆☆

ابا اور دادا میں کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔ کا کے کو ابا کے موڈ سے اندازہ ہوا۔ سن مگن لینے سے معلوم ہوا، ابا کمانی کی خاطر دعویٰ جانا چاہتا ہے۔ دادا کو دعویٰ سے جانے کیوں خدا واسطے کا ہیر تھا۔ دادا کے نزدیک یہاں کی سرکاری نوکری کے بہت زیادہ فائدے ہیں۔ کا کے نے منے کو سارا جھگڑا بتایا۔

"ابا نے فلموں میں دعویٰ بہت دفعہ دیکھا ہے۔ وہ بہر حال میں وہاں جانا چاہتا ہے۔" منے کو بھی کچھ معلومات مل چکی تھیں۔

اردو ڈائجسٹ 81 جنوری 2015ء



انسانوں کے کام آسان بنانے والی

۲۰۱۲ء کی بہترین ایجادات

سستی بجلی سے لے کر ایپلا وائرس جیسے موذی سے نجات دلانے والے حیرت انگیز آلے تک

سیدنا محمد

سہ ماہی قبل یونانی فلسفی، افلاطون نے کہا تھا: "ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔" چنانچہ ضرورت کے باعث پچھلے ایک سو برس میں حضرت انسان ہزار ہا ایجادات سامنے لا چکا اور حال یہ سلسلہ جاری ہے۔ ۲۰۱۳ء میں بھی نئی ایجادات سامنے آئیں جن کا تذکرہ پیش ہے۔

ہزاروں

ٹرک میں رکھا ایٹمی ری ایکٹر ماہرین کا کہنا ہے، اسی صدی میں، رکانزی ایندھن (ٹیل، گیس اور کوئلے) کے ذخائر ختم ہو جائیں گے۔

اردو ڈائجسٹ 83 جنوری 2015ء

اڑے گا، اڑے گا۔
"اور پھر پولیس والوں نے ہمیں بتایا کہ تمہارے ساتھ تو دھوکا ہوا ہے۔ پترا! ہمارے نصیبوں میں جھاڑو ہے جھاڑو، یہ دہنی ہماری قسمت میں نہیں۔" دادا اور بابا پھر ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے اور کاکا اور مناجھی۔
آج انہیں نئی باتوں کا پتا چلا..... غلم کے بغیر تو دنیا میں دھوکا، بے عزتی اور مارنی مار ہے۔

"اوائے اٹھو..... دونوں نکلے ابھی تک سو رہے ہیں۔" حسب معمول دادا پانی کا جگ باتھ میں لیے کھڑا تھا۔
"دادا! ہم نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔" کاکا آنکھیں مارتا اٹھا..... مناجھی کسمسا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا مطلب؟" اوائے کھوتے دے پترا! کون سا فیصلہ.....؟" دادا نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ہم اسکول جائیں گے۔ چھٹے پڑھیں گے پھر کام شروع کریں گے۔" کاکا بولا۔
"کون سی فلم دیکھ لی ہے کل جو ایسی سیانوں والی بات کر رہے ہو؟" دادا حیرت سے بولا۔
"وہی جو گلہ ہمارے اپنے گھر میں چل رہی تھی۔" کاکا بولا۔

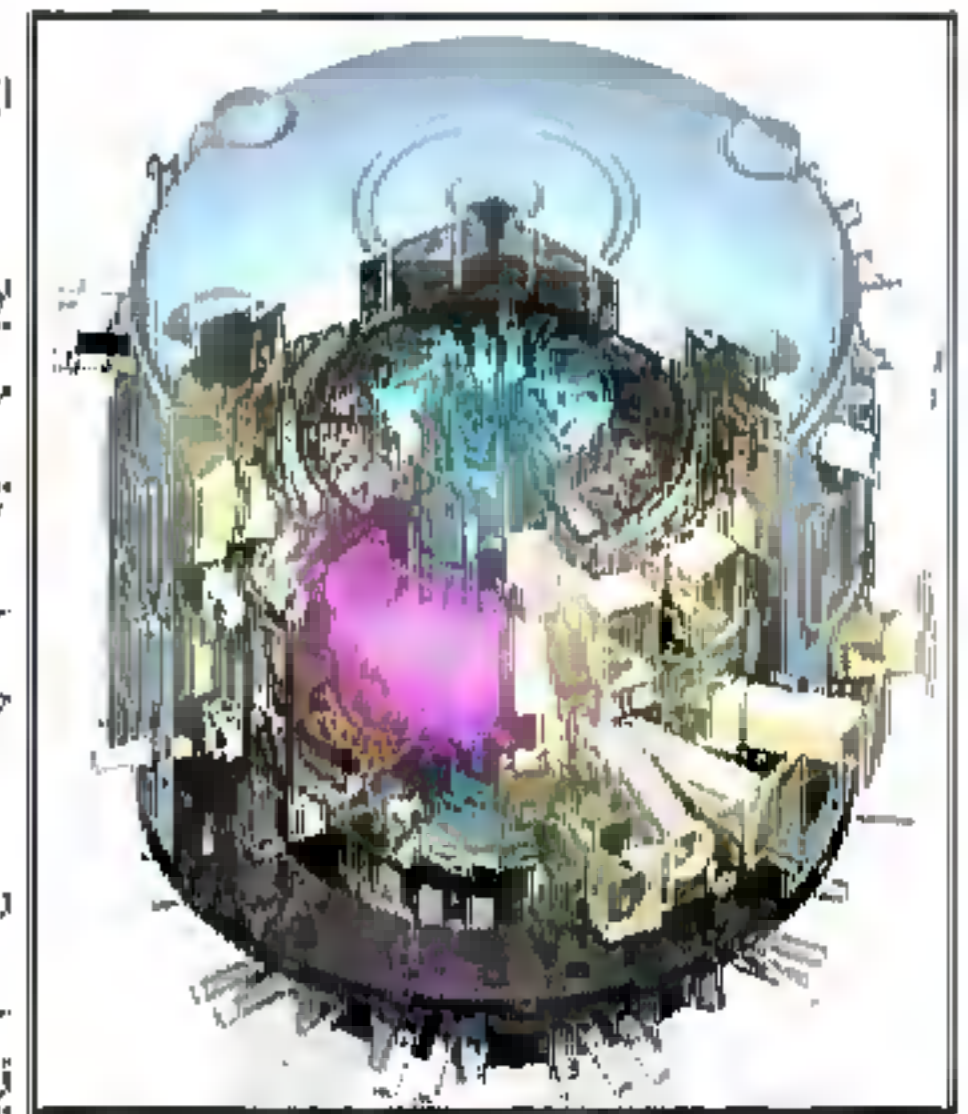
"دادا اور بابا والی!" مناجھی مسکرایا اور بولا۔
دادا زور سے ہنس پڑا ساتھ میں بہو اور بیٹا بھی! پانی کا جگ رکھ کر اس نے دونوں کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا "شباباش میرے پترا، شباباش! یہ ہوئی نا بات!" دادا دل سے خوش تھا۔
تعلیم عزت اور اچھی زندگی کا اشارت کٹ ہے، اس کے دونوں پوتوں نے ان چھٹیوں میں زندگی کا سب سے اہم سبق سیکھ لیا تھا۔

اردو ڈائجسٹ 82 جنوری 2015ء

دادا نے بیٹے کو جھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر بیٹے کے دماغ پر دہنی جانے کا بھوت سوار تھا۔ ایک دن ہوٹل کے گلے سے پیسے اور اماں کا زیور چھو کر ابا غائب ہو گیا۔ دو دن تک گھر میں موت کا سا سناٹا چھایا رہا۔ ہوٹل بھی بند تھا اور کاکا اور مناجھی بھی کام پر نہ گئے۔ اماں کو جانے اپنے زیور کا زیور، افسوس تھا یا ابا کے جانے کا! وہ کھانا پکانا بھی بھول گئی۔ تیسرے روز سے پھر وہی کام شروع ہو گیا۔ معلوم نہیں دادا پترا دل تھا یا اماں سنگدل تھی۔ کاکا اور مناجھی دادا کے ساتھ تھے۔

دو ہفتوں بعد ابا واپس آن موجود ہوا۔ پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹی ہوئی ٹیبل، کھڑے بال اور خالی جیب۔ آتے ہی دادا سے معافیاں مانگنے لگا۔ جذباتی فلمی سین کے بعد دادا کو کچھ یاد آیا۔ "اوائے پترا تو کس کے ساتھ دہنی گیا تھا؟" اس نے پوچھا۔
"ابا سب فرلاڑ تھا۔ ایجنٹ ہمیں کراچی لے گیا..... وہاں سمندر دکھنا کر کہا کہ دوسری طرف دہنی ہے۔ ہمیں ایک لالچ میں بٹھا دیا اور کہا کہ یہ دہنی میں اتارے گی۔ ہم پڑھے لکھے تو تھے نہیں کہ کوئی پاسپورٹ، ویزا، ٹکٹ مانگتے۔ دو دن وہ لالچ ہمیں وہیں جزیروں میں گھماتی رہی اور پھر کراچی ہی کے کسی ویران ساحل پہ اتار دیا۔ ہم دہنی سمجھ کر چل پڑے۔ سامنے اپنے پاکستانی ہی لے۔ تب سمجھ آیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر ابا زور زور سے رونے لگا جس کا اماں نے بھی خوب سانجھ دیا۔ اس کی داستان بے حد دردناک تھی۔

"پترا! یاد نہیں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟" اب دادا افسوس پوچھتا ہوا بولا "مجھے تو وہ دہنی کے چکر میں لاہور لے گئے تھے۔ وہاں چوہدری کے پاس وہ نمائش والا جہاز کھڑا ہے جو آرتا نہیں، اس میں بیٹھا گئے۔ میں اور میرا دوست سارا دن سامان لیے جہاز میں بیٹھے رہے کہ ابھی



ایٹمیوں کے ملاپ سے ہیلیم گیس پیدا ہوتی ہے۔
ایٹمی فشن کی عمدہ مثال ایٹم بم ہے۔ ایٹم بم میں یورینیم یا پلوٹونیم موجود ہوتا ہے۔ جب دھماکے سے اس معدن کے ایٹم ٹوڑے جائیں، تو وہ ٹوٹ کر حدت اور تاب کاری پیدا کرتے ہیں۔ یوں تیار کن دھماکا ہوتا ہے۔ لیکن ایٹمی ری ایکٹر کے کنٹرول شدہ ماحول میں حدت کو بجلی میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

سائنس دان ایٹمی فشن پانے کی خاطر مختلف دھاتوں اور معدنیات کے ایٹم ٹوڑنے میں کامیاب ہو چکے، لیکن ایسا ری ایکٹر تیار نہیں ہو سکا جس میں ایٹمی فیوژن انجام پاسکے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ایٹم ملانے کے لیے بہت زیادہ توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ چھوٹی سطح پر ایک سورج تخلیق کر لیا جائے۔

پچھلے پچاس ساٹھ برس کے دوران سائنس دان ایسا ری ایکٹر بنانے کے لیے زبردست جدوجہد کر چکے جس میں ایٹمی فیوژن جنم لے، مگر انہیں کامیابی نہیں ملی۔ اس اثنا میں ایسا اڈا اریوں روپے خرچ ہوئے مگر سونے کی چڑیا ہاتھ نہ آئی اور یہ حقیقت ہے کہ ایٹمی فیوژن سونامی ہے۔

دراصل ایٹمی فیوژن کے ری ایکٹر میں ڈیوٹیریم اور لیٹیئم بطور ایندھن استعمال ہوں گے اور یہ دونوں زمین پر وافر تعداد میں دستیاب ہیں۔ لیکن ان دونوں کے ایٹموں کو ملانے کے لیے ایک کمرے میں درجہ حرارت ”اکروڑ سینٹی گریڈ“ ہونا چاہیے۔ یہ سورج کے مرکز میں موجود درجہ حرارت سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ماہرین ایسا کوئی کمرایا بند جگہ نہیں بنا سکے جہاں اتنا شدید درجہ حرارت پیدا کیا جاسکے۔

بہر حال امریکا اور یورپی یونین ایسا ایٹمی ری ایکٹر

چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دان متبادل ذرائع ایندھن کی تلاش میں ہیں۔ انہی میں ایٹمی توانائی بھی شامل ہے جو جی نوع انسان کو بے پناہ بجلی فراہم کر سکتی ہے۔ (گویا تقریباً صدی بعد بجلی کرۂ ارض پر بنیادی ذریعہ ایندھن بن جائے گا)

ایٹمی توانائی کے ذریعے بجلی دو طریقوں سے بنتی ہے: ”ایٹمی فیوژن“ (Nuclear Fusion) جس میں دو عناصر کے ایٹم باہم پیوست ہو جائیں، تو وہ توانائی خارج کرتے ہیں جسے بجلی میں ڈھالنا ممکن ہے۔ ”ایٹمی فشن“ (Nuclear Fission) میں وہ ایٹم جدا ہونے سے توانائی جنم لیتی ہے۔

ایک عام اصول یہ ہے کہ جو عناصر وہ سے ہلکے ہیں، ان کے ایٹموں میں ایٹمی فیوژن انجام پایا ہے۔ جبکہ لوہے سے بھاری عناصر میں ایٹمی فشن جنم لیتا ہے۔ ایٹمی فیوژن کی بہترین مثال ہمارا سورج ہے۔ وہاں جب ہائیڈروجن گیس کے دو ایٹم آپس میں ملیں، تو توانائی روشنی (فونون) کی شکل میں جنم لیتی ہے۔ دونوں

بنانے کی بھرپور سعی کر رہے ہیں۔ جس میں درجہ حرارت ۱۰ کروڑ سینٹی گریڈ تک پہنچایا جاسکے۔ ایسا ری ایکٹر بنانے کی دوڑ میں مشہور امریکی اسلحہ ساز کمپنی، لاک ہیڈ مارش بھی شریک ہے۔

اس امریکی کمپنی میں ماہرین کی ایک ٹیم ایٹمی فیوژن والے چھوٹے ایٹمی ری ایکٹر تیار کر رہی ہے۔ اکتوبر ۲۰۱۳ء میں ماہرین نے اعلان کیا، انہوں نے ایسے تجرباتی ری ایکٹر کا ڈیزائن تیار کر لیا ہے جسے ٹرک کے پیچھے رکھا جاسکے گا۔ ماہرین نے اس کا نام ”ہائی پینا فیوژن ری ایکٹر“ رکھا ہے۔

یہ چھوٹا ہائی پینا فیوژن ری ایکٹر بحریل کے بعد ”۱۰۰ میگا واٹ“ بجلی پیدا کرے گا۔ یہ بجلی ۸۰ ہزار افراد پر مشتمل قصبے کی ضرورت بخوبی پوری ہو سکے گی۔ لاک ہیڈ کے ماہرین کا دعویٰ ہے، اگلے پانچ برس میں تجرباتی ری ایکٹر تیار ہو جائے گا۔ گویا ایٹمی فیوژن والے ری ایکٹر بننے لگے، تو بجلی بنانے کی خاطر وسیع و عریض شش گھر بنانے اور ہوائی چکیاں لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ نیز لوڈ شیڈنگ کا توڑ لنگھ آئے گا۔

تار کے بغیر بجلی

بجلی کیا ہے؟ ایکٹرونوں (Electrons) کا بہاؤ جسے تار میں ڈال کر قابو کیا جاتا ہے۔ لیکن آسانی بجلی کی صورت وہ نفا میں تبدیل جاتے ہیں۔ لیکن اس بہاؤ کو کسی جگہ پہنچانے کا کیا دوسرا طریقہ بھی ہے؟ امریکی کمپنی، وائی ٹرائسٹی (Witricity) اسی طریقے کی

کھوج میں ہے تاکہ روزمرہ کام کاج میں انسانوں کے لیے آسانی جنم لے سکے۔

ظاہر ہے، بجلی اگر تاروں کے بغیر گھریلو برقی اشیا تک پہنچنے لگے، تو پھر وہ آسانی ایک سے دوسری جگہ پہنچ سکے گی۔ تاریں لگانے اور بچھاتے ہوئے جن تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے، ان سے چھٹکارا ملے گا۔

وائی ٹرائسٹی کے سائنس دان بے تار بجلی حاصل کرنے کی خاطر مقناطیس قوت (Magnetic Power) سے مدد لے رہے ہیں۔ مقناطیس قوت بھی ایک قدرتی طاقت ہے جو مخصوص عناصر کو اپنی طرف کھینچتی یا پرے دھکیلتی ہے۔ یہ قوت ایک مخصوص علاقے میں مقناطیسی میدان یا دائرہ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی دائرے میں ایکٹرون بھی سفر کر سکتے ہیں۔

درج بالا امریکی کمپنی کے ماہرین نے ایسا آلہ ایجاد کر لیا ہے جو ایک کمرے میں مقناطیس میدان پیدا کر دے۔ اس میدان کی حدود میں جتنی بھی برقی اشیا ہوں گی، ان تک ایکٹرون مقناطیسی قوت کے سہارے پہنچ



جائیں گے..... یوں وہ تار کے بغیر چل پڑیں گی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ برقی اشیا میں بھی ایسے آلے (Resonant Magnetic Coil) نصب ہوں جو مقناطیسی راہ سے آنے والی بجلی (الیکٹرون) پکڑ سکیں۔ اس ضمن میں برقی اشیا (الیکٹرونکس) تیار کرنے والی امریکی کمپنیاں اپنی مصنوعات میں یہ آلے نصب کرنے لگی ہیں۔

والٹی ٹرانسٹی کا ایجاد کردہ آلہ فی الحال ۱۰ فٹ کے قطر میں مقناطیسی میدان پیدا کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نے اٹل کمپنی سے معاہدہ کیا ہے۔ دونوں ۲۰۱۶ء تک مکمل طور پر بے تار لیپ ناپ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لیپ ناپ چارج بھی تار کے بغیر ہوگا۔ وائر ٹرانسٹی کے سربراہ ایلکس گروڈن کا دعویٰ ہے:

”اگلے دس برس میں ایسی برقی اشیا..... ٹی وی، ریفریجریٹرز، بلب وغیرہ وجود میں آجائیں گی جو مقناطیسی میدان کے ذریعے ہمارے بغیر کام کریں گی۔“

سپر کیلا

یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے، آسٹریلوی حیاتی جینیات دان (Biogeneticist) جیمز ڈیل ایک تحقیقی



اردو ڈائجسٹ 86

دورے پہ افریقا پہنچا۔ وہ اس براعظم میں تین ماہ مقیم رہا۔ اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ براعظم میں ہر سال بقیہ تاسات لاکھ بچے اندھے ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ انہیں غذا کے ذریعے مطلوبہ وٹامن اے نہیں مل پاتا جو آنکھوں کو صحت مند رکھتا ہے۔

جیمز ڈیل ایک ہمدرد اور رحم دل انسان ہیں۔ وہ سوچنے لگے کہ لاکھوں افریقی بچوں کو بینائی جیسی عظیم نعمت کھونے کے شدید نقصان سے کیونکر بچایا جائے؟ غور و فکر کے بعد ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی گئی۔

آسٹریلوی محقق نے افریقا میں دوران قیام دیکھا تھا کہ اکثر افریقی ممالک میں کیلا بہت کھایا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں روٹی، امریکا میں آلو اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں چاول ذوق و شوق سے کھائے جاتے ہیں، اسی طرح کئی افریقی ملکوں میں کیلا سن بھانا کھیا جاتا ہے۔

جیمز ڈیل کے ذہن میں یہ خیال آیا، کیوں نہ ایسا کیلا اگایا جائے جس میں قدرتی طور پر وٹامن اے موجود ہو۔ کیلے کے پودے میں جینیاتی تبدیلیاں لا کر ایسا ”سپر کیلا“ تخلیق کرنا ممکن تھا۔ لیکن تحقیق کی خاطر درکار لاکھوں ڈالر کہاں سے آتے؟

آخر جیمز ڈیل نے مشہور فلاحی تنظیم، بل اینڈ ملینڈا ٹینیس فاؤنڈیشن سے رابطہ کیا اور متعلقہ افسروں کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔ وہ انہیں پسند آیا۔ چنانچہ جیمز کو مطلوب رقم مل گئی۔ وہ پھر اپنی تحقیق پہ جت گیا۔

اس کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور وہ پچھلے سال کے اواخر میں وٹامن اے سے بھرپور کیلا تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کوئی فرد روزانہ ایسے صرف دو تین کیلے کھا لے، تو اسے مطلوبہ وٹامن اے مل جاتا ہے۔ یوں جیمز ڈیل کی انسان دوستی اور رحم دلی کے

جنوری 2015ء

باعث اب لاکھوں معذور افریقی بچے اندھے ہونے سے بچ سکیں گے۔

افریقا میں یہ پودے امداد باہمی کے نقطہ نظر سے تقسیم ہوں گے۔ یعنی ہر گاؤں کے معززین اس شرط پر ۱۰ تا ۲۰ کیلے کی اس نئی قسم کے پودے پائیں گے کہ وہ بیس نئی کوٹلیں دیگر دیہاتیوں میں تقسیم کریں گے۔

غربت سے بے پروا بھارتی حکمران طبقہ ۵ نومبر ۲۰۱۳ء کو بھارت نے سیارہ مریخ کے گرد گھومنے والا مصنوعی سیارہ، ”مکلائن بھوایا“ تو بھارتیوں نے خوشی کے شادیاں بجاائے اور اسے بہت بڑی کامیابی قرار دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ مصنوعی سیارہ مریخ کے گرد چکر لگاتے ہوئے کیا کام انجام دے گا؟ اس نے محض مریخ کی آب و ہوا کا مطالعہ کرنا ہے۔

امریکی اور روسی مصنوعی سیارے برسوں قبل مریخ کی آب و ہوا سے متعلق سارا ڈیٹا حاصل کر چکے جو عام دستیاب ہے۔ لہذا چالیس کروڑ غریبوں والے ملک نے ساڑھے سات کروڑ ڈالر (ساڑھے سات ارب روپے) کا سیارہ بنا کر کون سا تیر مارا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ بھارتی بھر کم رقم نئے اسکول اور اسپتال بنانے پر خرچ کی جاتی۔

حفاظت سے عیاں ہے کہ بھارتی حکمران طبقہ اپنے دلہن میں آباد کروڑوں غریبوں کی حالت زار سدھارنا ہی نہیں چاہتا..... اسے بس یہ فکر و امن گیر ہے کہ اقوام عالم میں اس کا بول بالا ہو جائے اور بھارت کو انجرتی سپر پاور کے طور پر دیکھا جائے۔ اسی لیے اربوں روپے خرچ کر بیچارے مصنوعی سیارہ خلا میں بھجوا دیا گیا تاکہ بھارت مریخ پر سیٹلائٹ بھجوانے والا پہلا ملک بن سکے۔

یہ ممکن ہے کہ مصنوعی سیارے بھجوا کر بھارتی

اردو ڈائجسٹ 87

سائنس دانوں کو اتنا تجربہ ہو جائے کہ وہ مستقبل میں لیزر چھوڑنے والے سیٹلائٹ ایجاد کر سکیں۔ تب یہ پاکستان کے لیے نشوونما ناک بات ہوگی۔ کیونکہ اس وقت ہمارے ایٹمی ہتھیار بے اثر ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا طاقتور پڑوسی کھلے عام ہم سے جنگ کرتے ہوئے کھڑا ہے۔ بھارتی حکمران طبقے کو علم ہے کہ ایٹمی جنگ کی صورت میں کم از کم آدھا بھارت بھی تباہ ہو جائے گا۔

جو مرضی چھاپ لو

۲۰۱۳ء میں بھی تھری ڈی پرنٹنگ کی سائنس تیز رفتاری سے ترقی کرتی رہی۔ بتدریج تھری ڈی پرنٹر ایسی جاوئی مشینیں میں ڈھل رہا ہے جس سے ہر مردہ یا زندہ شے بنائی جاسکے۔ جی ہاں، پچھلے سال ڈاکٹر تھری ڈی پرنٹنگ کی مدد سے انسانی اعضا تیار کرنے میں کامیاب ہو چکے۔

تھری ڈی پرنٹر دیکھنے بھالنے میں عام پرنٹر جیسا ہے، لیکن اس سے پلاسٹک یا دیگر مادوں کی مدد سے ہزار ہا اشیا تخلیق کرنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر امریکا میں اب بچے سائنسی تجربات میں استعمال ہونے والی اشیا پرنٹر سے بنائے ہیں۔ حتیٰ کہ کاریں، ہوائی جہاز اور ٹینک بنانے والی کمپنیاں بہتر سے بہتر پرنٹر جات بنانے کی خاطر تھری ڈی پرنٹنگ سے مدد لے رہی ہیں۔ اب تو ایسے پرنٹر بھی تیاری کے مراحل میں ہیں جن میں مطلوبہ سامان ڈالو اور گرما گرم کمانا تیار!

سائنسی ترقی کی محیر العقول رفتار جاری رہی تو وہ وقت آسکتا ہے جب انسان اپنی جیسی دماغی و جسمانی صلاحیتیں رکھنے والی مشین تیار کر لے۔

جنوری 2015ء

ملاقاتیوں کی تعداد معین نہیں، مگر ان میں

میرے سے چند ملاقاتی ایسے ہیں، جن کے بارے میں وہ رہ کر مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ یا کاش اب ان سے میری راہ و رسم منقطع ہو جائے۔ یہ ضرور ہے، پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملوں، تو علوانا کہہ دیتا ہوں "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

لیکن یہ جملہ بالکل رکی ہے۔ مستحی و مشہوم اور اہمیت پر غور کیے بغیر یہ خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جملے سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی



اردو ڈائجسٹ

89

جنوری 2015ء

مجھے باتونیوں سے بچاؤ

باتونی دوستوں سے عاجز آئے کی وہائی

سنانے کے مرض میں مبتلا مریضوں کی تہمتیہ بارداستان جو دوسروں کا دماغ چاٹنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے

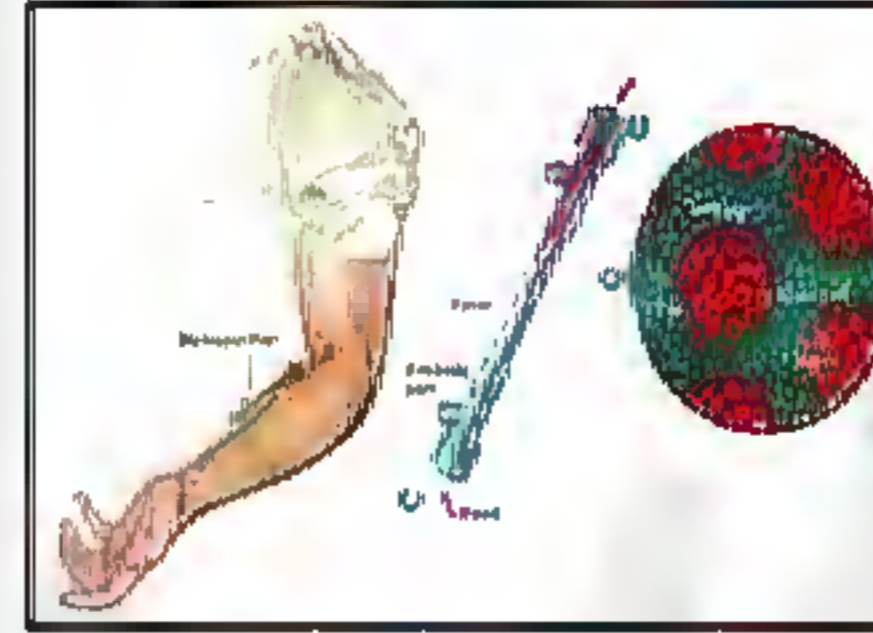
ابراہیم جلیس



ایبولا سے محفوظ رکھنے والا فلٹرز

جنی نوع انسان پر ماضی و حال میں کئی خطرناک بیماریاں حملہ آور ہو چکیں۔ ان میں ایبولا وائرس کا مرض اپنی تیزی کے باعث خوفناک و منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ایبولا وائرس چند دنوں میں اپنے اتنے زیادہ بچے بالے پیدا کرتا ہے کہ وہ انسانی جسم میں تباہی مچا دیتے ہیں۔ انسان پھر دیکھتے ہی دیکھتے پیٹ پیٹ ہو جاتا ہے۔

ایبولا کا موثر مقابلہ کرنے کے لیے امریکی کمپنی، اسٹھلون میڈیکل نے "ہیموپوری فائبر (Hemopurifier) نامی آلہ ایجاد کر لیا۔ نکل نما یہ آلہ ڈیلاسیر مشین سے جوڑا جاتا ہے۔ اس آلے میں لیکٹس (پروٹین) سے بنا فلٹرز نصب ہے۔ وہ انسانی جسم میں گھومتے پھرتے ایبولا وائرس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یوں وائرسوں کی تعداد کم ہونے پر انسانی جسم



تندرست ہونے لگتا ہے۔

ہیموپوری فائبر اب امریکا میں ایبولا مرض کے خلاف کامیابی سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی مدد سے دیگر امراض مثلاً ایڈز یا سرطان کے وائرس بھی انسانی جسم سے نکالے جاسکتے ہیں۔ گویا اسٹھلون میڈیکل نے خطرناک بیماریوں سے مقابلے کی خاطر ایک موثر ہتھیار ایجاد کر لیا۔

اردو ڈائجسٹ

88

جنوری 2015ء

گوناگون زبانوں کی گئی

ہر کوئی اشاروں کی زبان نہیں سمجھتا، اس لیے دنیا بھر میں ہزار ہا گونگے بولنے والوں کو خاصی مشکل سے اپنی بات سمجھا پاتے ہیں۔ وہ کبھی لکھ کر اور کبھی اشاروں میں اپنی بات کرتے ہیں۔ اب ایک امریکی کمپنی، موٹن سیوے (Motionsavvy) ان کی



مشکل آسان کرنا چاہتی ہے۔

اکتوبر ۲۰۱۳ء میں کمپنی کے سائنس دانوں نے "موٹن سیوے یونی" نامی ایک آلہ ایجاد کر لیا۔ یہ آلہ ایک ٹیبلٹ حرکت نوٹ کرنے والے حساس (موٹن سینسنگ) کیمروں اور صوتی آلات پر مشتمل ہے۔

جب کوئی گونگا اس آلے کے سامنے اشاروں میں گفتگو کرے، تو کیمرے اسے ٹیبلٹ تک پہنچاتے ہیں تو اس کا پریسیس بات سمجھ کر اسپیکر کے ذریعے انہیں بول دیتا ہے۔ ضرورت پڑے تو اشاروں کی زبان تحریر بھی کرتا ہے۔ یہ آلہ قدرتنا گونگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اب وہ اس کی مدد سے کم از کم انگریزی بولنے والے کو باسانی اپنی بات سمجھا سکیں گے۔ اس آلے کی قیمت بھی کم ہے یعنی صرف ۱۹۸ ڈالر۔

اردو ڈائجسٹ

88

جنوری 2015ء

خوش ہوئی تھی۔ ویسے اب میں سچ سچ بتا دوں، اب تو ان ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے، ذرا ذہیت بن کر، ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں "مسا حیان! میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوئی تھی اور نہ اب ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے معاف کیجیے اور خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیے۔"

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں، شاید میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرات نہیں جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک (پنہنہروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر) کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی۔ اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرات کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی اخلاقی بزدلی کو حاصل ہے۔ اخلاقی بزدلی کے لیے دل ٹردے کی ضرورت نہیں، البتہ اخلاقی جرات رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ چونکہ میرے دل گردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً ہی آسان بھی ہوں، اس لیے مجھ میں اخلاقی جرات پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے کھٹکے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر ازراہ انصاف آپ فرمائیے، سید شاہ ضیاء الحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے؟ مجھے اپنے دوست محمد ریاض پر بے حد غصہ آتا ہے جس نے سید شاہ ضیاء الحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی خن سازی نہیں، بلکہ کھلی

حقیقت ہے کہ جس دن بھی سید شاہ ضیاء الحسن سے کسی شخص کا تعارف ہو، وہ اس شخص کے لیے یقیناً ایک منحوس دن ہو گا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس دن کے علاوہ روز منحوس گھنٹوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے کیونکہ سید ضیاء الحسن روز بروز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اس سے دور بھاگوں، وہ اتنی ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے۔ مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے شکست مان کر مجبوراً منہ کھول مسکرانا پڑتا ہے، اور پھر میں پوچھتا ہوں:

"اورد! سید شاہ ضیاء الحسن صاحب۔ کیسے مزاج تو اچھے ہیں؟" اب پھر کچھ نہ پوچھیے، سید شاہ ضیاء الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے، تو گھنٹوں چلتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آپ بیٹھیے اور اپنے مہر و ضبط کا امتحان دیتے رہیے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہی ہوگی، سید شاہ ضیاء الحسن کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ دو تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کر سکتا ہے اور سننے والے چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں، تو یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ جیسی تو لوگ اپنے زخم دیکھنے کے بجائے ہمد تن گوش ہو کر بڑے انتہاک سے اس کی باتیں سنتے ہیں۔ وہ کبھی یہ جانتے یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتے گا کہ آپ کس سوڈ میں ہیں۔ وہ اس کی کبھی پروا نہیں کرے گا کہ آپ کو بخار اور درد دسر ہے، یا آپ اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اسے تو بس یہ خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا دلچسپ، باتوئی یا بکھلی آدمی ہے۔ اسی لیے باتیں شروع کر دیتا ہے، ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل باتیں..... غور دیکھنے پر بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مخاطب کا دماغ چاٹ رہا ہے۔

میں مانتا ہوں انسان کے خلق میں زبان اسی لیے جڑی لگی ہے کہ وہ باتیں کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا برابر بھی ہاک نہیں کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاء الحسن جب کبھی ملے، تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتا ہے، "نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں، بس ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے دو ایک منٹ کے لیے باتیں کرنا چلوں۔"

اب سنیے موصوف کی دو ایک منٹ کی باتیں: "ارے بھئی! کچھ سنا تم نے۔ ابھی ابھی ایک بڑا فسوس ناک واقعہ ہوا۔ وہ موہن لال سے نا، چلتی موٹر سے گر پڑا۔ پچارے کو بڑی سخت چوٹ آئی۔"

میں پوچھتا ہوں "کون موہن لال؟" وہ حیرت سے کہتا ہے "ارے موہن لال کو نہیں جانتے۔ ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے، تم اس سے کبھی ملے ہی نہیں۔ موہن لال

بے چارہ ایک بڑا پیارا دوست ہے۔ ڈپٹی ڈائرنسٹ کا بھانجا۔ بڑا دلچسپ ہنس مکھ..... بالکل ڈپٹی ڈائرنسٹ کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل ہے۔ ڈپٹی ڈائرنسٹ کی کیا تعریف کی جائے۔ ابھی ابھی پنجلی جولائی میں وہ سوہ گباش ہوئے ہیں۔ بڑی حسرت ناک موت تھی۔ ہاں اس حسرت ناک موت پر خوب یاد آیا۔ وہ بے چارہ امر الدین بھی تو مر گیا۔ اس کی موت بھی بڑی درد ناک تھی۔ قمر الدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے۔ بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ارے ہاں بھئی! تمہارے چھوٹے بچے کا مزاج اب کیسا ہے! کون سے ڈاکٹر کا علاج کرا رہے ہو۔ آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر ہے ہی نہیں، سب نیم حکیم خطرہ

جان ہیں۔ اب تو یاد میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں اور کان پڑھانے والے بھی ڈاکٹر۔

اس پر ایک بات یاد آگئی۔ ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے، انھوں نے استعفا دیا ہے۔ بڑا خودار آدمی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی خودار آدمی دیکھے ہیں: ایک ڈاکٹر فاروق حسین، دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ۔ تم نے محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سنا ہو گا۔ ایک بار انھوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ رئیس نے دکان کے باہر ہی سے سوٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعوت سے کہا "اے میاں طبلے والے، ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے۔"

محمد قاسم خودار آدمی تھا، اس نے ویسے ہی دکان میں بیٹھے بیٹھے کہا "غرض پڑی ہے تو موٹر سے اتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناچو۔" یہ ہے خوداری! تجارت کرنا ہے،

آزاد پیشہ آدمی ہے۔ وہ بھلا کسی رئیس کا دتیل کیوں ہو۔ وہ تو اس وقت..... ارے بھائی جلیس اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اہاں یار بیٹھو..... کہا جا رہے ہو۔ بیٹھو بھئی بیٹھو۔" مگر میں نے کہا "مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔ معاف کرنا ضیاء الحسن میں محمد قاسم طبلہ کی داستان خوداری پوری طرح نہ سن سکا۔ مگر کیا کروں، مجبور ہوں، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ان صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ اب گیارہ بجتے ہیں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔"

اس کے بعد میں سر پر پاؤں رکھ کر بجا گتا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب

باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا برابر بھی ہاک نہیں کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

سے ملنا ہے۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے زخمی موہن لال یا ان کے خوش مذاق، زندہ دل ماسوں، ڈپٹی دیانرائن آنجہانی یا چھوٹے چھوٹے بچوں والے مرحوم قمر الدین یا ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات اور خوددار طلبہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

موہن لال جسے میں جانتا تک نہیں، بھئی اگر موٹر سے گر پڑا تو میں کیا کروں؟ ڈپٹی دیانرائن بڑے خوش مذاق اور زندہ دل آدمی تھے، تو وہ ہوں گے۔ قمر الدین کی موت بڑی حسرت ناک تھی، تو بھئی اس کی موت میں میرا کیا دخل؟ ڈاکٹر فاروق حسین نے استفادے دیا، تو میرا کیا بگڑا۔ محمد قاسم طلبہ والے اگر خوددار ہیں تو ہوا کریں، مجھے تو ان سے طلبہ درست نہیں کرانا۔

مجھے صرف ضیاء الحسن ہی سے شکایت نہیں بلکہ اس کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے۔ میرا روئے سخن سگے یا رشتے کے بھائیوں نہیں دماغ چاٹ لوگوں کی طرف ہے۔ دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار فنون لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔

سید شاہ ضیاء الحسن کے ایک ہم پیشہ بھائی، ابوالفضل کسی تحصیل کے پیش کار ہیں۔ اپنی کسی نہ کسی کارروائی کے سلسلے میں ہر اشوارے پندرہواڑے شہر آتے ہیں۔ جب بھی مجھ سے ملیں، تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں: "میاں تم کب آئے؟"

میں جواب دیتا ہوں۔ "جی میں تو یہیں ہوں۔ عرصے سے یہاں رہتا ہوں۔ پانچ سال سے کسی چھوٹے سفر پر بھی نہیں گیا۔"

وہ فرماتے ہیں: "اوہ! وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو بھئی میں ہیں۔"

میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بھینی میں

نہیں۔ وہ مصر ہو جاتے ہیں۔" ارے کوئی تھے نا میاں تمہارے بھئی میں؟"

اب میں ان سے کس طرح بحث کروں، اس لیے جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ "اچھا آپ عابد حسین کا پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بھئی میں فلم ایکٹر بن گئے۔" (حالانکہ عابد حسین تو سبیں ہیں اور ایک دفتر میں مازم)

وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں "ہاں، میں نے کہا تھا نا۔ اچھا اب کیا کر رہے ہیں۔"

جی تو چاہتا ہے کہہ دوں، جھک مار رہا ہوں، مگر وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں۔ اس لیے جواب دیتا ہوں..... "جی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔"

فرماتے ہیں: "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا، آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے؟"

ایسے سوال کے بعد اپنا اور ان کا جی ایک کر دینے کو چاہتا ہے۔ مگر انسان بندہ مجبور ہے اور وہ نہ صرف تحصیل کے پیش کار بلکہ میرے بزرگوں کے ملنے چلنے والے ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں، تو یہی سوالات ہر مرتبہ دہراتے اور دو تین گھنٹے تک برابر دماغ چاٹتے رہتے۔ مگر پرسوں میں نے انھیں چکمد دیا۔ وہ شہر آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آگئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا، مجھے دیکھ کر پکارا

"میاں! ارے ٹھہرو، ٹھہرو بات تو سنو۔"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کیے اور نام پٹی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے منظم جا ہی مارکیٹ جانا تھا۔

ضیاء الحسن کے تیسرے برادر طریقت، ہمارے ایک بڑی بزرگ اور محکمہ مال گزرائی کے پنشن یافتہ منتظم ہیں۔ انھیں بڑھاپے کی وجہ سے جلد نیند نہیں آتی۔ اسی لیے بے خوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گزارتے ہیں۔ روزانہ رات کو کھانے کے بعد آجاتے اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے "سناؤ بابا! آج اخبار میں کیا لکھا ہے؟"

میں کوئی حافظہ اخبار تو نہیں اس لیے عدا اخبار ان کی طرف بڑھا دیتا۔ مگر وہ اخبار جوں کا توں واپس کرتے ہوئے فرماتے "اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا۔ اس میں کیا رکھا ہے، کچھ تم ہی سناؤ۔ اسٹائن ہندوستان پر کب ہلے بولنے والا ہے؟"

میرا ارادہ ہے، کسی دن جب میرے صبر و تحمل کا پیالہ چھلک جائے گا، تو ان سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ قبلہ، نہ تو اسٹائن کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کہ میں آپ کے

ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا آموختہ پڑھوں۔ آپ پنشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے، تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنگتے رہیے، میرا جوان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔

سعدت مندی سے اللہ ناجائز فائدہ تو نہ اٹھائیے۔ ضیاء الحسن کے ایک چوتھے ہم مشرف آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انھیں ہرفن مولا کہتے ہیں۔ مگر انھوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ ایک بہت

اچھے شاعر، افسانہ نگار، مصور، گوے اور لطیفہ گو ہیں۔ ٹیبل تریگ بھی بہت اچھا بجاتے ہیں۔ آج کل تاج بھی سیکھ رہے ہیں۔ مگر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ "سنانے کے مرض" میں مبتلا ہیں۔

جب کبھی میں انھیں نظر جاؤں، بس ہل کر زبردستی موٹر میں بٹھا سیدھا گھر لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے چائے پی کر نازہ دم ہو جاؤ۔ چائے پی کر فارغ ہی ہونا ہوں کہ وہ اپنی تلیم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ مجبوراً بات بے بات واہ وا کرتا ہوں، پندرہ بیس منگولیات کا اسٹاک ختم ہو گیا، تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا ٹھیل لے آئے۔ اب افسانے شروع ہوتے ہیں،

رومانوی، سیاق، تاریخی اور جاسوسی افسانے۔

دو بج گئے، اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے بھی اپنی نگارشات اور ان کی شان نزول زیر بحث آتی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد بچے

کچھ مقالے، تقریریں، اقتباسات، ڈائری، کچھ بڑے لوگوں کے خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے۔ لیجیے اب پانچ بج گئے اور شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ منتظم کے سے وزنی پروگراموں کے لیے موزوں نہیں، لہذا لطیفہ گوئی اور بیت بازی شروع ہو گئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا کھاتے کھانے ٹیبل ناک ہوتی ہے اور نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے مگر اس پر بھی مصوری کے شاہکار دکھانے لگے۔

"یہ تاج محل ہے، یہ گلستان ہے، یہ نسیم جونیر کی

آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے، تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنگتے رہیے، میرا جوان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔

تاریخ پاکستان کا ایک سنسنی خیز باب

سروس سپریم کورٹ نے پرنسپل سٹریٹ اور آصف زرداری کو مجرم ٹھہرایا

اس سلسلہ کرپشن کی حیران کن روداد جو سابقہ حکمران جوڑے نے اپنے دور حکمرانی میں طمطراق سے اپنایا اور قومی خزانے کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اپنی تجوریوں اور لوٹوں سے بھرتا رہا

سوس عدالتوں میں چلتے مقدمات کی حیرت افزا کہانی

رخسانہ فضل



جنوری 2015ء

اردو ڈائجسٹ 95

وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔ اپنے کاروباری جدول پر پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے لے کر لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے:

”بھئی تم علم و ادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بناؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ دلائی کپڑوں کی بھی تجارت کروں؟“

”کیا چھوٹے لڑکے کو گھر جا کے اسکول بھیج دوں؟ یا اپنے سرکاری مدرسہ ہی میں شریک کراؤں؟“

”کیا راج پھوڑے کا آپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی لکھا تار ہوں؟“

”کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے پنڈولوں یا لکڑی کی جالی ٹھوکھادوں؟“

”کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان لکھاؤں؟“

فرض رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے اور کوئی نہ کوئی صلاح مشورے کرنے ضرور آتے ہیں۔ محض اس لیے کہ میں بقول ان کے علم و ادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مفز خدادہ ضیاء الحسن، پیش کار تحصیل، پڑوسی بزرگ، آرٹسٹ اور... خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے۔ اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرائنا چاہیے یا نہیں۔ اس لیے اب مجھے معاف کیجیے اور اجازت دیجیے۔ خدا حافظ!

جنوری 2015ء

تصویر ہے۔ یہ ایک لڑکی ہے جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے۔ میری یہ تین دوے کی تصویر دیکھو۔ اب کے سال بمبئی کی آرٹ ایگزیشن میں بھیجی جانے والی ہے۔“

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ اب سو بھئی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ پھر صبح کے پانچ بج گئے۔ اب بلبل ترنگ میں بھیرویں گانے لگے۔ یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب کسی ناپے سے سرخ بول پڑا۔ پھر ایک مسجد سے مؤذن کی اذان گونگی۔

فرمایا: ”دیکھا تم نے، آرٹسٹ کو گردشِ شام و سحر کی کوئی خیر نہیں ہوتی۔ اسے تمہاری آنکھیں الال ہو رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا عشق کا نظارہ کروں۔“

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ مگر شاید میں سو سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں، میرے سر میں جتنا کچھ مفز تھا، آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اب مجھے یہ کرنا چاہیے کہ جب بھی دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے، تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو نصیحت کر آؤں کہ شاید اب ملاقات نہ ہو سکے۔ یا پھر میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو۔ ظاہر بات ہے، جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے تو گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہوگی۔

ضیاء الحسن کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں۔ بچپن میں میرے ساتھ پرائمری جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد اپنے بابا کی کپڑے کی دکان پر بیٹھ گئے۔ پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی اے پاس کر لیا۔ اس کا رام کشن جی کو بھی پتا چل گیا۔

اردو ڈائجسٹ 94

کارل

کراؤس (Karl Kraus) آسٹریا کے ممتاز اریب و شاعر گزرے ہیں۔ ان کا چشم کشا قول ہے: ”پروسیٹوشن (عصمت فروشی) سے بھی زیادہ خطرناک کرپشن ہے۔ کیونکہ پروسیٹوشن چند افراد کا اخلاق خطرے میں ڈالتی ہے جبکہ کرپشن پوری قوم کا اخلاق تباہ کر دیتی ہے۔“ یہ بات سولہ آنے سچ ہے۔

اب پاکستانی قوم ہی کو دیکھیے۔ ۱۹۴۷ء میں زمینوں اور مکانوں کی الاٹمنٹ کے دوران لالچ و ہوس کے بطن سے جس کرپشن نے جنم لیا، وہ پاکستان میں پھلتی پھولتی چلی گئی حتیٰ کہ سرکاری دفاتر میں عام ہو گئی۔ تاہم ایک بات قابل ذکر ہے۔ ہمارے آئین حکمران اور سرکاری افسر ممکن ہے، نا اہل ہوں، مگر وہ روپے پیسے کے زیادہ رسیا نہیں تھے۔ زر کی کرپشن ۱۹۸۸ء سے شروع ہوئی جب وطن عزیز میں بے نظیر بھٹو کی پہلی ”عوامی“ اور ”جمہوری“ حکومت نے جنم لیا۔ اس سیاسی حکومت نے حکومتی نظام میں کرپشن کو بڑے منظم انداز میں رائج کر دیا۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں، اس کا ثبوت پچھلے دنوں سامنے آچکا۔

اکتوبر ۲۰۱۳ء میں سوئزر لینڈ کے سپریم کورٹ نے قرار دیا ہے کہ ۱۹۹۷ء میں مقامی پولیس نے ایک سوئس بینک اکاؤنٹ سے زیورات کا جو سیٹ قبضے میں لیا تھا، وہ بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری اور ان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ زیورات دراصل حکومت پاکستان کے ایک مقدمے سے منسلک ہیں جو اس نے ۱۹۹۷ء میں نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے خلاف دائر کیا تھا۔ اس مقدمے کی عبرت انگیز داستان عیاں کرتی ہے کہ جب انسان کو اقتدار مل جائے، تو وہ

یہ ۱۹۹۰ء کے اوائل کی بات ہے، بے نظیر بھٹو حکومت نے کسٹم کی جیبوں پر درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال اور نگرانی کے لیے ایک سوئس کمپنی، کوئٹینا (Cotecna) کی خدمات حاصل کیں۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ سوئس کمپنی نے برسر اقتدار حکومت کو رشوت دے کر جانچ پڑتال کا معاہدہ منظور کرایا تھا۔

بھٹو حکومت نے اسے رشوت نہیں کمیشن کا نام دیا اور اسے وصول کرنے کی خاطر ”جدید“ طریقہ اپنایا گیا۔ یہ کہ اپنے وکیل، جینز سلیمک (Jens Schlegelmich) کی وساطت سے برٹس ورجن آئی لینڈ میں ایک جعلی کمپنی، بنام مارینسن سیکورٹیز (Mariston Securities Inc) کھول لی۔

قانون کے مطابق اس کمپنی کی مالک بیگم نصرت بھٹو تھیں۔ کمپنی کے نام سے ایک سوئس بینک (برکلے سوی) میں اکاؤنٹ کھولا گیا۔ اس اکاؤنٹ کی رقم کو بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری بھی استعمال کر سکتے تھے۔

سوئزر لینڈ سے تعلق رکھنے والا وکیل جینز سلیمک بھٹو خاندان کا پرانا واقف کار تھا۔ ۱۹۷۹ء میں مقتول ذوالفقار علی بھٹو کے بیٹوں نے پہلی بار اس سے رابطہ کیا۔ تب وہ اپنی ماں (بیگم نصرت بھٹو) کے لیے سوئزر لینڈ میں اقامتی اجازت نامہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بعد ازاں دسمبر ۱۹۸۷ء میں سوئس وکیل کی ملاقات آصف علی زرداری سے ہوئی جو بے نظیر بھٹو کے دولہا بن چکے تھے۔

کوئٹینا نے ”معاہدے“ کے مطابق بارہ لاکھ ڈالر

پیشن کمیشن بھٹو خاندان کی جعلی کمپنی کے سوئس اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا۔ جب صدر غلام اسحاق خان نے کرپشن کے الزامات پر بے نظیر بھٹو حکومت برطرف کی، تو جلد ہی کوئٹینا سے معاہدہ بھی ختم کر دیا گیا۔ مرحومہ کے اسی پہلے دور حکومت میں آصف علی زرداری ”اسٹریٹن پرسنٹ“ کے عرف سے عوام و خواص میں مشہور ہوئے۔

لوٹ مار کا نیا معاہدہ

حکومت پاکستان پھر درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال کے لیے کسی معیاری عالمی کمپنی کو تلاش کرنے لگی۔ اس سلسلے میں نینڈر بھی جاری کیے گئے۔ اس میں سوئزر لینڈ ہی کی ایک کمپنی، ایس جی ایس (Societe Generale de Surveillance) نے بھی بولی دی۔ یہ کمپنی بھی انسپکشن، ویری فیکشن، ڈیسٹنگ اور سرنی فیکشن کی خدمات انجام دیتی ہے۔

ایس جی ایس سے گفت و شنید چل رہی تھی کہ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں بے نظیر بھٹو

دوسری بار وزیر اعظم بن گئیں۔ اب ایس جی ایس نے کنٹریکٹ لینے کی خاطر زرداری بھٹو خاندان کو ”کمیشن“ دینے کی ہامی بھرتی۔

اس زمانے میں بچون ایلکسل (Bjorn Axel) خطہ ایشیا میں ایس جی ایس کا منیجر تھا۔ اس نے انسران بالا کو یہ رپورٹ بھجوائی: ”اس وقت پاکستانی حکومت میں وزیر اعظم کے شوہر جو غیر سرکاری طور پر نائب وزیر اعظم ہیں، بہت اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔“

انھوں نے خال ہی میں بے نظیر بھٹو کی ماں (بیگم نصرت بھٹو) کو پی پی پی کی چیئر مین شپ سے نکلوایا ہے۔ یہ امر ان کی طاقنت عیاں کرتا ہے۔

پی پی پی حکومت میں آصف زرداری کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ ماٹھی میں ہمیشہ اپنے دوستوں اور کارندوں کی مدد کرتے رہے جن میں سے ایک کوئٹینا کا ایجنٹ تھا۔

درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال کا کنٹریکٹ حاصل کرنے کی دوڑ میں دونوں سوئس کمپنیاں شریک تھیں۔ جنوری ۱۹۹۳ء میں جنیوا میں صدر الدین آغا خان نے



کوئٹینا کمپنی کا ایک ملازم

آصف زرداری کے اعزاز میں ایک عشاء یہ دیا۔ اس میں جینز سلیمک بھی شریک تھا۔ اسی ملاقات میں یہ گفت و شنید ہوئی کہ درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال کا معاہدہ کس سوئس کمپنی کو دیا جائے۔

نائب وزیر اعظم پاکستان کی ہدایت پر ان کا دست راست، جینز کوئٹینا کے مالکوں سے ملا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ پاکستان ایک بڑا ملک ہے، لہذا وہ تنہا

دہاں سارے کام کو نہیں سنبھال سکتے۔ شاید تب تک بھٹو کا داغ دار ماضی مد نظر رکھ کر کوئٹہ اس سے نیا معاہدہ کرتے ہوئے ہنگامی رہی تھی۔

اسی دوران ایس جی ایس کا ڈائریکٹر آپریشنز، ہنزہ فٹرز، زرداری۔ بھٹو خاندان کے فرنٹ مین، جنرل سلیمان ملک سے ملا۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں دونوں کے مابین یہ سلسلہ "کمیشن" معاملات طے پا گئے

جون ۱۹۹۳ء میں یہ نئی پیش رفت ہوئی کہ ایس جی ایس نے کوئٹہ کمپنی کے بیشتر حصص خرید لیے۔ یوں وہ



جیتوا میں ایس جی ایس کا صدر دفتر

اس کی نئی مالک بن گئی۔ اس کے بعد پاکستان میں درآمدی اشیاء کی جانچ پڑتال و نگرانی کا کام دونوں کے مابین فنی و فنی تقسیم کر دیا گیا۔

"نذرانوں" کی رقم

بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت ختم ہونے تک دونوں سوئس کمپنیاں زرداری، بھٹو خاندان کو وٹا فوٹا لاکھوں ڈالر بطور "کمیشن" ادا کرتی رہیں۔ یہ گویا

کنٹریکٹ فراہم کرنے کا نذرانہ تھا۔

سوئس کمپنیوں سے نذرانہ وصول کرنے کی خاطر پاکستان کی ملکہ عالیہ اور بادشاہ سلامت نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ یعنی اپنے سوئس وکیل، جنرل صاحب کے توسط سے برٹش ورجن آئی لینڈ میں دو جعلی کمپنیاں کھول لیں۔

بومر فنانس کمپنی (Bomer Finance Inc) کے سربراہ آصف زرداری اور ان کی بیگم تھیں۔ جبکہ دوسری کمپنی، ناسام اوور سیز کمپنی (Nassam Overseas Inc) کا سربراہ صہم بھٹو کے خاندان، ناصر حسین کو بنایا گیا۔ ان دونوں کمپنیوں کے اکاؤنٹ مختلف سوئس بینکوں میں کھولے گئے۔ ایس جی ایس اور کوئٹہ انٹی اکاؤنٹس میں کمیشن کی رقم جمع کرائی رہی۔

حاصل کیے گئے "نذرانے" کی مجموعی رقم ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر بتائی جاتی ہے۔ حالیہ پاکستانی کرنسی کے مطابق یہ رقم سو ارب روپے سے زیادہ بنتی ہے۔ معاصرین کا دعویٰ ہے کہ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری نے دونوں ادوار حکومت میں کئی سرکاری منصوبے "نذرانے" لے کر پاکستانی اور غیر ملکی کمپنیوں کو دیے اور یوں خوب کمائی کی۔ اس ناجائز آمدن سے پاکستان و بیرون ممالک میں زرعی زمینیں، عالی شان فلپٹ و گھر، زیورات اور فارم وغیرہ خریدے گئے۔

نومبر ۱۹۹۶ء میں پی پی پی سے تعلق رکھنے والے صدر فاروق لغاری نے کرپشن کے الزامات پر بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت بھی ختم کر ڈالی۔ نئے عام انتخابات میں نواز شریف برسر اقتدار آئے۔ اب پاکستانی حکومت نے "احساب بیورو" تشکیل دیا، جو

اپنے کرپشن کیسوں کی کھوج لگانے لگا جو بے نظیر بھٹو حکومت کے دونوں ادوار میں سامنے آئے تھے۔

۸ ستمبر ۱۹۹۷ء کو حکومت پاکستان کی درخواست پر سوئٹزر لینڈ نے تمام سوئس بینکوں میں بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری اور بیگم نصرت بھٹو کے اکاؤنٹس منجمد کر دیے۔ خیال ہے کہ ان میں ہتھیے کروڑ ڈالر تک رقم موجود تھی۔ موجودہ حساب سے یہ رقم "تین ارب روپے" بنتی ہے۔

سوئس مقدمے کا آغاز

بعد ازاں احساب بیورو نے اپنی تفتیش کی دستاویز ایک سوئس عدالت میں پیش کیں جسے ہمارے ہاں کی ہائی کورٹ سمیت۔ ان کی بنیاد پر جون ۱۹۹۸ء میں جنرل سلیمان ملک، ایس جی ایس کے سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ اور کوئٹہ کے مینیجنگ ڈائریکٹر پر فرد جرم عائد کر دی گئی۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے حکومت پاکستان سے کنٹریکٹ حاصل کرنے کی خاطر حکمران ٹولے کو رشوت دی اور پھر اسے ادا کرنے کے لیے سنی لائڈنگ میں ٹوٹ رہے۔ اگلے ہی مہینے اس کیس کے سلسلے

میں آصف زرداری اور بے نظیر بھٹو پر بھی فرد جرم عائد کر دی گئی۔

اکتوبر ۱۹۹۸ء میں کوئٹہ اور ایس جی ایس کیس کے ضمن میں لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ چلنے لگا۔ اپریل ۱۹۹۹ء میں بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کی کمیشن لینے کے جرم میں مجرم قرار پائے۔ لاہور ہائی کورٹ نے انھیں پانچ سال قید کی سزا سنائی اور ۸۶ لاکھ ڈالر جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ بے نظیر بھٹو لندن جا چکی تھیں، آصف زرداری قید کر لیے گئے۔

اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اگلے ہی ماہ نئے پاکستانی حکمران نے "قومی دفتر احساب" کی بنیاد رکھی جو "نیب" کے نام سے معروف ہوا۔ اب اس نے ادارے سے منسلک وکلاء اندرون و بیرون ممالک کی عدالتوں میں بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف دائر مقدمے لڑنے لگے۔ ایک سوئس عدالت میں کوئٹہ اور ایس جی ایس سے متعلق کیس چلنے لگا۔

مزاملتی ہے

اگست ۲۰۰۳ء میں سوئس عدالت کے جج، ڈینیئل ڈیوڈ (Daniel Devaud) نے دونوں مرکزی



پاکستانی جوڑے کو سزا سنانے والا سوئس جج، ڈینیئل ڈیوڈ

لزمان کو مجرم قرار دے ڈالا۔ اس نے بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کو پچھتے ماہ کی معلق سزا (Suspended Sentence) سنائی۔ نیز سابق حکمران جوڑے کو حکم دیا کہ انھوں نے سوئس کمپنیوں سے جو کمیشن لیا، وہ پاکستان کے خزانے یعنی جائز و قانونی مقام پر جمع کرایا جائے۔ بے نظیر بھٹو نے یہ فیصلہ تسلیم نہیں کیا اور اس کے خلاف سوئس سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ ۲۰۰۵ء میں سوئس سپریم کورٹ نے ماتحت عدالت کا فیصلہ کا اہم قرار دے دیا۔ تاہم ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ معاملے کی تفتیش از سر نو کی جائے۔ چنانچہ

مشرف حکومت نے دو بارہ ماتحت سوئس عدالت سے رجوع کر لیا۔

سوئس تفتیش کار مقدمے کی چھان بین کر رہے تھے کہ پاکستان میں عدلیہ متحرک ہوگئی۔ چیف جسٹس افتخار حسین چودھری کی قیادت میں سپریم کورٹ نے بعض مقدمات میں حکومت کے خلاف فیصلے دیے۔ چنانچہ مارچ ۲۰۰۷ء میں جنرل مشرف نے زبردستی چیف جسٹس سے استعفیٰ لے لیا۔

جب جنرل مشرف برسر اقتدار آئے، تو انھوں نے بے نظیر بھٹو، آصف زرداری اور نواز شریف کو کرپٹ لیڈر قرار دیا تھا۔ لیکن جب دوران حکومت ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور عدلیہ نے جنرل صاحب پر گرفت کی، تو وہ حزب اختلاف کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرنے لگے۔ مدعا یہی تھا کہ اپنا اقتدار قائم رکھا جائے۔

این آراو کا پھٹا

چنانچہ اکتوبر ۲۰۰۷ء میں مشرف حکومت نے "این آراو" جاری کیا۔ اس صدارتی حکم نامے کے ذریعے ان تمام سیاست دانوں، سرکاری افسروں اور سیاسی کارکنوں کو "حالی مل گئی جن پر کرپشن، سیرا بھیری، فراڈ، قتل اور دہشت گردی وغیرہ کے سلسلے میں مقدمے چل رہے تھے۔ این آراو کے باعث بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف چلتے سبھی مقدمات میں حکومت نے پیروی کرنا چھوڑ دی۔

کولمبیا اور ایس جی ایس کیس کی تفتیش سوئس جج وینسٹ فورنیر (Vincent Fournier) کر رہا تھا۔ اس نے اکتوبر ۲۰۰۷ء میں چھان بین مکمل کر کے کیس پراسیکیوٹر، ڈینیئل زاپیلی (Daniel Zappelli) کے حوالے

کر دیا۔ اب ڈینیئل زاپیلی ہی نے مقدمہ متعلقہ عدالت کو سمجھواتا تھا۔

بجیب بات یہ ہے، ڈینیئل زاپیلی یہ راگ لاپنے لگا کہ این آراو کے بعد بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف مقدمہ نہیں چل سکتا..... کیونکہ پاکستانی حکومت سے انھیں معافی مل چکی۔ حیرت انگیز بات یہ کہ جب سپریم کورٹ پاکستان نے دسمبر ۲۰۰۹ء میں این آراو کا اعدام کر ڈالا، تو ڈینیئل زاپیلی نے پھر مقدمہ چلانے سے انکار کر دیا۔ اب اس کا استدلال تھا کہ صدر آصف زرداری کو بطور صدر اسٹیٹ حاصل ہے۔

اندرونی ذرائع کا کہنا ہے کہ سابق حکمران پاکستانی جوڑے نے ڈینیئل زاپیلی کو بھاری رقم بطور رشوت دے کر اپنا طرف دار بنا لیا۔ چنانچہ وہ ان پر مقدمہ چلانے سے گریز کرتا رہا۔ مزید برآں سوئٹزر لینڈ قومی خزانے کی لوٹ مار کرنے والے حکمرانوں اور آمروں کی جنت ہے۔ انہی کے دم قدم سے سوئس بینکاری کا کاروبار پھلتا پھولتا ہے۔ لہذا منافع بخش کاروبار کو مندرے سے بچانے کے لیے سوئس حکومت نے بھی زاپیلی پر دباؤ نہیں ڈالا۔

پی پی پی حکومت کا دباؤ

تاہم این آراو کے خاتمے سے نیب کی پاکستانی عدالتوں میں جاری کولمبیا اور ایس جی ایس کے مقدمے دوبارہ چلنے لگے۔ لیکن اب پی پی پی حکومت میں تھی لہذا نیب عدالتوں کے ججوں پر ہر ممکن طریقے سے اثر انداز ہونے کی سعی ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۳۰ جولائی ۲۰۱۱ء کو راولپنڈی نیب عدالت نمبر ۲ نے کولمبیا کیس میں موجود بے نظیر بھٹو، آصف زرداری اور دیگر ملزمان کو بری کر دیا۔ اسی طرح ۱۶ ستمبر ۲۰۱۱ء کو

راولپنڈی، یعنی کی احتساب عدالت نمبر ۳ کے فیصلے کی روشنی میں ایس جی ایس کیس میں بھی درج بالا ملزمان بے قصور قرار پائے۔

بعد ازاں نامور صحافیوں نے دونوں فیصلوں میں زبردست مشابہت ہونے کا اشارہ کیا۔ لگتا تھا کہ فیصلے "اوپر" سے موصول ہوئے، بس متعلقہ ججوں نے ان پر دستخط کر دیے۔ چونکہ دال میں کچھ کالا تھا، لہذا جون ۲۰۱۳ء میں لاہور ہائی کورٹ نے فیصلوں کی چھان بین کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی۔ یہ ٹیم فیصلے

مٹانے والے نیب کے دونوں ججوں، میاں الطاف حسین مہر اور جہاندار خان سے پوچھ سمجھ کرنے لگی۔ اس تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ ابھی صیفہ راز میں ہے۔

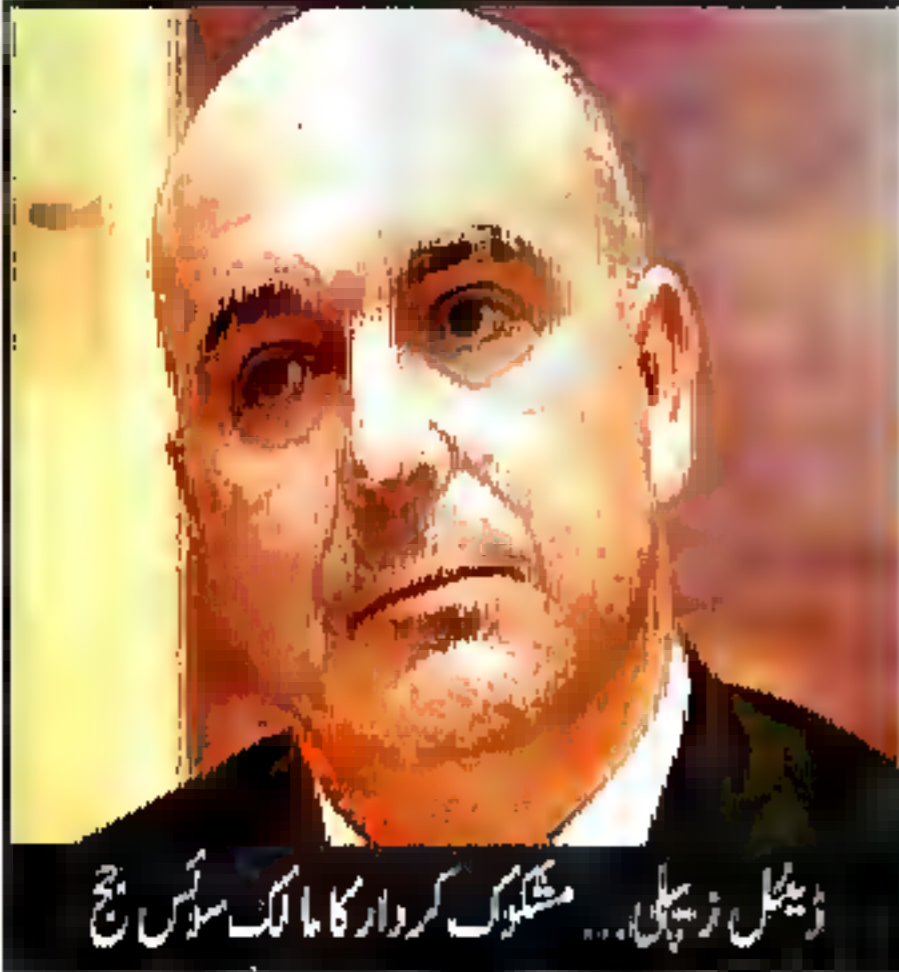
یاد رہے، این آراو کا اعدام کرنے کے بعد سپریم کورٹ نے حکومت پاکستان کو حکم دیا کہ سوئس

مقدمات دوبارہ کھلوانے کی خاطر سوئٹزر لینڈ خط لکھا جائے۔ مگر زرداری حکومت خط لکھنے میں لیت و لعل سے کام لیتی رہی۔ حتیٰ کہ صدر آصف زرداری نے اس معاملے میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو قربانی کا کبرا بنا دیا۔

ارہوں روپے ہر جانے کا دعویٰ سوئس کیسوں نے نومبر ۲۰۱۳ء میں نئی اور انوکھی کروٹ لی۔ کولمبیا اور ایس جی ایس کیسوں نے نواز

شریف حکومت کو یہ درخواست دی: نیب عدالتوں کے فیصلوں سے ثابت ہو گیا کہ کولمبیا اور ایس جی ایس پہ کرپشن کے لگائے گئے الزامات غلط تھے۔ چونکہ ان مقدمات سے دونوں کیسوں کی شہرت متاثر ہوئی، لہذا اب حکومت پاکستان انھیں ۳۲ ملین (تین کروڑ بیس لاکھ) ڈالر بطور ہرجانہ لدا کرے۔ تیز ۱۹۹۹ء سے اس رقم کا سود بھی دیا جائے (کہ اسی سال نیب نے مقدموں کا باقاعدہ آغاز کیا تھا)۔

گو یا یہ الٹا چور کو تو مال کو ڈانٹے والی بات ہوگئی۔ معلوم نہیں، نواز شریف حکومت نے سوئس کیسوں کو کیا جواب دیا، تاہم پچھلے دنوں سوئٹزر لینڈ سے ایک فیصلہ آ رہا ہے جو اس کا جھوٹا بن کر پاکستان آ رہا ہے۔



ڈینیئل زاپیلی... مشکوک کردار کا مالک سوئس جج

ہوئے یہ فیصلہ سنا یا کہ بومرفانس کمپنی کے ایک سوئس اکاؤنٹ سے برآمد شدہ زیورات بے نظیر بھٹو ہی کے ہیں۔ چونکہ وہ متوفی ہو چکیں، لہذا اب ان زیورات کے مالک آصف زرداری اور ان کی اولاد ہے۔

بے نظیر بھٹو نے ۱۹۹۵ء میں یہ زیورات لندن کے پوش علاقے، نائٹس برج میں واقع جوہری کی دکان سے یہ عوض ایک لاکھ سترہ ہزار پونڈ خریدے تھے۔ اس کا مل بومرفانس کمپنی کے سوئس اکاؤنٹ سے ادا کیا گیا۔ یہ زیورات ہیروں سے بنے ایک بارہ ایک بریلٹ



عمدہ کہانی، دکش اداکاری اور بہترین عکاسی والے

پاکستانی ڈراموں کی بھارت میں دھوم

ہمارے نجی ٹی وی چینل معیاری ڈرامے بنا کر نہ صرف مالی فائدہ پائیں گے بلکہ بھارت میں پاکستانی تہذیب و معاشرت کو بھی عام کر سکتے ہیں

عاصم محمود

نے ۱۹۷۵ء میں شعور سنبھالا، تو ٹی وی ڈرامے میں پاکستانیوں کے لیے ایک بڑی تفریح بن چکے تھے۔ اس زمانے میں پاکستان ٹیلی ویژن کا مولی بولتا تھا۔ چونکہ ٹیلی ویژن کم تھے، لہذا محلے میں جس گھر میں ٹی وی ہوتا، وہاں سرشام خصوصاً بچوں کا میلانگ جاتا۔ تب دوسروں کا لحاظ اور بھائی چارہ موجود تھا، اس لیے عموماً گھر میں محلے والوں کو خوش آمدید کہا جاتا۔

اس وقت پاکستانی ڈرامے سرحد پار بھی مقبول تھے۔ امرتسر میں ہندو اور سکھ اپنے انٹیٹیوں کا رخ پاکستان کی طرف کیے رکھتے تاکہ پاکستانی ڈرامے دیکھ سکیں۔ دلچسپ بات یہ کہ اس دور میں پاکستانی فلمیں زوال پذیر ہو چکی تھیں۔ اس لیے لاہور اور دیگر سرحدی شہروں کے پاکستانی خصوصاً ذہنوں میں ٹی وی انٹیٹیوں کا رخ بھارت کی طرف کرتے پائے جاتے۔ ان خصوصاً ذہنوں میں بھارتی فلمیں لگتی تھیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن اور بھارتی ٹی وی دور درشن کی بنیاد ۱۹۶۰ء کے عشرے میں رکھی گئی۔ تاہم چند ہی برس میں پاکستان ٹی وی اپنے سعاسر سے بہت آگے نکل گیا۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ٹی وی کے کرا



پُر لطف زندگی گزارنے کے سنبھالنے کے اصول

- زندگی "کچھ لو اور کچھ دو" کا نام ہے۔
- آپ کا "دینا، لینے" سے زیادہ ہونا چاہیے۔
- زندگی بہت مختصر ہے، اسے عداوتوں کے پیچھے ضائع نہ کریں۔
- تعریف کریں تو کھل کر کریں۔
- تنقید کرتے وقت مہیا نہ روی اختیار کریں۔
- جیسے آپ بیٹھا کچھل خریدتے ہیں۔ اسی طرح ہنسنے بول اپنائیں۔
- ہمیشہ اچھا شکون لیں اور لوگوں سے حسن ظن رکھیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ کامیابی کے راستے پر مزید آگے بڑھتے رہیں۔
- لوگوں کی باتوں کو توجہ اور خاموشی سے سنا سیکھیں۔ لوگ آپ کے قریب آجائیں گے۔
- یہ ذہانت نہیں کہ آپ بحث و مباحثے میں مد مقابل کو چت کر دیں۔ قابلیت یہ ہے کہ آپ سرے سے بحث ہی میں نہ پڑیں۔

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، دار برٹن)

روٹس ملک و قوم کے حق میں جاتی ہے؟

چند ماہ قبل وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے اگکشاف کیا تھا کہ پاکستانیوں نے "۲۰۰ ارب ڈالر" سوئزر لینڈ اور دیگر بیرونی ممالک کے بینکوں میں جمع کر رکھے ہیں۔ بالفرض ان میں سے ۶۰ ارب ڈالر بھی قومی خزانے سے لوٹی گئی رقم پر مشتمل ہیں، تو ان کی واپسی سے ہمارا سارا بیرونی قرضہ اتر سکتا ہے۔ لیکن یہ اربوں ڈالر واپس لانے کے لیے ایسی ایمان دار اور دلیر قیادت درکار ہے جو اپنی کرسی بچانے کی خاطر کوئی جوانہ کھیلے، حتیٰ کہ اقتدار ختم ہوتا دیکھ کر بھی سچائی و حق کا پرچم بلند کیے رکھے۔



(چوڑی)، ہندوں اور انگوٹھی پر مشتمل ہیں۔ ان زیورات کی موجودہ مالیت تقریباً نو کروڑ روپے ہے۔ سوئس سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ بھی کہا کہ ان زیورات کی اصل مالک حکومت پاکستان ہے۔ لہذا ایسے اقدامات کیے جا سکتے ہیں کہ انہیں پاکستان کے حوالے کیا جاسکے۔

ایمان دار اور دلیر قیادت

یہ فیصلہ بڑا چشم کشا اور یادگار ہے کیونکہ اس نے ثابت کر دیا، سابق حکمران پاکستانی جوڑے نے برٹش ورجن آئی لینڈ میں ایک جعلی کمپنی کھولی تاکہ سوئس بینک میں اس کے اکاؤنٹ کھل سکیں۔ بعد ازاں سوئس کمپنی، ایس جی ایس کیشن (رشوت) کی رقم اس اکاؤنٹ میں جمع کرائی رہی۔

مزید برآں کوئٹہ اور ایس جی ایس کمپنیوں کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہو گیا کہ وہ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے ساتھ کرپشن میں ملوث نہیں تھیں۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ سرگرمی سے سوئس عدالت میں مقدمے لڑے تاکہ نہ صرف زیورات واپس آئیں بلکہ منجمد سوئس اکاؤنٹس میں موجود اربوں روپے بھی واپس آ کر پاکستانی قوم کے کام آسکیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ شاید نواز شریف حکومت کی ایما پر پاکستانی میڈیا میں سوئس سپریم کورٹ کے فیصلے کو زیادہ نمایاں نہیں کیا گیا۔ دراصل ماہ نومبر میں جب فیصلے کا متعن حکومت پاکستان کو ملا، تو تحریک انصاف نے اس پر دھاوا بول رکھا تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے کی خاطر نواز شریف حکومت کو پنی پنی کی مدد درکار تھی۔ اسی لیے مقدمے کو نمایاں نہیں کیا گیا۔ کہ کہیں قائدین پنی پنی ناراض ہو جائیں۔ مگر کیا یہ

دھرتی نامور ادیب، شاعر اور دانش ور تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہر پروگرام اور ہر صورتی تکلیف کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ دوسری طرف دور درشن کا انتظام بھارتی سرکاری افسروں کے ہاتھوں میں تھا۔ چنانچہ بھارتی قومی ٹی وی حکومت کا بھونپو بن گیا۔ اس کے پروگرام حتیٰ کہ ڈرامے بھی پھیسے ہوتے کہ ان کی وساطت سے سرکاری پالیسی کا پروپیگنڈا کیا جاتا۔

چنانچہ جب پاکستان ٹیلی ویژن سے انکل عمرنی، شہزادی، الف نون، مسٹر جیدی، تعلیم بالغاں وغیرہ یادگار ڈرامے نشر ہو رہے تھے، تو دور درشن کی وجہ شہرت صرف ”چتر پاز“ (بھارتی فلموں کے گیتوں کا پروگرام) تھا یا پھر فلمیں، جو گاہے گاہے دکھائی جاتیں۔

پاکستانی ڈراموں اور دیگر پروگراموں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں اسلامی و شرقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ وہ اخلاق سے گری اور ناشائستہ حرکات سے مبرا ہوتے۔ ان میں مقامی تہذیب و ثقافت کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا جاتا۔ یوں پاکستان ٹی وی کے پروگرام تفریح بہم پہنچانے کے علاوہ ناظرین کو باشعور بھی بناتے۔ یہی دنیا بھر میں ٹی وی کا مقصد اور مثبت روپ بھی ہے۔

تبدیلی کا جہنم

۱۹۹۰ء کے بعد پاکستانی ڈرامے یکسانیت اور گرتے معیار کی وجہ سے بور ہونے لگے۔ دلچسپ بات یہ کہ اسی زمانے میں بھارت میں ایک نئے انقلاب نے جنم لیا۔ ہوا یہ کہ نجی شعبے نے ٹی وی چینل کھول لیے جن میں اشار پلس، زئی ٹی وی اور سونی سرپرست تھے۔

یہ نئے بھارتی ٹی وی چینل ایسے ڈرامے (سوپ سیریل) پیش کرنے لگے جن کی اتساہ روزانہ پیش ہوئیں۔ یہ ڈرامے ڈش کی وساطت سے پاکستانی طبقہ بالا میں خاصے مقبول ہوئے۔ حتیٰ کہ اشار پلس کے ڈراموں کا چرچا متوسط پاکستانی گھرانوں میں بھی ہونے

لگا۔ تاہم پاکستان میں بھارتی ڈراموں کی مشہوری مختصر عرصے ہی رہی۔

۲۰۰۲ء میں جنرل پرویز مشرف نے نجی شعبے کو ٹی وی چینل کھولنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اسی سال پہلا پرائیویٹ چینل، جیو انٹرنیشنل کام کرنے لگا۔ بعد ازاں ڈرامے اور تفریحی پروگرام پیش کرنے والے دیگر ٹی وی چینل بھی سامنے آئے جن میں اے آر وائی، ہم، الے پلس اور ایکسپریس شامل ہیں۔

ان پرائیویٹ ٹی وی چینلوں نے بہترین لکھیاریوں، ڈائریکٹروں، سیٹ ڈیزائنروں وغیرہ کی خدمات حاصل کیں اور انہیں عمدہ مشاہرہ دیا۔ غور و فکر اور دل لگا کر کام کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ نجی ٹی وی چینل نت نئے موضوعات پر اوجھے ڈرامے تخلیق کرنے لگے۔ یوں جو شائقین ڈرامے سے روٹھے تھے، وہ پھر اس صنف کی طرف آنے لگے۔

ادھر بھارت میں ڈراما اتنی زوال سے گزرا جس سے پاکستانی ڈراموں کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ اداکاری اور موضوعات میں یکسانیت آگئی۔ سینوں میں بھی جدت نہیں رہی۔ نتیجتاً شائقین معلوماتی و سائنسی پروگرام شوق سے دیکھنے لگے۔

بھارت میں مختلف طریقوں سے باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے کہ کس ٹی وی چینل کو کتنے ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ دراصل تحقیقی جائزے کو دیکھ کر ہی کاروباری ادارے فیصلہ کرتے ہیں، کس چینل کو اشتہار دیا جائے۔ چنانچہ ہر ملک میں ٹی وی چینلوں کے مابین ہر دم یہ مقابلہ جاری رہتا ہے کہ بہترین پروگرام بنا کر زیادہ سے زیادہ ناظرین اپنی طرف متوجہ کیے جائیں۔

زئی انٹرنیشنل انٹرپرائز لمیٹڈ ٹی وی چینلوں کی تعداد کے لحاظ سے بھارت کا دوسرا بڑا گروپ ہے۔ یہ

”۲۰۰۳ء ٹی وی چینلوں کا مالک ہے۔ ان میں زئی ٹی وی، زئی سینما، زئی سلام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پاکستانی ڈراموں پر نظر دو سال قبل کی بات ہے، زئی انٹرنیشنل گروپ کے چند ڈائریکٹروں نے اتفاق سے پرائیویٹ پاکستانی ٹی وی چینلوں کے تیار کردہ ڈرامے دیکھے۔ وہ انہیں اچھوتے پن اور تروتازگی کے باعث بہت پسند آئے۔ ان بھارتی ڈائریکٹروں نے پھر بورڈ میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی کہ جدید دور کے پاکستانی ڈرامے بھارت میں دکھائے جانے چاہئیں۔ اس تجویز کو سراہا گیا۔

چنانچہ گروپ کے بورڈ نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں اداکار اور ڈائریکٹر شامل تھے۔ انھوں نے سیکڑوں پاکستانی ڈرامے دیکھے اور ان کا معیار جانچتے رہے۔ آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستانی

ڈرامے اتنے زبردست اور عمدہ ہیں کہ انہیں بھارت میں دکھایا جاسکتا ہے۔

زئی گروپ کے ڈائریکٹروں کو بھی یقین تھا کہ مفرد پاکستانی ڈرامے لاکھوں ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔ چنانچہ انہیں دکھانے کے لیے ایک نیا ٹی وی چینل کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۳ جون ۲۰۱۳ء کو ”زئی زندگی“ کے نام سے ایک نیا بھارتی چینل کام کرنے لگا۔ اس کا نعرہ یا موٹو ہے: ”جوڑے دلوں کو“۔ گو اس چینل پر دیگر مالک کے

ڈرامے بھی ترجمہ کر کے دکھائے جائیں گے، مگر یہ بنیادی طور پر پاکستانی ڈرامے دکھانے کے لیے ہی شروع ہوا۔ لہذا اس کا نعرہ مثبت رخ رکھتا ہے۔ یقیناً بھارتی حکم ان طبقہ مسئلہ کشمیر حل کر دے اور پاکستان کے خلاف سازشیں نہ کرے، تو دونوں ملک مل کر معاشی طور پر بہت ترقی کر سکتے ہیں۔

”عمون ذرا“ پہلا ڈراما ہے جو زئی زندگی سے پیش ہوا۔ توقع کے مطابق اسے بھارتی ناظرین نے پسند کیا۔ بعد ازاں معروف پاکستانی ڈرامے مثلاً ہمسر، زندگی گلزار ہے، میرے قاتل میرے دلدار، میرے فیصلے وغیرہ نشر ہوئے، تو انھوں نے بھارت میں پھیل چا دی۔

زئی زندگی سے ہر ڈرامے کی ایک قسط روزانہ دکھائی جاتی ہے۔ جیسے بعض پاکستانی چینل بھی ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ ”زندگی گلزار



حشیرہ انصاری... چوتھے میرے پاس!

ہے“ چار پار اور ”ہمسر“ تین پار زئی زندگی سے دکھایا جا چکا۔ حتیٰ کہ بھارتی ناظرین نے ہمسر ڈرامے کی بیروٹن، خرد (ماہرہ خان) کو بھارت آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ماہرہ خان پڑوس میں گئیں، تو انہیں بہت پذیرائی ملی۔

ایک ہندو صحافی کا تبصرہ بھارت کے مشہور انگریزی اخبار، ”دی ہندو“ کی نمائندہ، نرہیا سبراہنم نے چار برس پاکستان میں گزارے۔ انھوں نے بھارت میں پاکستانی ڈراموں کی بے انتہا مقبولیت کے بعد ”دی ہندو“ میں ایک انگریزی مضمون ”Humsafar in the

Gulzar that South Asia might have been "تحریر کیا۔ اس مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے: پچھلے دن میں دفتر کی کیتین میں چائے پی رہی تھی کہ ایک ساتھی آئی۔ وہ بڑی جوشیلی لگ رہی تھی۔ کہنے لگی: "یار مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔ تم چار سال پاکستان میں رہی ہو نا؟"

میں نے منہ بنا کر کہا "ہاں، لوگ کہتے ہیں، وہ دنیا کا سب سے خطرناک دیس بن چکا۔"

مگر میری دوست کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بات کاٹ کر بولی "ارے تم نے "زندگی گلزار ہے" دیکھا ہے؟"

میں جانتی تھی کہ بھارت میں پاکستانی ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں۔ مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ میری پرچی لکھی سبلی ان کی اتنی دیوانی نکلے گی۔ وہ تو بلا رے کے ڈرامے کی تعریفیں کرنے لگی:

"موضوع... شاندار! کہانی... بہت خوب! اختصار... لا جواب! یہ بہترین خوبی ہے کیونکہ یہاں تو ڈرامے سالہا سال چلتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی ڈراما چند اقساط میں ختم! بلوسات... یار پاکستانی لڑکیاں شلوار نہیں میں کیا جدت لائیں ہیں۔ اداکاری... آف ائی فلمی! اداکار... خوبصورت اور دلکش۔" سبلی نے پھر مجھے یونیوب پر ایک تھپ کا لنک بھجوایا۔ یقین مانجیے، مجھے بھی ڈراما اتنا پسند آیا کہ میں نے اگلے دو ہفتوں میں ساری اقساط دیکھ ڈالیں۔ اب "ہمسفر" بھد شوق دیکھ رہی ہوں۔ یہ درست ہے کہ مسئلہ کشمیر، دہشت گردی اور دیگر مسائل کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے عوام آزادی سے کٹل مل نہیں سکتے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام کے کئی دکھ سکھ سائجے ہیں۔ مثال کے طور پر لوڈ شیڈنگ، نہانے کے عین درمیان پانی چلا جانا، بیٹے بیٹیوں کی شادی کے لیے والدین کا پریشان ہونا، ملازمت

ملاش کرنا وغیرہ۔ بھارتی اور پاکستانی ڈرامے دیکھ کر بھی ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔"

ڈراموں کی اہمیت

دور جدید میں ٹی وی کی عام دستیابی کے باعث ڈراما خیالات و نظریات، تہذیب و ثقافت اور اقدار و روایات کی ترویج کا موثر ذریعہ بن چکا۔ مثال کے طور پر ترک ڈراموں ہی کو لیجیے۔ یہ دنیا بھر خصوصاً اسلامی ممالک میں ذوق و شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہی کے ذریعے پاکستان، ایران، دنیا کے عرب میں گروٹوں نو جوان ترک تاریخ، تہذیب و معاشرت اور اقدار سے آگاہ ہوئے۔

اتاترک کے مذہب دشمن اقدامات کی وجہ سے ترک معاشرہ سیکولر ہو چکا۔ اس معاشرے کے غیر اسلامی خدو و خال اسی لیے ترک ڈراموں سے بھی جھٹکتے ہیں۔ اس خافی کے باوجود ترک ڈرامے اسلامی ممالک میں ترکوں کی عظمت رفتہ کی ادھاک بیٹھانے میں کامیاب رہے اور ترکی کو بہ حیثیت اجمرتی طاقت بھی نمایاں کر دیا۔

اب حال یہ ہے کہ ترک ڈرامے ترکی کی منافع بخش ایکسپورٹ بن چکے۔ ۲۰۱۳ء میں ترکوں نے تیرہ کروڑ ڈالر (تیرہ ارب روپے) کے ڈرامے درآمد کیے۔ ان میں سب سے مشہور "فخشم صدی" ہے جو ۳۳ ممالک میں دیکھا گیا۔

پاکستان میں یہ ڈراما "میرا سلطان" کے نام سے نشر ہوا۔ قیام پاکستان کے زمانے سے بھارتی فلمیں بھد شوق ہمارے ہاں دیکھی جا رہی ہیں۔ برٹے کی طرح یہ بھی منفی و مثبت پہلو رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ان فلموں کی وجہ سے بھارت میں نہ صرف اردو زندہ رہی بلکہ اس نے "عوامی بولی" کی خصوصی حیثیت حاصل کر لی۔ آج بھارتی فلموں کی وجہ سے تامل ناڈو، آسام اور کیرالہ جیسی دور دراز ریاستوں میں بھی اردو بولی دیکھی جاتی ہے۔

ہمارے لیے بھارتی فلموں کا منفی پہلو یہ ہے کہ ان

کی وجہ سے کئی ہندو نام پاکستانی نسل کی زبانوں پر چڑھ چکے مثلاً بھگوان کر پا کرے گا، رام جی، ہنومان کی ہے وغیرہ۔ قوش قسمتی سے یہ رجحان کچھ کم ہو چکا مگر پاکستان میں ہندو تہذیب و ثقافت کا پھیلاؤ دیکھ کر ہی سو نیا گاندھی خوشی سے کہہ آئی تھیں: "ہم نے اسلحے کے بغیر پاکستان فتح کر لیا۔" اب ہمارے پاس پاکستانی تہذیب و ثقافت اور اقدار بھارت میں متعارف کرانے اور پھیلانے کا سنہرا موقع ہے اور یہ کار نمایاں پاکستانی ڈراما انجام دینے کی بخوبی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب یہ کہ بھارت میں اردو کے اچھے ڈراما نگار موجود نہیں۔

چناں چہ بھارتی ڈراموں کی کہانی بہت کمزور ہوتی ہے۔ کمزور مکالموں کے باعث اداکاری بھی بے جان اور بوری رہتی ہے۔

دوسری سمت

پاکستان میں اب بھی کئی اچھے ڈراما نگار موجود ہیں۔ وہ پرکشش مکالموں اور متنوع نظریات سے مزین ڈرامائی کہانی تخلیق کرتے ہیں۔ بعد ازاں باصلاحیت ڈائریکٹر بہترین مکالموں کی بنیاد پر اداکاروں سے عمدہ اداکاری کراتے ہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ ڈراما پیش کرتے والے پاکستانی ٹی وی چینلوں میں مقابلہ جنم لے چکا۔ مقابلے کی فضا کا مثبت روپ یہ ہے کہ یوں ہر چینل خوب سے خوب ترکی جستجو کرتا اور بہترین ڈراما ناظرین کو دکھاتا ہے۔

عمدہ کہانی، بہترین اداکاری اور لا جواب ہدایت کاری کے باعث ہی پاکستانی ڈرامے بھارت میں پسند

کیے گئے۔ یوں بھارتی عوام کے سامنے پاکستان کا مثبت تاثر ابھرا اور انہیں معلوم ہوا کہ اس ملک میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

اب پاکستانی ٹی وی چینلوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ معیاری ڈرامے تخلیق کریں۔ نیز ان میں پاکستانی تہذیب، ثقافت اور روایات کو بھی اجاگر کیا جائے۔ یوں وہ خصوصاً پڑوسی ممالک میں روحتی دمیت کے موثر سفیر بن سکتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کی فروخت سے پاکستان ٹی وی چینلوں کو آمدن بھی ہوگی۔

ترکی میں ٹی وی چینلوں کے مابین اتنا سخت مقابلہ

ہے کہ وہاں بیشتر جلسے وار ڈرامے ہتھ سات اقساط تک ہی چل پاتے ہیں۔ صرف وہی ڈرامے آگے چلتے



ہیں جنہیں لاکھوں

ناظرین پسند کریں۔ مقابلے کی اسی فضا نے "میرا سلطان" جیسے مسکور کن ڈرامے کو جنم دیا۔

گاؤ زنجین جین کے نوبل انعام یافتہ ڈراما نگار ہیں۔ ان کا قول ہے: "حقیقی زندگی ڈرامے ہی میں لہتی ہے۔ کہانی کا نقاب اوڑھ کر آپ سچ بول سکتے ہیں۔" چناں چہ پاکستان ڈراما تیار کرنے والے اداروں کے لیے یہ نادر موقع ہے کہ وہ عمدہ ڈرامے تخلیق کر کے بھارتی عوام کو سچائی سے آگاہ کریں۔ یہ سچائی کہ پاکستانی محبت کرنے والی، صابر اور مہمان نواز قوم ہے۔

زندہ گی کی موت

اس بیتے دور کی دل خوش کن کتھا
جب خلوص و بیار ہی معیار زندگی تھا
پھر پیسے کا ہو کا ساری عظیم اقدار تباہ کر گیا

سراج دین

تجربیات زندگی

محلے دار معمر بزرگ شیخ عبدالغفار نے
ہمارے اپنے گھر کے آگے کھڑے چند مچلے
نوجوانوں سے جو اپنی خوش گوئیوں کے
دوران بلند فہموں کے ساتھ مغلطات بھی بک رہے تھے
قدرے شستہ لہجے میں کہا "بیٹا یہاں سے چلے جاؤ اور
اپنے گھر کے سامنے ایسی مغلطات جھاڑو....."

ایک نوجوان نے برجستہ کہا "بزرگو! ہم اپنے محلے
میں کھڑے ہیں اور یہ نگلی کسی کے باپ کی نہیں جو
ہمیں یہاں سے جانے کا حکم دے۔ تمہیں تکلیف ہے تو
اپنا دروازہ اور کھڑکیاں بند کر لو! ہم کہیں نہیں جائیں گے۔"
شیخ صاحب پر ان قدروں کے امین اور دیگ
نڈسیت کے مالک تھے۔ پورا محلہ ان کی عزت کرتا۔
لیکن آج خلاف توقع یہ جواب سن کر وہ خون کے گھونٹ
پی کے رہ گئے۔ کل کے چھو کرے ان کا یوں تسخیر آرائیں



گئے؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پچارے چپ چاپ
بالکونی سے سرک گئے۔

ایک دور تھا جب بزرگوں کا کہا ہی سب کچھ ہوتا۔
کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے سامنے گردن اٹھایا
آ نکھیں ملا کر بات کر سکے۔ "مار نہیں پیاز" والی کوئی
ترغیب ہی نہیں تھی۔

۱۱۱۱

ہماری نگلی تو وہی ہے لیکن مکین ہی نہیں مکانات بھی
بدل گئے۔ کشادہ محضوں اور کھلی آب و ہوا والے گھر و عمارتوں
کی جگہ تین تین چار چار منزلہ "سینج باتھوں" والے شاندار
مکانوں نے لے لی جن کی پیشانیوں پر ہندامن فضل ربی
ماشاء اللہ اور الحمد للہ کی تختیاں
آویزاں ہیں۔ اکانڈکا پرانے مکان
اور شامسا بھی نظر آتے ہیں۔
چھوٹے بڑے نئے چہروں کی
پہنات ہے جو پرانی قدروں سے
تقلعی نا آشنا اور بے راہروی کے شکار
ہیں۔

اکثر لوگوں کو کاشمی کی فراوانی نے اوقات ہی بھولا دی
جو اپنا محلہ اور پڑوسی چھوڑ گئے۔ بعضوں نے تو اپنی ذات
بھی بدل لی۔ کوئی جو ہر ناؤں چلا گیا کوئی دا پڈا ناؤں۔
کوئی ڈیفنس جا بسا اور کوئی ماڈل ناؤں جسے چھپر پھاڑ کر
ملا وہ بحر یہ ناؤں سدھار گیا اور کوئی پورے قائدان سمیت
ملک ہی چھوڑ گیا۔ کسی نے اپنا مکان اونے پونے بیچ ڈالا
اور کوئی اپنے مکان میں ایسا کرائے دار محسا گیا جو اس
مخارے "ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کر دیتی ہے"
کے مصداق ہے۔

مثال کے طور پر ایک نئے محلے دار رکشا چلاتے ہیں

جس کی آواز کانوں کے پردے ہلا دیتی ہے۔ یوں کہہ
لیں کہ پورے محلے کا سکون برباد ہے مگر کوئی اسے منع
کرنے کی جرأت نہیں کرتا کہ مفت کی لڑائی ہے۔ شکل
ایسی ڈرائونی کہ بچے دیکھتے ہی اہم جائیں۔ آئے دن اس
کے گھر ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ وہ بیوی بچوں کو چٹکھاڑتے
ہوئے بے نقلا سناٹا ہے جس کے باعث پڑوسی کانوں
میں انگلیاں دیتے ہیں۔ ادھر مالک مکان ان تمام باتوں
سے بے نیاز ہر ماہ کرلیہ وصول کرنے آ جاتے ہیں۔ پھر
نگلی کا ماحول اور پھیلی انار کی دیکھ کر اپنے تئیں دل ہی دل
میں خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے بر وقت صحیح فیصلہ کیا جو
اس "بھجال پورہ" کو چھوڑ "گڈ لوکیشن" اور "بائی اسٹینڈرڈ"
والوں میں جا بے۔

انہیں پرانا محلہ اور پڑوسی تھیں یاد آتے
ہیں جب ان میں سے کوئی ملک عدم
سدھارے تو جنازہ اٹھانے اور
انفوس کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔
"گڈ لوکیشن" اور "اسٹینڈرڈ والوں"

کو خیر ہی نہیں ہوتی کہ پڑوسی کی والدہ انتقال کر گئی ہے اور
انہیں تعزیت کے لیے جانا چاہیے۔ تب وہ پرانے محلے
بذریعہ فون یا کسی کو بھیج کر مسجد میں اعلان کر دیتے ہیں کہ
چوہدری قدوس کی والدہ انتقال فرما گئی ہیں۔ نماز جنازہ
بعد نماز عشا مسجد کے احاطے میں ادا کی جائے گی۔
جنازے میں شریک ہو کر ثواب دارین حاصل کریں۔ پھر
میت سمیت وہ اپنے آبائی محلے آتے اور پڑوسیوں اور
محلے داروں کا تعاون اور ہمدردی کے بول سن کر زار و
قطار ہوتے ہیں۔ دل کے کسی کونے میں یہ خیال
انہیں کچھ کے ضرور لگاتا ہو گا کہ محلہ چھوڑ کر اچھا نہیں
کیا.....



بہت سے ایسے بھی ہیں جو مغلہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی کئی نسلیں یہاں پروان چڑھیں مگر ذالی مکان نہ ہونے کے باعث انہیں جانا پڑا۔ نئے مکان ان کی مجبوریوں، ضرورتوں اور شرافت کو خاطر ہی میں نہ لانے کیونکہ وہیں دولت ہی اُن کا ہدف تھا۔

آج پرانے دن یاد آئیں تو میں حیرت میں کھو جاتا ہوں۔ جب نفسا نفسی ہم سے کوسوں دور اور سادہ زندگی ہر کسی کا اوزھنا بچھونا تھی۔ چھوٹے بڑے کا ادب و احترام تھا۔ عمداً تیس کھڑی کرنے کی دوڑ تھی نہ بینک بیلنس بڑھانے کا لڑکا۔ خلوت، پیار، محبت، ہمدردی اور دکھ درد میں کسی کے کام آتا یہی معیار زندگی تھا۔

ہماری گلی میں کم و بیش سو سو سا گھر آباد تھے۔ گز پر ڈاک خانہ بھی تھا جس کے باعث یہ ڈاک خانے والی گلی کے نام سے مشہور تھی۔ گلی میں دائیں بائیں تین چار کھڑیاں دیں دیں تیس تیس گھروں پر مشتمل تھیں۔ مختصر آویں کہہ لیں کہ خوب رونق والی گلی تھی۔ دو پرچوں کی دکانیں ایک نیاری کی اور ایک وال سیویاں (سویاں) والے کی دکان تھی۔ بعض لوگ ہماری گلی کو وال سیویاں والی گلی بھی کہتے۔

پوری گلی میں صرف دو گھروں میں ویسپا اسکوٹر تھے۔ ایک میرے والد کا اور دوسرا حکیم جی کے ہاں۔ باقی مکینوں میں سے کسی کسی کے پاس ہر کوئیس یا ریلے نامی سائیکل ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے بڑے کا ادب و احترام تھا۔ نمود و نمائش کا فقدان اور محدود آمدن میں اچھی بھلی گزر اوقات ہو جاتی تھی۔

ہمارے محلے کے اردگرد کھیت کھپان اور ہرے

بھرے باغات واقع تھے جن کے باعث ہر وقت لہذا صاف شفاف اور مکی رہتی۔ اُن دنوں سورتج کے بجائے کھلی نالیوں سے نکاسی آب کا کام لیا جاتا۔ اسی طرح گھروں میں فلش یا کوزہ بھی نہیں تھے۔ ہر گھر میں جمعہ دینی لگی ہوئی تھی جو روزانہ کوزہ اور فضلہ اٹھالے جاتی اور محلے سے دور ایک مخصوص جگہ ڈال آتی۔ وہاں سے میونسپل کمیٹی کا ٹرک اٹھالے جاتا۔ پاپائٹس اور سرطان جیسی موذی بیماریاں بھی ناپید تھیں۔

وال سویوں والی دکان درحقیقت ایک چھوٹا سا کپڑا خانہ تھا جسے دو بھائی، ماکھا اور عاشق چلاتے تھے۔ انھوں نے دو چار ریڑھیاں بھی رکھی ہوئی تھیں جن پر خواجہ فروش ان کی تیار کردہ مصنوعات مثلاً ساکھاں، بیٹھا پڑا، نمکین دال سوہیاں، گڑ اور بننے کی دال سے بنی چمک، گڑ کا پیسہ، نمکین پاپڑ اور گڑ والے مرمرے جنہیں ہم ”کھلیں“ کہتے تھے۔

آج پرانے دن یاد آئیں تو میں حیرت میں کھو جاتا ہوں۔ جب نفسا نفسی ہم سے کوسوں دور اور سادہ زندگی ہر کسی کا اوزھنا بچھونا تھی۔

دن بھر پھیری لگا کر بیچتے۔ وہ یہ چیزیں چھان بونے اخبار، کتابوں، کاپیوں کی ردی، لوہا، پتیل، سلور، تانبا اور تانیاؤں کے بدلے بھی دیتے اور شام ڈھلے دکان پر لوٹ آتے۔ ریڑھی کا کرایہ ادا کرتے اور دن بھر کی اکٹھی کی ہوئی اشیا اونے پونے ان کے پاس فروخت کرتے۔ وہ یہ اشیا انہی کے پاس بیچنے کے پابند تھے۔

صبح آتے ہی دونوں بھائی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ ایک چنے کی دال بھگوتا دوسرا ہمیں گوندھتا۔ ایک بھتی پر بیٹھ جاتا دوسرا کسی اور کام میں جت جاتا۔ غرضی وہ صبح سے شام تک مصروف رہتے۔ عاشق چنے کی دال صاف کیے بنا بھگوتا۔ اُس میں پڑے

نکے اور چمکے پانی کی سطح پر آ جاتے مگر ککڑا اسی میں رہتے جو پٹ پٹی کرادی دال کھانے والوں کا مزہ کرکرا کرنے یا اُن کے دانوں کا امتحان لینے کے کام آتے۔

یہ اختیار مجھے اپنی والدہ یاد آ جاتی ہیں۔ جب گھر کا راشن آتا تو والدہ گرم سالے کے تمام اجزاء مثلاً کالا سفید زریڈ، کالی مرچیں، دار چینی، اونگ، بڑی الائچی، سونف اور اجوائن تک خاص اہتمام سے دھوتیں۔ پھر انہیں سکھانے کے لیے طشتروں میں ڈال، لٹل کے کپڑے سے ڈھانپ کر دھوپ میں رکھ دیتیں تو میں حیرت اور ناراضی کا اظہار کرتا کہ بھلا ان چیزوں کو بھی کوئی دھونا ہے؟ ”بس اب اپنی سرخ مرچیں اور نمک وہ گیا ہے انہیں بھی کچھ گال لیں۔“ میں چڑ کر کہتا۔

مگر جب والدہ یہ اشیا دھونے کے دوران اُن میں سی نکلی ریت اور مٹی دکھاتیں تو میں کھسیانی ہنسی کے ساتھ شرمندہ ہو جاتا اور سوچتا کہ بے شمار گھر ایسے ہیں جہاں خواتین مسالہ جات کی صفائی ستھرائی کو خاطر میں نہیں لاتیں اور یونہی استعمال کر لیتی ہیں۔ میرا معمول ہے کہ جب بھی راشن لائوں تو بیگم سے یہ اشیا دھلوانا نہیں بھولتا۔ انہیں دھوتے ہوئے بیگم کی بھی وہی کیفیت ہوتی ہے جو مجھ پر ملاری ہوتی تھی۔

عاشق اور ماکھے نے دکان سے باہر ایک بھتی بنا رکھی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے ککڑی کے کوزے جنہیں ہم ”ڈک“ کہتے تھے ڈال کر آگ جلائی جاتی۔ سردیوں میں اکثر لڑکے اس کے گرد ہال بنا کر بیٹھ جاتے اور اس کی گرمائش سے لطف اندوز ہوتے۔

آگ دھک جاتی تو ماکھا بھتی پر کڑا ہی رکھ اُس میں بنولا ٹیل اُنڈیلتا جو کڑا ہی کے کناروں سے صرف دو تین اونچے نیچے رہتا۔ تیل گرم ہوتے ہی سویاں بنانے کا عمل

شروع ہو جاتا جو کہ عاشق انعام دیتا جبکہ ماکھا ایک کڑا ہی میں میدہ اور گڑ کا شیرہ ڈال کر پیلے رنگ کی لٹی بنانے لگتا۔ اس عمل میں اُس کے بازو کبھیوں تک تھمتھرتے جتھیں دیکھ کر کراہت ہوتی، مگر ہم بچے اُسے جلد ہی بھلا دیتے۔ ماکھا ہاتھ سے اُس مٹوے میں اس قدر گھونٹا لگاتا کہ جب تھمتھرتا ہوا ہاتھ اوپر اٹھاتا تو لٹی کا ریشہ ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنا تھمتھرتا ہوا ہاتھ ڈیڑھ دو وقت بلند کرتا پھر زور سے مٹوے پر پھٹتا تو تھمتھرتی ہی آواز آتی جیسے کسی بھینس کی بیٹھ پر مارا ہو۔ اس مٹوے سے مٹھا پڑا بنتا۔ سوئیاں اور مٹھا پڑا بنانے کا منظر بھی دیدنی ہوتا۔

عاشق گوندھے ہوئے بیگم سے قرینا ڈیڑھ کلو کا بیڑا بناتا اور مخصوص چھیدوں والے ڈول نما ٹولاری ساٹھے میں ڈال کر ٹیلے ہاتھ سے چڑے کو ہاکا ہاکا دباتا جو ساٹھے کے کنارے سے ایک اونچے نیچے ہو جاتا تاکہ اُس میں دھلکن سما سکے۔ کڑا ہی کے پینڈے پر مخصوص فاصلے پر دو ٹکڑیاں رکھتا اور سانچا اس پر ڈکا کر ایک لٹی اور موٹی سی ککڑی جس کا سرا بھتی سے دوٹ پرے ٹولاری بیخ کے ساتھ مضبوط رہی سے بندھا ہوتا، بیگم و سدا میں دھلکن پر رکھ اپنی دوڑوں ٹانگوں میں اُس کا دوسرا سرالے آہستہ آہستہ اُسے دباتا۔

جیسے جیسے دھلکن نیچے جاتا باریک باریک سوئیاں نکل کر ٹیل میں جاتیں تو شوں شوں کی آواز تیل سے اٹھنے والی بھاپ اور بیگم کی سبک ہم بچوں کی رائیں ٹپکا دیتی۔ اس دوران عاشق قدرے سنبھل کر آہستہ آہستہ زور لگاتا رہتا۔ دیکھتے دیکھتے پھول نما سوئیوں سے کڑا ہی بھر جاتی۔ چند لمحوں بعد وہ اس پھول کو بڑی ہی کٹگیہ سے پلٹ دیتا۔ خدا نخواستہ اس زور آ زمائی کے دوران اگر ککڑی ٹوٹ جائے تو عاشق کا جھلسنا لٹھنی ہوتا۔ مگر وہ اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہتا۔ سوئیاں

پک جائیں تو انہیں نکال کر چھیدوں والی پرات میں رکھتا جس کے نیچے ایک پتیلا پڑا ہوتا تھا۔ اس میں سوئیوں سے نچرنے والا تیل گرتا رہتا۔

جب تک مین ختم نہ ہوتا وہ بار بار یہ عمل دہراتا۔ آخر پاؤ ڈیڑھ پاؤ تین بیج جاتا تو اس میں آلو پالک سوکھا دھنیا پیاز اور اس طرح کے دیگر لوازمات ڈال کر پکڑے بنا لیتا جو روڑوں بھائی دوپہر کھانے میں مزے مزے سے کھاتے۔

اب گڑ کا پیسہ بنانے کی تیاری ہوتی۔ جیسے سات گڑ کی بوریاں ہر رات ان کی دکان میں موجود ہوتیں جن سے شیرہ نپکتا اور کھیاں بھنسنائی رہتیں۔ ان دنوں شاید حفظان صحت کے اصولوں سے کوئی واقف ہی نہیں تھا۔ عاشق گندی ہی تیزی (ترانو) میں گڑ تول کر کڑی ہی میں ڈالتا اور تھوڑا پانی ملا اسے بھتی پر چڑھا دیتا۔ پھر فولادی کفیر سے مسلسل گڑ بلانا رہتا تاکہ کڑی ہی کے تلوے سے نہ چپکے۔ آج کا خاص خیال رکھنا اور گاہے گاہے ڈک بھٹی میں جموکتا جاتا۔ آخر جب وہ پک پک کر گاڑھا ہو جاتا تو اس میں ایک خاص قسم کا کیپائی سفید پتھر کا ٹکڑا ڈالتا جس سے میلا کچھ سیاہ گڑ نکھر جاتا اور رتی بھر احساس نہ ہوتا کہ یہ وہی گندا گڑ تھا۔ جب وہ شیرہ تار چھوڑنے لگتا تو کڑی ہی بھتی سے اتار ایک تیل لگی پرات میں انڈیل دی جاتی۔

اس دوران ماکھا ”پاپڑ“ بنانے کے لیے میدہ گوند ہنے میں مصروف ہوتا سفید زریہ نمک اور تھوڑا سا ہنولا تیل یہ ملغوبہ تیار کرنے کے اجزا ہوتے۔ اسے گوند ہنے کا طریقہ آٹے سے قدرے مختلف ہوتا تھوڑا سا تیل اور پانی کا چھینٹا لگا کر اسے پتیلی سے رگڑ رگڑ کر تیار کیا جاتا۔ پھر پاؤ پاؤ کے بیڑے بنا کر تھاں میں سجا

مخصوص وقت تک ڈھانک کر رکھ دیے جاتے۔ ادھر پرات میں گرم گرم گارہے شیرے کی حدت قدرے کم ہو چکی، عاشق اُسے ہاتھ سے ٹول کر پرکھتا۔ پھر ایک طرف سے پکڑ کر کھینچتا اور کبھی دوسری طرف سے۔ یہی عمل وہ بار بار دہراتا۔ اس طرح شیرہ گندھے ہوئے آٹے کی شکل دھار لیتا۔ جب اس کی حدت قابل برداشت ہو جاتی تو عاشق اس کا بیڑا بنا دیوار میں نصب ایک لمبی اور موٹی سے فولادی کیل پر رکھتا تو ”بیٹھا نرم گرم آٹا“ نیچے لپکتا۔ جیسے ہی وہ بالشت بھر نیچے آتا عاشق اُسے سمیٹ کر دوبارہ کیل پر ناکہ دیتا اب وہ اُسے وہ بالشت نیچے آنے دیتا۔ پھر ناکہ۔ یہ کھینچتا تانی قریب آٹھائی تین فٹ تک چلی جاتی اور آخر وہ اسے دھولی کے مانند کیل پر پٹختا اور زور دے گا کر چار پانچ فٹ تک کھینچتا۔ پھر وسط میں سے تیر کے دہری تیر کیل تک لے جاتا۔ یوں چار تہوں کو ملا کر گول گول گھنٹا کر یک جان کرتا اور پھر کھینچ کر وہی عمل دہراتا۔ درجنوں بار یہ عمل دہراتے کے بعد کیل سے پیسہ اتار لیا جاتا۔

ہم بچے دل جمعی سے یہ منظر ندیدوں کی طرح دیکھتے کیونکہ جیسے ہی وہ کھینچتا تان کر پیسہ کیل سے اتارنا تھوڑا بہت اُس سے چپکا رہ جاتا۔ ہم بھاگ بھاگ گرم گرم پیسہ اتارنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کامیاب ہو جاتے اور کبھی ماکھا ہمیں چھڑک کر بھاگ دیتا۔

اتنے میں ماکھا آدھا کلو کے قریب مین بھون چکا ہوتا۔ عاشق پیسہ ایک تھاں میں رکھ روٹی کے مانند پھیلاتا اور بھونتا ہوا مین اس پر چھڑک کر پھر بیڑا بنا دیتا بالکل اسی طرح جیسے قمیے یا آلو والے نان بناتے ہیں۔ جب مین اور پیسہ یک جان ہو جاتے تو مین کی مدد سے روٹی کے مانند اُسے پھیلا دیتا۔ جب پیسہ ڈھائی

تین فٹ قطر کی روٹی کی شکل دھار لیتا تو بھتی میں رکھی چھری جو کہ گرم ہو چکی ہوتی، اس کی مدد سے اس کے نکوئی نکلنے کاٹ کر محفوظ کر لیتا۔

عاشق بائیں آنکھ سے محروم تھا جس کا ہم بچے خوب فائدہ اٹھاتے اور چپکے سے بائیں جانب آ کر تھاں میں ہاتھ مار گرم گرم سوئیاں اٹھا بھاگ جاتے۔ جب کبھی ماکھا یہ فریضہ انجام دیتا تو کوئی بچہ اُس کے قریب نہ پہنچتا۔ یوں عاشق ہم بچوں کا منظور نظر تھا جبکہ وہ ننڈوں والے ماکھے کو سب بچے خواہو اور بھلا کہتے۔

ماکھا میدے کے بیڑوں کی قریب چار درجن ایک فٹ قطر کے پاپڑ تیل کے رکھ دیتا۔ پھر بھتی پر تیل کی کڑی ہی چڑھائی جاتی اور عاشق ان پاپڑوں کے وسط میں چھری سے لمبے لمبے کٹ لگا کر تلنے لگتا۔ وہ ایک باری میں بچھے بچھے پاپڑ لگتا۔ یہ کرا کرے پاپڑ بھی بڑے مزیدار ہوتے۔

اب مرمرے اور گڑ کے شیرے کی ”کھیلیں“ بنانے کا مرحلہ آتا۔ گڑ پک کر تار چھوڑ چکا۔ گرم گرم شیرے میں کلو ڈیڑھ کلو کے قریب مرمرے ڈال کا نکلت میں اسے مالیا جاتا۔ پھر تخت پوش نما چکور بیج پر جو ڈیڑھ بالشت زمین سے اونچا ہوتا سفید سفوف چھڑک کر گرم گرم ملغوبہ اس پر انڈیل دیا جاتا۔ عاشق اپنے دونوں ہاتھ پانی میں ڈبو کر وہ ملغوبہ پورے تخت پر پھیلاتا۔ پھر مین کی مدد سے پورے تخت پر روٹی کے مانند بیٹا۔ اس دوران وہ تھوڑے تھوڑے خشک مرمرے بھی ڈالتا جاتا مبادا وہ ملغوبہ مین سے نہ چپک جائے۔

لیجیے جناب بھتی میں چھری گرم ہو چکی اب ایک لمبی

چھٹی سے جس طرح بچے کا پیوں پر لکیریں لگانے کے لیے فٹ استعمال کرتے ہیں ویسے ہی عاشق وہ چھٹی تخت پر مخصوص نشان کی جگہ رکھ اپنا میلا کچھلا مٹی سے لتھڑا پاؤں چھٹی کے وسط میں جھاتا ہاتھ میں تمام گرم چھری چلاتا اور پل بھر میں وہ ”کھیلیں“ چھوٹی چھوٹی چکور نکلیوں میں تقسیم کر ڈالتا۔ اس عمل کے دوران بار بار اس کا گندا پاؤں ان تھنی ”کھیاوں“ کو چھوتا جس کی اُسے پروا تھی نہ ہم بچوں کو۔۔۔۔۔

لیجیے اب بیٹھا پوڑا بنانے کا طریقہ بھی جان لیجیے۔ تیل گرم ہو چکا اور کڑی ہی کے وسط میں ایک گول سا بھیر پیندے کے فولادی سانچا پڑا ہے۔ عاشق میدے اور شیرے کی لٹی سے ایک چھوٹا سا ڈونگا بھر کر دوسرے ڈونڈی والے ڈونگے میں ڈالتا جس کے پیندے میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ ہیں۔ جیسے ہی وہ ملغوبہ اس میں پڑتا پیندے سے باریک باریک تاریں لگنا شروع ہو

حدت نے ظاہری حسن میں تو اضافہ کر دیا مگر حقیقی خوبصورتی ”سیرت“ کا کوئی پُرسان حال نہیں۔

جائیں۔ عاشق بڑی سرعت سے ڈونگے کے نیچے ڈونگا رکھ اُسے کڑی ہی میں پڑے گول سانچے کے اوپر لے جا نچلا ڈونگا کھسکا لینا۔ باریک باریک تاریں سانچے میں گرنے لگتیں اور عاشق ڈونگے کو گول گول گھنٹا شروع کر دیتا۔ جیسے ہی پوڑے کا مواد پورا ہوتا ڈونگے کے نیچے ڈونگا رکھ دوڑوں ڈونگے لٹی والی کڑی ہی پر اوندھے رکھ دیتا۔ پھر کڑی ہی سے سانچا نکالتا تو گول پوڑا تیل میں تیر رہا ہوتا جو چند لمحوں بعد نکال لیا جاتا۔

سب سے آخر میں دال تلنے کی باری آتی کیونکہ دال کو دو چار گھنٹے پانی میں بھگوانا ضروری ہوتا ہے۔ عاشق



وال کا دانہ اٹھا کر شہادت کی انگلی پر رکھ اسے انگوٹھے سے دباتا اگر وہ پچک جاتا تو سمجھیں وال بھیگ چکی اور اگر ثابت رہتا تو اسے تھوڑی دیر اور بھیگی رہتے دیتا۔

لیجیے جناب وال پھول کر نرم ہو چکی۔ ایک بڑا سا پیلا جس کے پیندے میں بے شمار سوراخ ہوتے عاشق وال اس میں اندر لے دیتا تاکہ بچا کھچا پانی نچر جائے۔ اوسر تیل گرم ہوا کہ نہیں یہ پر کھنے کے لیے عاشق ہاتھ گبلا کر کے کڑا ہی پر جھٹکتا تو پانی کے چھینٹے پڑتے ہی چڑچڑ کی آواز آتی جو اس بات کی غماز تھی کہ تیل گرم ہو چکا۔ عاشق نے ضروری اشیاء تریب رکھ کر نشست سنبھال لی اور چھوٹی سی تھالی میں وال بھر کر تھوڑی تھوڑی کڑا ہی میں ڈالنے لگا۔ تین چار تھالیاں ڈال لیتا تو ایسی مٹی جینی مہک بھاپ کی صورت اٹھتی کہ دل چاہتا ساری وال ہڑپ کر جاؤں..... عاشق دو تین بار چھاتی نما بڑی سی کٹگیر کڑا ہی میں دھیرتا اور چند منٹوں بعد تلی ہوئی وال نکال لیتا۔ ٹھنڈی ہونے پر اس میں پیٹ پٹے مسالہ جات ملا کر وال کراری بنا دی جاتی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ پکوڑوں سمیت میں عاشق اور ماکنے کی بنائی ہوئی مصنوعات بخوبی بنا لیتا ہوں۔ بچے اور بیگم حیرت سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا؟

☆ ☆

ملا پرچوں والا مخصوص اوقات میں دکان کھولتا۔ موصوف ریلوے میں ملازم تھا جبکہ حافظ جی کی مٹی بلا ناغہ وقت پر کھلتی۔ پورا محلہ انہی کی دکانوں سے سودا سلف خریدتا۔ بجلی ہونے کے باوجود مالے دکان پر لائٹیں رکھی ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہی اسے روشن کر دیتے اور گرمیوں

میں ہاتھ والا پکھا استعمال کرتے۔ ہمارے پڑوسی حکیم صاحب تھے۔ انہوں نے گھر میں بھینس پالی ہوئی تھی۔ گرمیوں میں روزانہ ہم ان کے گھر سے چائی کی لسی لیا کرتے جو ان کی بیگم خوش خوشی ڈال بھر کے دیتی۔

یہ ستر کی دہائی کی بات ہے۔ ابا جان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے محلے میں سب سے پہلے سوئی گیس کا کنکشن ہمارے گھر لگا۔ اکثر محلے دار اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتے تھے کہ چند سو روپے جمع کرا کے گیس لگوا سکیں۔ عاشق اور ماکنے کا خیال تھا کہ سوئی گیس چند برسوں بعد ختم ہو جائے گی اور جن لوگوں نے سرکار کے خزانے میں سیکورٹی جمع کروائی ہے جو ان دنوں چند سو روپے تھی وہ ضائع جائے گی۔ پائپ فلنگ اور چولہے بھی بیکار جائیں گے۔ لہذا وہ سوئی گیس لگوانے کے بجائے لکڑیاں جلاتے ہی پرکتفا کرتے رہے۔ لیکن جب گھر گھر اور تندرہوں ہولوں پر بھی سوئی گیس چلنے لگی تب انہوں نے گیس لگوانے کی درخواست دی۔ جب تک سیکورٹی نہیں کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

پھر گردش ایام نے انگریزی ٹی اور لوگوں نے پوش علاقوں میں جانے کے لیے اپنے آبا و اجداد کی جائداد بچپنا شروع کر دی۔ یوں عاشق اور ماکنے کو بھی اپنا کباڑ خانہ چھوڑنا پڑا۔ نئے مالکان نے جائداد خریدتے ہی مکینوں سے خالی کرائی۔ اس طرح پرانے چہرے غنقا ہوئے اور نئے لوگ آ گئے۔

والد صاحب نے لگی کی بائیس جانب آغاز اور درمیان میں چار پانچ فٹ اونچا نولادی کھمبا بالکل وسط میں نصب کروا رکھا تھا مہاڈا کوئی تاگہ ریڑھا یا رکشا اور ٹیکسی قلی میں گھس آئے اور کھیلتے کودتے بچوں کو کوئی

حادثہ پیش آ جائے۔ وہ صبح سویرے دھوئی باندھے منہ میں مسواک لیے پوری گلی میں پانی سے چھڑکاؤ کرتے۔ خاکروب سے اپنی نگرانی میں صفائی کرواتے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ گلی میں کوڑا کرکٹ پھینک سکے۔ خاکروب کی کارکردگی سے خوش ہوتے تو اسے سبز چائے اور موسی گلی کے پرائیوٹے سے ناشتا کرواتے اور جب کبھی نالاں ہوتے تو بچارے کو خوب کھری کھری سناٹے۔

محلے میں کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ میرے والد ہی سے رجوع کرتا۔ حتیٰ کہ لوگ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی ان سے صلاح لیتے۔ ہمارے گھر کی بیٹھک اکثر اوقات شادی ہال کے طور پر استعمال ہوتی۔ ایک دلہہ رشتے کے محلے میں کچھ لوگ ابا جان کے پاس آئے اور لڑکی والوں کی بابت دریافت کیا۔ والد صاحب نے انہیں وہاں شادی کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن وہ لڑکی بیاہ کر لے گئے۔ پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ لڑکی کو اس کے گھر چھوڑنے آئے۔ اب لڑکی والے میرے والد کے پاس آئے اور لڑکے والوں کی شکایت کی کہ انہوں نے خواستوار ہماری بچی کو گھر بھیج دیا ہے۔

والد صاحب نے لڑکے والوں کو بلوایا اور لڑکی ساتھ لے جانے کی تلقین کی۔ تب لڑکے کا باپ بولا "ہاؤ جی آپ ہی نے تو ہمیں منع کیا تھا کہ یہاں رشتہ نہ کرنا اب آپ ہی ان کی طرف داری کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر ابا جان ملیش میں آ گئے اور کہا "جب میں نے منع کیا تھا تو پھر آپ نے رشتہ کیوں کیا؟ اب یہ بیسی بھی ہے تمہاری عزت ہے۔ اگر اسے کوئی گزند پہنچی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اتنا سننے کی دیر تھی کہ وہ چپ چاپ لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ آج وہ بچی دادی بن چکی۔

چار چیزیں

جنہیں کھانے کے بعد استعمال نہ کیجیے

۱۔ کھانے کے بعد پھل مت کھائیے! کیونکہ پھل آپ کے کھانے کو معدے سے آنتوں میں مقرور وقت پر پہنچنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ دن میں کسی بھی وقت پھل کھا سکتے ہیں اور خوب کھائیے اس موسم کے پھلوں کا استعمال بہر صورت مفید اور نفع بخش ہے۔

۲۔ کھانے کے بعد چائے مت چھیے! یہ کہ چائے میں موجود پولی فنائلز (PolyPhenols) کا جزو آپ کی غذا میں موجود نولاد کو جزو بدن بننے سے روکتا ہے۔ علاوہ انہیں چائے میں موجود تیزابیت کا عنصر غذا کے پرائیوٹے کو خراب پہنچاتا ہے۔

۳۔ کھانے کے فوراً بعد چہل قدمی مت کیجیے! اس میں کوئی شک نہیں کہ چہل قدمی نظام ہضم کے لیے فائدہ مند ہے لیکن اسے کھانے کے فوری بعد شروع نہ کیجیے۔ ایسا کرنے سے ہضم کے قدرتی رس (Juices)، جو معدے کے غدود سے نکلتے ہیں دلپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے پاتے۔ لہذا غذا ہضم ہو کر جزو بدن نہیں بن پاتی۔

۴۔ کھانے کے فوراً بعد ہرگز نہ سوئیے۔ کھانے کے فوری بعد سونے سے ہاضمے کے رس معدے سے اٹھل جاتے ہیں۔ نتیجتاً آپ سینے اور معدے میں جلن محسوس کریں گے۔ منہ کا خشک ہونا بھی اسی بات کی علامت ہے۔ (مرسلہ ڈاکٹر محمد افضل، اوکاڑہ)

جدت نے ظاہری حسن میں تو اضافہ کر دیا مگر حقیقی خواہ صورتی "سیرت" کا کوئی نڈسان حال نہیں۔ اب پرانی قدروں کا فقدان اور بڑوں کی عزت کا تسخیر آرایا جانے لگا اور ہر کسی کا ہدف دولت کا حصول ہی ٹھہرا کہ اسی کو ہر تمنا کا مداد سمجھا جاتا ہے۔

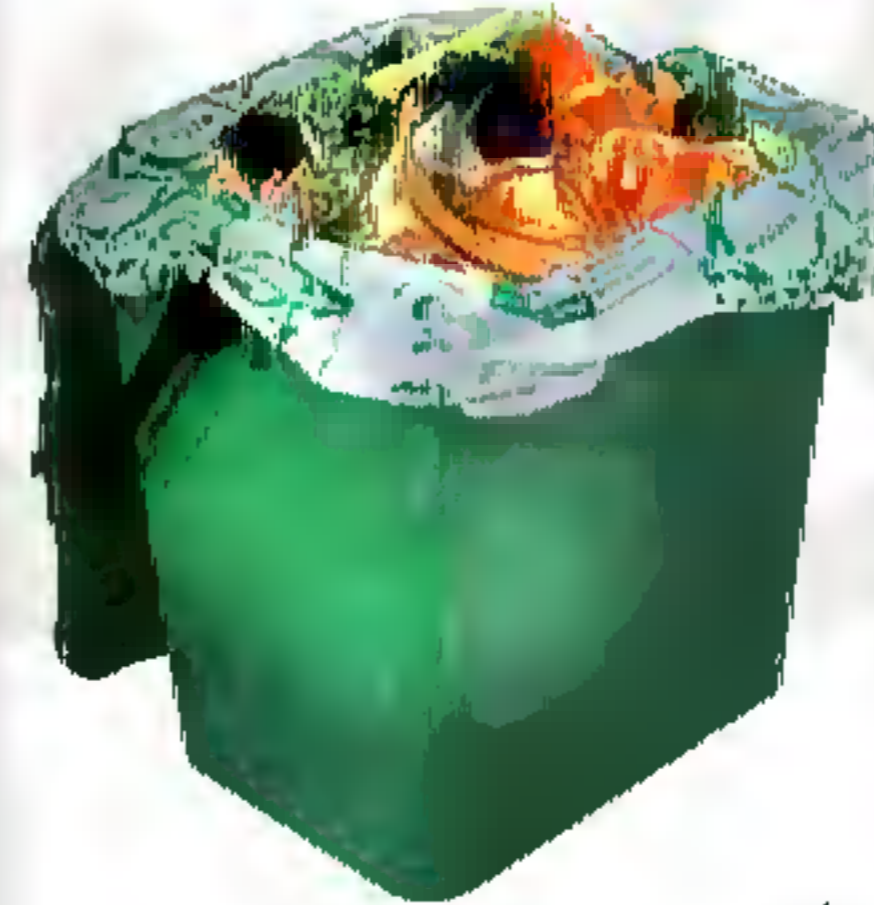


رزق زمین پہ چھوڑا جائے تو وہ بنا

شیطان کا قلم

ایک نابھجھ عورت کی عبرت آموز کہانی
وہ کفرانِ نعمت کرنے سے بال بال بچ گئی

نابھجھ



رات گھر میں دعوت تھی۔ اب صبح کے گزشتہ وقت پورا گھر میدانِ کارزار کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ خالی پلیٹیں، گلاس، ٹشو پیپر اور سوئیچ پھلی کے پھلکے پھیلے ہوئے تھے۔ سارہ اپنی ماسی سکینڈ کے ساتھ مل کر برتنوں سے نبرد آزمائی میں مصروف تھی۔ سکینڈ نے میز پر سے پھلوں کے چھلکے اٹھا کر پھینکے تو کیلے کا ایک چھلکا سارہ کے پاؤں پہ آگرا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا، تو صحیح سالم کیا تھا۔ سارہ نے حیران ہو کر پوچھا ”تو نے ثابت کیا کیوں پھینک دیا؟“

”باجی گلا ہوا تھا.....“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا گیا۔

سارہ نے دیکھا، کیلا ایک طرف سے ذرا سا نرم ہو رہا تھا۔ اس نے اسی وقت چھیل کر کھا لیا اور آہستہ سے بڑبڑائی ”۸۰ روپے درجن کیلوں کے ساتھ یہ سلوک۔ آف تو ب.....“

آدھے برتن دھونے کے بعد سکینڈ نے بریانی کے دیکھے کو لپٹائی نظروں سے دیکھتے ہوئے ”بھوک“ کا نعرہ لگا دیا۔ سارہ نے اسے بریانی، مرغ کڑائی، روغنی نان اور پھل ٹرے میں سجا کر دیے۔ سب چیزوں سے اچھی طرح انصاف کرنے کے بعد جب وہ ٹرے سبک میں رکھنے آئی تو یہ دیکھ کر سارہ کا دماغ بری طرح گھوم گیا کہ بریانی کی آدھی پلیٹ سوندھ کر چھوڑ دی گئی تھی۔ سائن بھی کافی مقدار میں بچا ہوا تھا اور اس میں نان کے ککڑے تیر رہے تھے۔ پلیٹ میں لٹھڑی سوئیچ وٹس بھی بے قدری کی داستان بنا رہی تھی۔ سارہ بے اختیار چیخ پڑی! ”اتنا کھانا پلیٹوں میں کیوں بچایا؟ تجھے ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ جتنا کھانا چاہیے الگ برتن میں

”ہللو عینی اولو۔ آید۔“

”پہنچاتے رہو میری طرف سے خواہ تھوڑی سی بات۔“

”چل اندر آ کر بیٹھ، میں تجھے کھانے کے آداب کے بارے میں بتاؤں۔“ ماسی سکینڈ بھی خوشی خوشی ٹھنڈے کمرے میں سکون کا سانس لینے آگئی۔

سارہ نرمی سے گویا ہوئی ”قرآن مجید کی سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وكلوا واشربوا ولا تسرفوا“ (کھاؤ اور پیا اور حد سے تجاوز نہ کرو۔) اس آیت میں کھانے پینے کی اجازت کے بعد ”لا تسرفوا“ یعنی حد سے تجاوز نہ

کرتے کی قید اور شرط میں غذا کے استعمال کا ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔

”برتن میں کھانے کا کوئی حصہ رہ جائے، تو اس کو اٹھی سے چاٹ کر صاف کر دینا چاہیے۔ اس کی بڑی فضیلت ہے۔ بعض روایات میں

آتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے برتن استغفار کرتا اور کہتا ہے کہ تجھے اللہ تعالیٰ اسی طرح محفوظ رکھے جس طرح تو نے مجھے شیطان سے محفوظ رکھا۔“ (احمد و ترمذی)

سکینڈ دلچسپی سے ہمد تن گوش تھی۔ سارہ نے مزید بات آگے بڑھائی: ”مشہور محدث، ہدیہ بن خالد کو خلیفہ مامون الرشید نے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے سے قاصر ہونے کے بعد وہ ککڑے جو دسترخوان پر پڑے ہوئے تھے، محدث اٹھا اٹھا کر کھانے لگے۔ مامون نے حیران ہو کر کہا ”اے شیخ! کیا آپ ابھی میری نہیں

انکا لیا کر۔ میرے گھر کا رزق کوڑے میں نہیں جاتا گا۔ میرے میاں کی حق حال کی کمائی اتنی فالتو نہیں کہ اٹھا کر کوڑے میں ڈال دوں۔“

اس مرتبہ بھی ماسی شان بے نیازی سے گویا ہوئی ”باجی! لوگ تو شاپر بھر بھر کر سائن اور گوندھا ہوا آنا کوڑے کے ڈھیر پر پھینکتے ہیں۔ اگر میں نے تھوڑا سا کھانا پھینک دیا تو کون سی قیامت آگئی۔“

ماسی کے خیالات سن کر سارہ نے اپنا سر جکڑ لیا اور دکھ سے سوچا، ہمارے آقائے دو جہاں نے تمام عمر رزق کی کیسی مثالی قدر کی کہ دسترخوان پر گرے ککڑے تک جن جن چن کر کھائے اور انگلیوں پر لگے ہوئے ذرات

تک کو چاٹ لیا۔ آج آپ نے کھانے کی امت کے خوشحال لوگوں کا تو کہنا ہی کیا، مفلس اور بدحال لوگ بھی رزق کو پیروں تلے روند رہے ہیں۔

”کیسے بدتمیز اور نافرمان ہیں.....“ مگر میری بیٹی بھی تو

کبھی کبھی کھانا بچا دیتی ہے۔“ اگلے ہی لمحے اس کے ضمیر نے سوال کیا۔ یہ تو جی ان پڑھ اور جاہل ہے۔ اس نے کون سا حدیث کی کتابیں پڑھی ہیں جو اسے اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے بارے میں معلومات ہوں؟ قیامت کے روز ماتحتوں کے بارے میں مالکوں سے پرسش ہوگی تو میں نے کب اسے تعلیم دی یا کوئی اچھی بات مدلل طریقے سے بتائی ہے جو اس کی کم علمی پر سزا پا ہو رہی ہوں..... یہ سوچ کر اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے پھر آج اپنا فرض ادا کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

سے محفوظ رہتی ہے اور عافیت عطا کی جاتی ہے۔

(مدارج الثبوة)

”لہذا اگر کھاتے وقت کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے، تو اسے متکبر لوگوں کی طرح نہ چھوڑو بلکہ ضرورت مند اور قدر دان بندے کی طرح اٹھاؤ۔ اگر نیچے گرنے کی وجہ سے اس پر مٹی لگ جائے تو صاف کر کے لقمہ کھا لو۔ کھانے کے وقت بھی شیطان ساتھ ہوتا ہے۔ اگر گرا ہوا لقمہ چھوڑ دیا جائے، تو وہ شیطان کے حصے میں آئے گا۔“

سکینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کہنے لگی ”باہی! یہ باتیں تو مجھے معلوم نہیں تھیں۔“

سارہ نے لوہا گرم دیکھ کر مزید چوٹ لگائی ”ایک اور نصیحت آموز اور حیرت انگیز قصہ سناؤں جس نے میرے دل پر بھی بڑا اثر کیا۔“

”بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک زمیندار کی فصل ہر سال بہت اچھی ہوتی۔ وہ بڑا خدا ترس

”برتن میں کھانے کا کوئی حصہ وہ جائے، تو اس کو انگلی سے چاٹ کر صاف کر دینا چاہیے۔ اس کی بڑی فضیلت ہے۔“

”اسی طرح حضرت جابرؓ سے روایت ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ”تمہارے ہر کام یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی شیطان تم میں سے ہر ایک

کے ساتھ رہتا ہے۔ لہذا جب (کھانا کھاتے وقت) کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے، تو اسے چاہیے کہ اس کو صاف کر کے کھالے اور شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ پھر جب کھانے سے فارغ ہو، تو اپنی انگلیوں کو بھی چاٹ لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کھانے کے کس حصے میں خاص برکت ہے۔“

(صحیح مسلم)

”بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کھاتے ہوئے کوئی چیز گر جائے، تو اس کو اٹھا کر کھالینے سے محتاجی، برس اور کوڑھ کی بیماری سے حفاظت رہتی ہے۔ اولاد و صافیت

”بزرگ بولے اس مرتبہ ایسا کرو کہ کئی کئی ایک روٹی پکواؤ۔ جب وہ ٹھنڈی ہو جائے، تو اپنی زمین پر جاؤ اور چلنے چلتے گھوڑے پر بیٹھ کر یہ روٹی کھانا۔“

”اگلے سال وہ آدمی بزرگ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور بولا کہ حضرت اس مرتبہ تو میری فصل پہلے سے بھی زیادہ ہوئی ہے۔“

بزرگ نے پوچھا، میں نے تمہیں جو عمل بتایا تھا وہ تم نے کس طرح کیا؟ اس نے کہا، حضرت! میں نے کئی کئی روٹی گھوڑے پر بیٹھ کر کھانی شروع کی۔ جب روٹی کا کوئی ٹکڑا نیچے گرا، میں گھوڑا روک کر اترتا اور اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا۔ آگے چلتا۔ پھر کوئی ٹکڑا گرا، میں پھر اتر کر اسے اٹھا کر کھاتا اور پھر آگے بڑھتا۔ اس طرح میں نے بڑی دیر بعد وہ روٹی ختم کی۔“

”بزرگ نے فرمایا، تو اللہ کے رزق کی اتنی قدر کرتا ہے۔ اللہ تیرا رزق کم کر ہی نہیں سکتا۔“

”اس قصے سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کی قدر دانی اور عزت کرنے سے ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جبکہ بے قدری و پامانی کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے اور ان میں کمی آتی ہے۔ اگر ہم کسی کا دیا تحفہ نالو سمجھ کر کوڑے میں پھینک دیں، تو وہ آسمانہ ساری زندگی ہمیں کبھی دوبارہ تحفہ نہیں دے گا۔ مگر اللہ تو ایسا غفور الرحیم ہے کہ ہم روزانہ اپنے گھر کے بچے ہوئے سالن، روٹی اور دوسرا رزق بیکار سمجھ کر کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔ وہ پھر بھی اگلے دن اسی طرح بے شمار اور مزید نعمتیں عطا کرتا ہے اور ہم سے کچھ بھی چھینتا نہیں۔“

”بات ختم ہوتے ہی سکینہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کا چہرہ بدلتے خیالات کی گواہی دے

دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی

دنیا کی سب سے پہلی اسلامی یونیورسٹی مراکش کے شہر فاس میں ۱۸۵۹ء میں قائم ہوئی۔ محمد بن عبداللہ تھری نے یہ یونیورسٹی بنانے کا حکم دیا۔ موت نے انھیں مہلت نہ دی، مگر ان کی بیٹیوں، فاطمہ اور مریم نے اپنے والد کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے یونیورسٹی مکمل کروائی۔

یونیورسٹی میں ایک جامع مسجد کے علاوہ فقہ اور دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کے لیے بہت سی عمارتیں بنائی گئیں اور اس یونیورسٹی کو مدینة العلم کا نام دیا گیا۔

(لابیر حمزہ بن شتاق احمد وارثین)

رہا تھا۔ وہ احساس شرمندگی سے چور لہجے میں بولی: ”باہ! باہی! مجھے تو ان باتوں کا پتا ہی نہیں تھا۔ نہ مجھے خود پڑھنا آتا ہے نہ کسی نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی پیاری باتیں پڑھ کر سنائیں۔ ہم جاہل لوگ تو آپ ﷺ کی کسی سنت پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ رزق کی بہت ناقدری کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہم ساری عمر ناقص کشی ہی میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے، آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اب تو یہ سب باتیں میں اپنے بچوں اور سارے خاندان والوں کو بھی بتاؤں گی۔“

وہ پھر تو یہ تو یہ کرتی ہوئی اٹھ کر کام میں لگ گئی۔ اور سارہ یہ سوچ کر کہ اس نے محبوب خدا کی ایک اتنی کو گمراہی سے بچالیا، دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔

(الٹکریبا ماہنامہ عفت راولپنڈی)

فیس بک کے بارہ راز

یہ راز جان کر آپ مثبت انداز میں فیس بک پر اپنی مقبولیت میں اضافہ کر سکتے ہیں

عامداری حسین

زندگی میں سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کا ہماری عمل و فعل خاصا بڑھ چکا۔ آج لاکھوں پاکستانی اپنی ہر چھوٹی بڑی بات ان ویب سائٹس کے ذریعے دوسروں سے شیئر کرتے ہیں۔ کوئی بھی تقریب ہو اس کا احوال اور تصاویر جب تک فیس بک وغیرہ کے ذریعے دوسروں تک نہ پہنچا دیں انھیں چین نہیں آتا۔ یہ چونکہ مقبول ترین سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے اس لیے وہاں ایک کروڑ سے زائد پاکستانی تصاویر و اسٹینس اپ ڈیٹ کرتے ہیں مصروف رہتے ہیں۔



درحقیقت فیس بک ان کی زندگی کا لازمی خوردبین چکی۔ اس کے ذریعے نہ صرف دوستیاں، رشتے دار یاں بڑھ رہی ہیں بلکہ دشمنیاں بھی پیدا ہو چکیں۔ اس لیے فیس بک بہتر طور پر استعمال کرنے کے ہمیں کچھ آداب معلوم ہونے چاہئیں۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی ان آداب کو ملحوظ خاطر رکھے، یا ان سے اتفاق کرے۔ لیکن انھیں پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا، اگر اسے استعمال کرتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

ذاتی باتیں پیغامات تک محدود رکھیں

اپنے کسی دوست کے بارے میں کوئی ذاتی بات اپنی یا اس کی والد پر لکھنے کے بجائے پیغام کی صورت میں بھیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیے تو وہ بات اتنی اہم نہ ہو لیکن شاید



دوست اسے سب کے سامنے پیش کرنا پسند نہ کرے۔ اس لیے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیتے ہوئے پہلے ذاتی پیغام میں ایک دوسرے سے بات کیجئے۔ فیس بک ایک عوامی پلیٹ فارم ہے، اگر آپ نے کوئی ایسی ویسی ذاتی بات لکھ دی تو آپ کو اندازہ نہیں، وہ کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

پہلے تو لوگوں کو پھر بولو

فیس بک پر عموماً ہر کوئی میگزینوں، دوست رکھتا ہے۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کبھی دوست کس قسم کے مذہبی و سیاسی خیالات رکھتے ہیں۔ اس لیے کچھ شیئر کرنے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لیں کہ کہیں آپ کسی کی دل آزاری تو نہیں کر رہے۔ مثلاً آپ کسی مذہبی تہوار، کسی سیاسی جماعت یا کسی بھی حوالے سے کوئی منفی بات کرتے ہیں جو آپ کی نظر میں شیئر کرنا غلط بات نہیں۔ لیکن جب کوئی متضاد رائے رکھنے والا اس بات کو اپنی فیڈ میں دیکھے تو قدرتا اسے اچھا نہیں لگے گا۔ اس لیے کچھ بھی شیئر کرنے سے پہلے ایک دفعہ ٹھنڈے دماغ سے سوچ لینا بہتر ہے۔

فیس بک رابطے اور میل جول کا ایک اچھا ذریعہ ہے، اسے مثبت کاموں کے لیے استعمال کریں۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے متنازع باتیں مت شیئر کیجئے۔ ہو سکتا ہے، آپ کی اپنی سوچ بدل جائے۔ تب آپ کو احساس ہو گا کہ غلط چیز شیئر ہو گئی۔ آپ پوسٹ ڈیلیٹ تو کر سکتے ہیں لیکن تب تک دوسرے آپ سے بدگمان ہو چکے ہوں گے۔

ذاتی خبریں فون کے ذریعے دیجئے

خوشی یا غم کی کوئی ذاتی خبر ہے، تو اپنے قریبی دوستوں کو بذریعہ فون یا ایس ایم ایس دیں۔ یہ بات صرف فیس بک کے دائرہ آداب میں نہیں آتی بلکہ ہماری عام زندگی میں بھی رائج ہونی چاہیے۔ خاص کر دوسروں کے بارے میں ذاتی خبریں شیئر نہ

کریں کیونکہ یہ امر بعض اوقات دشمنی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سنی سنائی خبریں، جن کے مستند ہونے کا آپ کو علم نہیں، وہ فوراً شیئر کرنے سے پہلے فون پر تصدیق ضرور کر لیں۔

تبصروں کا جواب دیں

آپ نے اپنی والد پر کچھ چیز لگائی تو دوست اسے پسند یا اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔ آپ بھی جوابی تبصرہ کیجئے۔ ان کے تبصرے کو پسند کر کے بنا سکتے ہیں کہ آپ نے ان کی ایکٹیوٹی کو نوٹ کیا۔ اپنے اسٹینس پر خاص کر سوائے تبصروں کا ضرور جواب دیں۔ اگر آپ ہمیشہ دوسروں کے تبصرے اور پسند نظر انداز کرتے رہیں، تو ان میں کمی آتی جائے گی۔ یاد رکھیں، کوئی بھی "ویوواروں سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔"

ہر پوسٹ پر تبصرے سے گریز کیجئے

اگر آپ کا کوئی بہت اچھا دوست ہے تو اپنی دوستی ظاہر کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اس کی ہر پوسٹ کو پسند یا اس پر تبصرہ کریں۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آپ ہر پوسٹ بنا پڑھے ہی پسند کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہر پوسٹ پسند کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی بات کو نظر انداز کر دینا بھی اچھا ہے۔ کیونکہ دوسرے آپ کی یہ عادت نوٹ کرتے ہیں کہ آپ فلاں بند سے کی ہر پوسٹ کو باقاعدگی سے پسند کر رہے ہیں۔

اپنے لہجے کا خیال رکھیے

پڑھنے اور بولی ہوئی بات سننے میں بہت فرق ہے۔ جیسے آپ کوئی بات کریں اور کوئی دوسرا سننے والا جب تیسرے کو بتائے تو بات میں فرق آسکتا ہے۔ یہ فرق ہوتا ہے لہجے کا، یعنی تیسرے نے چونکہ براہ راست بات آپ سے نہیں سنی اس لیے اسے نہیں پتا کہ آپ کا لہجہ کیسا تھا۔ اسی طرح فیس بک پر اسٹینس اپ ڈیٹ کرتے



ہوئے یہ بات دھیان میں رکھیں کہ آپ کا لہجہ مناسب ہو۔ پڑھنے والا اسے کسی بھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ چونکہ ہر کوئی ناسپ کرنے کا انداز مختلف رکھتا ہے، لہذا کچھ لکھتے ہوئے خیال رکھیں کہ کوئی اس کا غلام مطالب نہ نکال لے۔

سادہ الفاظ میں ہلکی پھلکی اور خوشگوار باتوں کو اپنا نہیں ایک اسٹینڈس بنائیں۔ جملے کے آخر میں موجود ایک مسکراہٹ بھی اچھا اثر ڈالتی ہے۔ مشہور کہاوٹ ہے "مسکرائیے... دنیا آپ کے ساتھ مسکرائے گی۔"

اجنبی لوگوں کو دوستی کی درخواست مت بھیجیے

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فیس بک پر زیادہ سے زیادہ دوست ہونا ان کی شہرت کا ثبوت ہے۔ اگر آپ کے لا تعداد دوست ہیں تو یہ بات ٹھیک ہے۔ لیکن دوست حقیقی ہونے چاہئیں۔ ایسے لوگ نہ ہوں جنہیں آپ جانتے بھی نہیں، بس فیس بک پر کہیں نظر آئے اور آپ نے انہیں ایڈ کر لیا۔

ذرا کی جان پہچان والے یا ایسے لوگ جن کے متعلق آپ جانا چاہتے ہوں، انہیں ایڈ کرنے میں کوئی بُرائی نہیں لیکن اجنبی لوگوں اور خاص کر بڑی تعداد میں اجنبیوں کو ایڈ کرنا کسی بھی طرح آپ کی شہرت ثابت نہیں کرتا، بلکہ یہ آپ کی پروفائل پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔

دوسروں کی بُری تصاویر مت شیئر کیجیے

موبائل کے ذریعے اب کبھی ہر وقت ہمارے ہاتھ میں رہنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے، ہمارے اندر کا فونو گرافر براہم لہجے کو کبھی سے میں قید کرنے کو بے تاب رہتا ہے۔

ایسے میں دوست احباب کی کئی ناز یا بُرے پوز میں تصویریں بن جاتی ہیں۔ ایسی تصاویر ہمیں مذاق کی حد تک صحیح ہیں لیکن انہیں فیس بک پر شیئر کرنا کسی طرح

موزوں نہیں۔ ایسی تصاویر شیئر کر کے دوست کو تنگ کرنا اور زیادہ بُرا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس طرح وہ تصویریں دوستوں اور خاندان تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ہوں وہ نہ صرف مذاق کا نشانہ بنتا ہے بلکہ اس کے خاندان والے بُرا بھی مان سکتے ہیں۔

ذاتی تشہیر مت کریں

اپنی نیوز فیڈ دیکھتے ہوئے آپ کو کسی دوست کی کافی پوسٹس نظر آتی ہیں اور بار بار۔ کچھ لوگ خود نمائی بہت پسند کرتے اور اپنی ذات سے وابستہ ہر بات دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ مثلاً میں فلاں ہوٹل میں ہوں، کھانا بہت اچھا ہے، فلاں میرے ساتھ ہے، اب ہم سینما جا رہے ہیں۔ ہر دن چند منٹ بعد ایک نئی پوسٹ دیکھنے ہوئے آپ عاجز آتے اور آخر کار اس دوست کی تمام پوسٹس ہائیڈ کر دیتے ہیں۔

اگر آپ دوسروں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں تو کوئی آپ کے ساتھ بھی ایسا کر سکتا ہے لیکن اسی صورت میں کہ آپ بھی تو اتر سے پوسٹیں کریں۔ یہ کوئی غلط بات نہیں لیکن انسانی مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے ضروری نہیں کہ آپ کی ہر پوسٹ سے لطف اندوز ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ایسا کچھ شیئر کریں کہ سب اس میں دلچسپی لیں۔

چین پوسٹس

آپ نے فیس بک پر یقیناً چین پوسٹس دیکھی ہوں گی یعنی ایسی پوسٹیں جو بے شمار لوگ شیئر کر چکے۔ آپ کو بھی اسے شیئر کرنے کی تلقین یا درخواست کی جاتی ہے۔ بعض پوسٹوں کے ساتھ تو یہ تہنید ہوتی ہے کہ اگر آپ نے اسے شیئر نہ کیا تو نقصان اٹھائیں گے۔ بعض پوسٹوں

کے پیچھے کوئی رضا کارانہ مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ بعض ثواب کے لیے شیئر کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر کے پیچھے کوئی تشہیری عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اگرچہ اس امر میں بھی کوئی بُرائی نہیں لیکن بعض اوقات ہار ہار ایسی پوسٹس شیئر کرنے سے کوئی دوسرا آپ سے بے زار ہو سکتا ہے۔

دوسروں کی رائے کا احترام کیجیے

انٹرنیٹ کی دنیا میں ہر کوئی آزاد ہے۔ ہر انسان اپنی الگ رائے رکھتا ہے۔ اس لیے فیس بک پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں کبھی آزاد ہیں۔ دوسروں کی کسی بات سے اگر آپ اتفاق نہ کریں تو انہیں صحیح راہ پر لانے کے لیے خدائی فوجدار بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کسی امر سے متفق نہیں تو کوئی بات نہیں، اختلاف نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیے۔ جذبات میں آکر الجھنا آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں کے لیے بدگمانی مت پالیں۔

ایک چھوٹی سی بات پر اگر آپ کسی دوست سے الجھ جاتے ہیں تو کچھ دن بعد وہ ایسی پوسٹ بھی لگا سکتا ہے جس سے آپ متفق ہوں۔ پھر آپ اس کی تائید کرنے میں ہانکچائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں۔ ہمیشہ دل بڑا رکھیں اور اگر کسی کی کوئی بات پسند نہ آئے تو فوراً بتانے کے بجائے درگزر کر دیں۔ غصہ ویسے بھی حرام ہے۔ اس لیے ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ کے اندر جتنی بھی برداشت ہے، اسے آزمانے کے لیے فیس بک استعمال کریں اور ناپسندیدہ پوسٹوں سے درگزر کرتے جائیں۔ جب لوگ کوئی اچھی چیز پوسٹ کریں تو اسے پسند کر کے ان کی تعریف کریں۔ دیکھیے گا اس عمل سے نہ صرف آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا بلکہ آپ خود بھی اچھا محسوس کریں گے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ دوست کے دوست سے تبصرہ میں جنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح بیخ بالا دوست بلاوجہ پریشانی اٹھاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تبصرے والی بحث میں آپ ہر تبصرے کا فوراً جواب دیں۔ بعض اوقات بحث و مباحثے سے فرار اس بحث کو وہیں ختم کر سکتا ہے۔ ورنہ بہتر تو یہی ہے کہ شناسائی کا دامن تھامے رکھیں۔ اگر کوئی آپ سے متفق نہیں ہو رہا تو معذرت کرتے ہوئے گفتگو سے الگ ہو جائیں۔ کیونکہ تمام بحث و مباحثوں تک بھی پہنچتی ہے اور لوگ آپ کے متعلق منفی رائے پال سکتے ہیں۔

پرائیویسی سیٹنگز

اپنے فیس بک اکاؤنٹ کی پرائیویسی سیٹنگز ضرور چیک کریں۔ قریبی دوستوں کے علاوہ رشتے دار، جان پہچان کے لوگ اور دفتر کے ساتھی بھی فیس بک پر ایڈ ہوتے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی شیئر کرنے سے پہلے دھیان رکھیں کہ آپ کی پوسٹ کن کن لوگوں تک پہنچے گی۔ بہتر ہے کہ دوستوں کے مختلف گروپس بنا لیں۔ اگر کوئی بات صرف رشتے داروں سے شیئر کرنے والی ہے تو صرف فیملی کے لیے پوسٹ کریں۔ جو دوستوں سے شیئر کرنے والی بات ہو، اسے دوستوں سے کریں۔ اگر عام سی کوئی بات ہے جسے آپ سب سے شیئر کرنا چاہتے ہیں تو پوسٹ کرتے وقت پبلک بھی منتخب کر سکتے ہیں۔

اختتامیہ

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ ان تمام ہدایات پر سختی سے کاربند ہو کر فیس بک سے لطف اندوز ہونا ہی چھوڑ دیں۔ دراصل فیس بک ایک دو دھاری تلوار ہے، اسے احتیاط سے استعمال کرنا ہی عقلمندی کا تقاضا ہے۔

دیانت داری کا سبق پڑھتے ہوئے

جب آئی جی نے پیاز چرایا

ایک پولیس افسر کے قلم سے جدوجہد زندگی
میں درست راہ دکھانے والے قیمتی مشورے

سرदार احمد چودھری

جن دنوں ہم لاہور کے قریب مراکہ میں قیام
پذیرتے تھے، تو ہمارے شب و روز بڑی تنگ
دستی میں کٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی
ہماری والدہ زمین پر گرا ہوا بیر تک اٹھانا
پسند نہ کرتیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ بیر کا درخت کسی اور
کی ملکیت ہے۔ اس لیے وہ کسی کا بیر کھانے کے
بجائے بھوکا رہنے کو ترجیح دیتیں۔ میری والدہ
بیشہ سچائی اور اخلاقی اقدار پر زور دیتی

آپ بیٹی

نہیں۔ وہ ہمیں ہر وقت
نصیحت کیا کرتیں:

"کسی کی چیز مت چرائو"

ہرگز جھوٹ نہ بولو۔"

انہوں نے زندگی بھر

اس منشور پر عمل کیا اور ہماری زندگی پر

اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مراکہ میں
دوران قیام ایک دن میں نے ایک مکیت میں سے کچا
پیاز اٹھا لیا۔ پیاز چوری چوری اٹھا لیا۔ وقت بچھے
پوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے اور ساری
دنیا مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیانت داری کی قدر و قیمت
میرے ذہن میں اس طرح نقش کر دی گئی تھی کہ معمولی
سی چوری کرنے پر مجھے شدید بخار چڑھ گیا اور میں کئی
دن پریشان رہا۔

ایسے غریبانہ لیکن اخلاقی لحاظ سے بلند ماحول میں
آنکھ کھولنے کی بنا پر میں زندگی
بھر سخت جدوجہد کرنے سے
کبھی نہیں ہچکچایا۔ اپنے ماضی



جنوری 2015ء

اردو ڈائجسٹ 124

پر نظر ڈالوں، تو ایسا لگتا ہے کہ مجھے میری محنت کا بہت اچھا
صلہ مل چکا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جس کی
بدولت ایک ہندو ناچیز بلند مرتبہ عہدوں پر فائز ہوا۔

اسکول میں داخلہ

میرے والدین مجھے اسکول میں داخل کرانے کے
خواہش مند تھے۔ چنانچہ میں نے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی
اسکول، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پانچویں جماعت میں داخلہ
لیا۔ میں نے وہاں بہت اچھی کارکردگی دکھائی اور اپنی
جماعت کے بہترین طلبہ میں شمار ہونے لگا۔

ہمارے اسکول کی عمارت انتہائی خستہ تھی۔ اس
میں فرنیچر تھا نہ ناٹ اور چنایاں۔ کوئی لیبارٹری تھی نہ
بہت اخلا۔ عمارت بجائے خود ٹاکائی تھی۔ ہم سردیوں
میں کھلے میدان میں فرش پر اور شدید گرمیوں میں
درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

مادی وسائل کی کم پائی اور دیگر مشکلات کے باوجود
اساتذہ کا تعلق کردار اور اپنے فرض سے لگن قابل
تعریف تھی۔ وہ وقت کے پابند انتہائی دیانت دار اور
اصول پسند تھے۔ جماعت میں نقل کرنے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ناجائز شخصیں فائدہ اٹھانے کی بابت
سوچنے کا تصور ہی نہیں تھا کیونکہ اخلاقی اقدار بڑی
مضبوط تھیں اور لوگ ملک کے بارے میں خاصا نہ سوچ
رکتے تھے۔ طلبہ کے دلوں میں بھی اعلیٰ خیالات موجزن
رہتے اور وہ اچھے پاکستانی بننے کے لیے سخت محنت
کرتے تھے۔

مٹالی استاد..... شیخ غلام قادر

اسکول کا ماحول شریک شریک عناصر کو اپنا کھیل کھیلنے کی
اجازت نہ دیتا۔ ۱۹۵۳ء میں قادیانوں کے خلاف
تحریک کے دوران ایک طالب علم نے غالباً کسی بیرونی
آدمی کی شد پر یہ انواد پھیلانے کی کوشش کی کہ ہمارا

ایڈماسٹر قادیانی ہے۔ اسکول کے برآمدی نے اس پر
ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شرارت کامیاب نہ ہو سکی۔
ہمارے ایک مثالی استاد شیخ غلام قادر تھے جو ہمیں
انگریزی پڑھاتے۔ وہ چھٹی کے بعد بھی ہمیں روک
لیتے۔ وہ منتخب طلبہ کو اینگلو وریٹیکل فائنل امتحان کی تیاری
کراتے تاکہ وظیفہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر اسکول
کا نام روشن کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ چھٹیوں کے
دوران بھی ہمیں اپنے گھر پڑھاتے تھے۔ ٹیوشن فیس
لینے کے بجائے وہ ہمیں کھانا بھی کھلاتے۔

ماسٹر غلام قادر بڑے فرض شناس اور مخلص تھے۔
ایک صبح ہم پڑھنے کے لیے ان کے گھر پہنچے تو یہ جان
کر بے حد دکھ ہوا کہ ان کی صاحبزادی فوت ہو گئی
ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ کم از کم آج پڑھائی نہیں ہوگی
اور ماسٹر صاحب چھٹی کریں گے۔ لیکن ہماری سوچ غلط
نکلے۔ وہ قبرستان سے واپس آ کر حسب معمول ہمیں
پڑھانے لگے اور اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا
تذکرہ تک نہیں کیا۔

میں ایک اچھا مقرر تھا، اس لیے مختلف تقریبات
کے موقع پر میری ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی۔
مجھے تقریر کرنے کا فن استاد غلام قادر نے ہی سکھایا تھا۔
ایک بار انہوں نے ۱۵ صفحات پر مشتمل تقریر لکھی اور
ساتویں جماعت کے پانچ طالب علموں کو یاد کرنے کے
لیے دی۔ انہوں نے ہمیں کہا "بابر کھیتوں میں نکل
جاؤ۔ وہاں فصلوں اور درختوں کو سامنے تصور کر کے ان
سے خطاب کرو۔" یہ نصیحت بھی کی کہ سامعین سے ہرگز
خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ لوگوں کا ہجوم کچھ نہیں
سوچتا، وہ صرف سننے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس
لیے ان کی فطرت پر دانا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم سے کوئی
غلطی سرزد ہو جائے تو وہ ہرگز نہیں پکڑ سکتے۔ خود کو ان

جنوری 2015ء

اردو ڈائجسٹ 125

سے برتر اور تقریب کا اصل روح رواں سمجھنا چاہیے۔“
میں نے ان کی باتوں پر حرف بحرف نکل کیا۔ میں
کھیتوں میں چلا گیا اور درختوں کو مخاطب کر کے بلند
آواز سے تقریر کرنے لگا۔ یوں تھوڑی سی دیر میں
پورے پندرہ صفحے یاد کر لیے۔ اگلے دن ماسٹر صاحب
نے پہلا صفحہ سنانے کو کہا تو میں نے پوری تقریر سنا دی
جس کے دوران صرف ایک غلطی ہوئی۔ وہ بڑے
حیران ہوئے اور مجھے جینٹلمنس (ناہذاً عصر) قرار دیا۔
مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے تھے، نہ ہی ان سے
پوچھنے کی ہمت تھی۔ دوسرے روز میرے ہم جماعت
راجا رفیق نے بتایا کہ ’جینٹلمنس‘ کے معنی ہیں ’شیطان‘ تو
مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس وقت اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ
مذاق کر رہا ہے۔

مارشل لا کے خلاف تقریر

ان دنوں ۱۴ اگست ہر جگہ بڑی دھوم دھام اور جوش
و خروش سے منایا جاتا۔ آزادی کی اہمیت کے موضوع پر
ایمان افروز تقاریر ہوتی ہیں۔ میں طلبہ کے پسندیدہ مقررین
میں سے ایک تھا۔ پاکستان پر یقین ہی ہمارا سب سے بڑا
سرمایہ تھا۔ ہم اس عزم کا پر زور الفاظ میں اعلان کرتے کہ
وطن عزیز کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک بنائیں گے۔ یہ
اتنی بڑی حقیقت تھی کہ انتخابی ناگفتہ بہ حالات میں رہتے
ہوئے بھی میں اسے واضح طور پر محسوس کیا کرتا۔

لیکن ۱۹۵۸ء میں نفاذ مارشل لا کے بعد ایمان و
ایقان سے بھرپور وہ جذبہ اچانک ہوا میں تحلیل ہو گیا۔
اگلے سال یعنی ۱۳ اگست ۱۹۵۹ء کو میں نے لوگوں کو
اداس، افسردہ اور اپنے ولی خیالات کے اظہار سے
گریزاں پایا۔

میں نے اپنی تقریر میں مارشل لا کو بدترین اقدام
قرار دیا جس نے ہماری آزادی سلب کر لی جو ہم نے

بڑی جدوجہد سے حاصل کی تھی۔ لوگوں نے ڈر وادار
تالیاں بچائیں اور بعد میں مجھے کندھوں پر اٹھا کر پورے
بازار میں جلوس نکالا۔ شاید یہ چیز مقامی انتظامیہ کو ناگوار
گزری۔ چنانچہ جوڑی جاؤں ختم ہوا، پولیس نے میری
خوب ٹھکانا کی۔ شاید وہ مجھے جیل بھیج دیتے لیکن شہر کے
ایس ڈی ایم، جناب کے ایم اے صدیقی نے جن کے
زیر صدارت جلسہ ہوا تھا، مداخلت کر کے میری گلو خلاصی
کر دی۔ صدیقی صاحب بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج
مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں یوم آزادی
منانے پر پابندی لگا دی گئی۔

ان دنوں یوم آزادی پر والی ہال ٹورنامنٹ دوسرا اہم
واقعہ ہوا کرتا تھا۔ ملک بھر کی منتخب ٹیمیں تین روزہ
ٹورنامنٹ میں حصہ لینے ٹوبہ ٹیک سنگھ آتیں۔ وہ بڑا ایجان
خیز ٹورنامنٹ ہوتا۔ اس دور کے نمایاں افراد میں میاں
عبدالخالق، چودھری زمان، چودھری عبدالحمید اور عبدالکریم
کے نام قابل ذکر ہیں۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد
پتا چلا کہ ان میں سے میاں عبدالخالق کے سوا سب پولیس
کے کھلاڑی تھے۔ ٹورنامنٹ نے والی ہال سے میری
دلچسپی میں اضافہ کیا اور میں بہت اچھا کھیلتے لگا۔

ترقی پر حسد نہ کر

۱۹۵۳ء میں وطنیہ کے امتحان کے لیے استاد غلام
قادر نے جن چار طلبہ کا انتخاب کیا، ان میں راشد ضیا اور
راجا رفیق کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ راشد اپنے گلاؤں
سے میرے پاس آ گیا تاکہ ہم مل کر تیاری کر
سکیں۔ ایک دن ضیا کو حساب کے بعض سوالات حل
کرنے میں وقت محسوس ہوئی تو اس نے مجھ سے عدد
مانگی۔ میں نے پورا دن اس کے ساتھ گزارا اور اسے
مشکل سوال حل کرنے کا طریقہ سمجھایا۔ وہ بہت خوش ہوا
اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔

جب ضیا چلا گیا تو راشد نے مجھ سے کہا ”آپ نے
اس کی مدد کیوں کی؟“
”کیونکہ وہ ہمارا ہم جماعت اور دوست ہے۔“ میں
نے جواب دیا۔

”لیکن وہ ہمارا حریف بھی تو ہے۔“ راشد نے
قدروں غصہ سے کہا۔ ”تمہاری مدد کی بدولت وہ زیادہ نمبر
حاصل کر کے ہمیں شکست دے سکتا ہے۔ مجھے تم نرے
”بدمعز“ مانتے ہو۔“

اس کے ان جملوں پر مجھے
زبردست افسوس ہوا۔ میں نے
سنجیدہ ہو کر جواب دیا: ”قیحہ اللہ
کے ہاتھ میں ہے ہمیں کسی کی
ترقی پر حسد نہیں کرنا چاہیے۔“

ان دنوں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں
بکلی نہیں تھی۔ ہم لائین کی روشنی
میں تیاری کیا کرتے۔ میں نے
اس کا حوالہ دینے ہوئے کہا: ”تعلیم
اس لائین کے مانند ہے۔ اگر
آپ اس سے دوسری لائین روشن
کر لیں تو اس کی روشنی میں کوئی
کی داغ نہیں ہوگی۔“

میں نے راشد کو یہ بھی بتایا کہ قرآن پاک نے ہمیں
بتایا ہے: ”ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے
اپنے فضل سے نواز دیتا ہے۔“ بہر حال راشد میری
وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔

جب نیچہ لگا تو میں اسکول میں اول آیا۔ ہمارے
واجب الاحترام ہیڈ ماسٹر جناب حبیب احمد خاں کے
بقول میں نے اسکول کے قیام سے اس وقت تک ۲۶
سال کی مدت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔

بعد ازاں ضیا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے متعلق
آخری بار سننے میں آیا کہ ترقی کی منزلیں طے کر ۲ ہوا
بریگیڈ سیرین چکا۔ راشد گورنمنٹ کالج لاہور میں لیبارٹری
اسٹنٹ بنا اور اب بھی وہیں کام کر رہا ہے۔ مجھے یہ
جان کر خوشی ہوئی کہ اُس کا سب سے بڑا بیٹا ایم بی بی
ایس ڈاکٹر ہے۔

چند دنوں بعد عاتق کے نئے تھیسس لاءر شیخ محمد اسلم
نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالا تو وہ میرے والدین کو
مبارکباد دینے ہمارے گھر آئے۔ انھوں نے کمال مہربانی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے بھارت میں
منزورہ اراخی کے غوش میں کچھ زمینی
زمین بھی الاٹ کر دی۔ انھوں نے
والد کو میرے متعلق یہ کہہ کر ان کا
حوصلہ بڑھایا ”پاکستان کو سردار محمد جیسے
لائق نوجوانوں کی ضرورت ہے۔“
تھیسس لاءر صاحب نے مجھے ترقیب
دی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے
کے لیے لارنس کالج گھوڑا گلی میں
داخلہ لوں۔ مجھے مذکورہ کالج میں
حصول تعلیم کی خاطر ۵۵ روپے



مرحوم آئی جی پنجاب، سردار احمد چودھری

ماہوار وظیفہ مل گیا تھا۔ تاہم شہر کے معروف تاجر شیخ محمد
ایوسف نے مشورہ دیا کہ میں خود کو اس ادارے کے امیر اور
شہری لڑکوں میں ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں کر سکوں گا۔
ممکن ہے احساس کہتری کا شکار ہو جاؤں۔ اس لیے اپنے
مدعیار کے کسی دوسرے کالج میں داخلہ لوں۔ میں نے ان
کے مشورے پر جو سو فیصد درست اور بر عمل تھا عمل کیا اور
لارنس کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

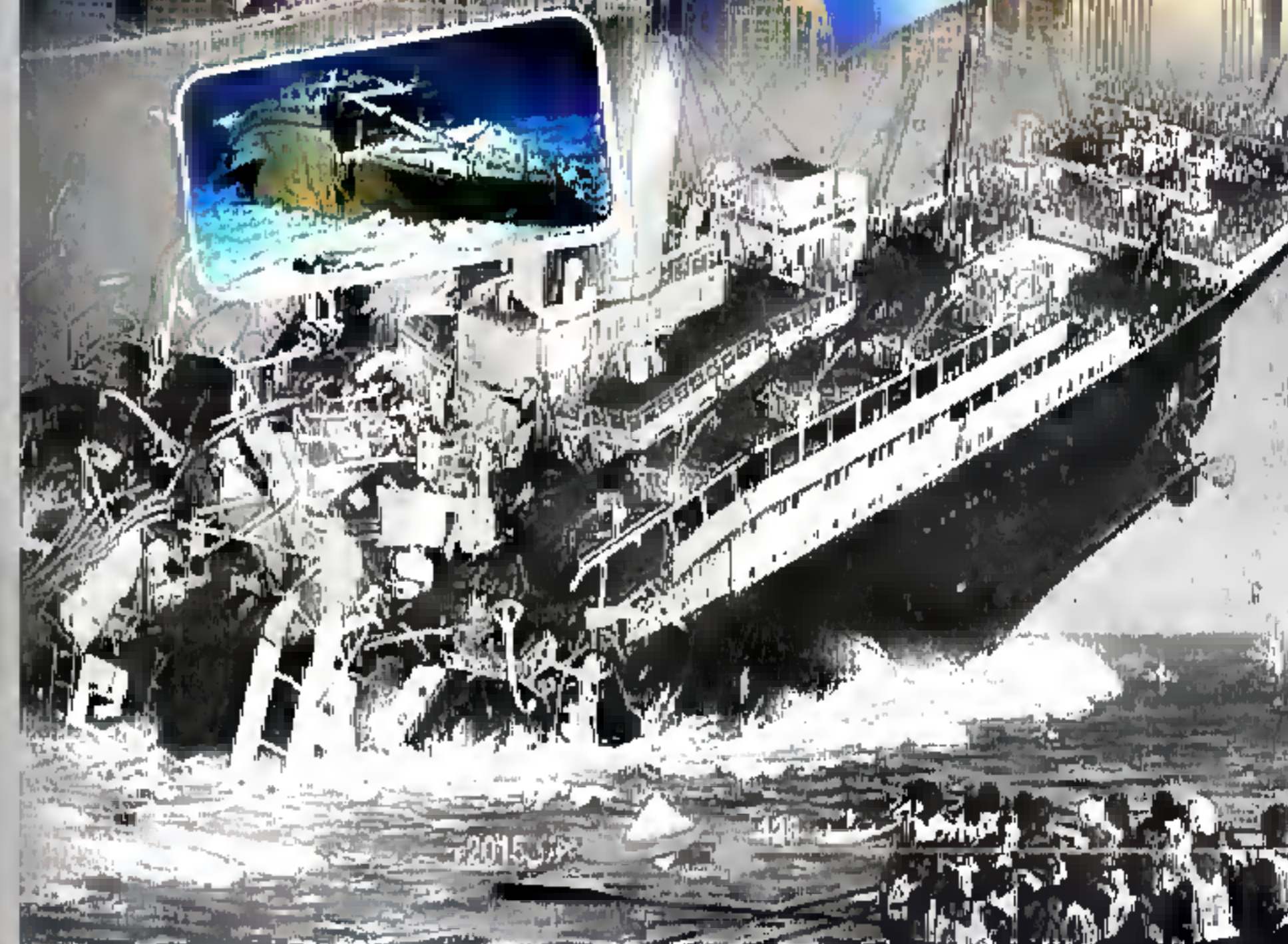
(جناب سردار احمد چودھری کی آپ بیتی، ”جہاں
حیرت“ کا ایک باب)

تاریخ کہ جہر و کور سے

جہر اور آگ کے شہر پر پھٹتی

ٹائی ٹینک جو کبھی نہیں ڈوبا

صاحب مضمون شواہد سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء کی شب برقی ٹائی ٹینک سے ٹکرا کر ٹائی ٹینک نہیں اسی کبھی کا دوسرا جہاز اولمپک ڈوبا تھا۔ تاریخ کے سے تحقیق حاصل۔
 ایڈیٹر مین جہاں آباد



۱۵ / اپریل ۱۹۱۲ء کو امریکی رہائش گاہ ساز ان کمپنی کا تیار کردہ دیوہیکل بحری جہاز، ٹائی ٹینک جس کے بارے میں اس کے مالک، سرمایہ کار بے پی مورگن نے یہ کامیاب تشہیری مہم چلائی تھی کہ یہ کبھی نہ ڈوبے والا جہاز ہے، وائے بد فہمی اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بحراوقیانوس کی گہری و تاریک لہروں کی نذر ہو گیا۔

مگر اس سانحے کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ اسرار کی ایک مبہم دھند اس کے گرد احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دے لفظوں میں کہا جاتا ہے کہ یہ حادثہ کسی سازش کا نتیجہ تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اتنا بڑا حادثہ بھلا سازش کیسے ہو سکتا ہے جس میں ۱۵۰۰ سے زائد انسان ہلاک ہوئے؟ کون کر سکتا ہے یہ سب کچھ اور کیوں؟ یہ سوالات عجیب قسم کی سنسنی خیزی، ہڈ اسراریت، تجسس اور تشکی کو جنم دیتے ہیں جس کی تشکی کے لیے ہم جو افراد نے بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں غواہی بھی کی۔

نتیجے میں کئی چونکا دینے والے شواہد سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ سمندر کی گہرائی میں جس جہاز کا ملبہ پڑا ہے، اس کے سامان میں سے کسی بھی چیز کا تعلق ٹائی ٹینک سے ثابت نہ ہو سکا۔ تو کیا بحراوقیانوس کی گہرائی میں پڑا تھا شدہ جہاز دراصل ٹائی ٹینک نہیں بلکہ کوئی اور ہے؟ کیسے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذہن یہ ماننے کو تیار ہی نہیں۔ یہ محض انسانی داستان لگتی ہے مگر کبھی کبھی حقیقت داستانوں سے زیادہ رنگین اور پراسرار ہوتی ہے۔

ٹائی ٹینک کی تباہی انسانی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش المیہ ہے۔ اس ہمہ گیر صدمے کے بحر سے گزشتہ ایک سو برس کے دوران نکلا نہیں جا سکا۔ تاہم ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو جہاز کا ملبہ بیچ کر دولت کمانا چاہتے تھے۔

اردو ڈائجسٹ 129

اس مقصد کے لیے کئی ٹیمیں بحراوقیانوس کی تہ میں اتریں۔ تاہم ایک شخص، رابرٹ پیلارڈ نے خالص تحقیقاتی مقاصد کے لیے تربیت یافتہ ٹیم اور روٹ گیمروں کی مدد سے جہاز کا جائزہ لیا تو کئی چونکا دینے والے حقائق سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ جہاز کے نام کی تختی سرے سے غائب تھی۔ جبکہ سامان میں سے بالشت بھرا ایسی چیز نکل سکی جس کا تعلق ٹائی ٹینک کے ساتھ جوڑا جا سکے۔

یہ حقائق ان انوائیوں کو تقویت پہنچاتے ہیں جن کے مطابق بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں پڑا ہوا جہاز ٹائی ٹینک نہیں بلکہ تقریباً اسی جسامت اور شکل و صورت کا دوسرا جہاز "اولمپک" ہے۔ اس جہاز نے ٹائی ٹینک کی تیاری سے قبل متواتر بحراوقیانوس کے آر پار امریکا تک سفر کیے تھے۔ مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بحراوقیانوس کی اکتھا گہرائیوں میں پڑا تھا شدہ جہاز وائے اولمپک ہے ٹائی ٹینک نہیں؟ آئیے کچھ شواہد دیکھتے ہیں۔ اولمپک ہونے کے شواہد

رابرٹ پیلارڈ نے ٹائی ٹینک کی تصاویر لیں، تو ان سے صاف ظاہر ہوا کہ جہاز کے بالائی رنگ کی تہ سے پرانا رنگ صاف تھلک رہا ہے۔ وہ کسی پہلو سے ظاہر نہیں کرتا کہ یہ نیا جہاز ہے۔

جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا، نئے جہاز کی رونمائی بڑی دھوم دھام اور رنگین تقریب کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ مگر ایسی کوئی تقریب ٹائی ٹینک کے لیے برپا نہیں کی گئی۔ بلکہ مالکان کی کوشش رہی کہ اسے حتی الامکان عام لوگوں کی نظروں سے دور رکھا جائے۔ جب (بظاہر) ٹائی ٹینک بندرگاہ سے روانہ ہوا تو مسافروں میں یہ انوائی گردش کر رہی تھیں کہ جس جہاز پر سفر کر رہے ہیں، وہ دراصل اولمپک ہے۔

جنوری 2015ء

ہیٹھ اشار لائن گھٹی کا جہاز اولمپک (حادثے سے قبل)



تھا اور مسافروں میں بھگدور مچی ہوئی تھی۔ مگر مستول پر سمندر میں موجود دوسرے جہازوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے لال کے بجائے سفید روشنی برقرار رکھی گئی۔ چنانچہ اور گرد چلتے جہازوں کو تاثر ملا کہ جہاز کے اندر جشن منایا جا رہا ہے۔

مستول پر دور بین سے دیکھ کر خطرے کی پیشگی اطلاع دینے والے شخص کو عین روانگی سے قبل فرانس سے سبکدوش کر کے فارغ کر دیا گیا۔ دو جلدی میں جہاز سے جاتے ہوئے دور بین کی واحد جوڑی بھی ساتھ لے گیا۔ اس بات کے بھی شواہد ملے ہیں کہ جہاز کی غرقابی کے دوران کپتان اسمتھ ہسٹول لے کر لائف بونس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے صرف گئے چنے لوگوں کو لائف بونس میں سوار ہوتے دیا جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔

بعد ازاں تحقیقات سے پتا چلا کہ جہاز پر موجود

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جہاز کی روانگی سے قبل اس کے کونکے سے چلنے والے انجن میں زوردار دھماکے کی آواز سنی گئی۔ پھر آگ بجھانے والے عملے کی سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ مطلب یہ کہ جہاز کی حالت سفر پر نکلنے سے پہلے ہی دگرگوں تھی۔ کچھ عہدید نہیں کہ جہاز میں پانی رسنا شروع ہو گیا تھا جس کی جانب سے غفلت برتی گئی۔

اس ضمن میں جہاز کے کپتان اسمتھ کا رویہ بہت ہی ناقابل فہم اور مبہم ہے۔ جب بحراوقیانوس میں رواں دواں جہاز برقی تودے کے قریب پہنچا، تو اس نے تمام احتیاطی تدابیر ہلائے طاق رکھ کر رفتار بڑھا دی۔ اس دوران اسے تشہی ٹیلی گرام موصول ہوئے کہ رفتار کم کرو مگر کپتان نے نہایت غیر پیشہ ورانہ رویے کا اظہار کرتے ہوئے سنی ان سنی کر دی۔ ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس نے نہ صرف رفتار کم کی بلکہ جہاز روک کر اسے پیچھے کی سمت چلانے لگا۔ اس دوران جہاز میں کافی پانی بھر چکا

لائف بونس نکالی ہو سیدہ تھیں۔ انھیں جب چھوڑا گیا، تو ان میں پانی رس کر بھرنے لگا۔ مزید برآں جہاز کی روانگی کے اوقات میں یہ خلاف توقع تیز ٹی لائی گئی کہ جہاز کو تین دن تک بندرگاہ سے دور سندان کھاڑی میں کھڑا رکھا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ان تین دن میں طوفانی ہوائیں چلنے کی دہشیں کوئی ہوئی ہے۔ تب کسی کے بھی ذہن میں یہ بات نہ آسکی کہ اگر ٹائی ٹینک جیسا عظیم الشان اور مضبوط جہاز ساحل پر ہی طوفانی ہواؤں کا سامنا نہیں کر سکتا، تو بھلا بحراوقیانوس کی موجوں میں کیسے سفر کرے گا؟

مگر ٹھہریے! کہیں اصل وجہ یہ تو نہیں کہ روانہ ہونے والا جہاز ٹائی ٹینک نہیں بلکہ بوزخا اولمپک تھا؟ اور ساحل ہی پر جہاز طوفان کے آگے ہار مان جائے، یہ کسی طور مالکان کو منظور نہ تھا! دوسری بات یہ کہ ان تین دنوں کے بعد چاندنی بھی ماند پڑ جاتی کیونکہ چاند کی آخری تاب نہ تھیں چل رہی تھیں۔

اس بات کے کافی قوی شواہد موجود ہیں کہ بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں پڑے جہاز کا ملبہ آئینہ جہاز کا ہے۔ اصل ٹائی ٹینک کو اس المناک حادثے کے بعد کافی عرصے تک اولمپک کے نام سے استعمال کیا گیا۔ حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم میں وہ تباہ ہو گیا۔ مالک ہے۔ پی مورگن نے اس کا ملبہ بیچ کر خوب پیسا کمایا۔

جب جہازوں کی ٹکر ہوئی

ٹائی ٹینک (اولمپک) جہاز کی حالت روانگی سے قبل ہی اس قدر نازک کیوں تھی، یہ جاننے کے لیے ہمیں پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ ستمبر 1911ء کا ایک بے رحم دن تھا جب اولمپک حسب معمول امریکا جاتے کے لیے بحراوقیانوس میں اترا اور کھلے پانیوں میں جانے کے لیے اپنی رفتار بڑھانے لگا۔ عین اس وقت حفاظتی گشت پر مامور ایک

کشتی کے ساتھ اولمپک کا سامنا ہو گیا۔ دونوں کپتانوں نے ممکنہ حد سے بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، مگر اب تک دیر ہو چکی تھی۔

رفار کی تیزی نے بچاؤ کی تمام کوششیں ناکام بنا دیں اور دونوں جہازوں کے درمیان سنگین تصادم ہو گیا۔ نتیجے میں اولمپک کو جو پہلے ہی بحراوقیانوس کی کافی مار کھا چکا تھا، ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کے تین انجنوں کے سیکے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ مرکزی سلاخ ۳۵ کے زاویے تک مڑ گئی۔ اطراف میں لگی تختیاں اکھڑ گئیں اور جہاز کے ہینڈے کے قریب ۳۰ فٹ چوڑا شکاف پڑ گیا۔ اس کے چار ہانڈراٹک جیمبر بھی پانی کا رساڑ روکنے کے قابل نہ رہے۔ مختصر یہ کہ بعد ازاں حادثہ اولمپک آئینہ بحری سفر کے لائق نہیں رہا۔

اس کی مالک، وہائٹ اشار لائن کمپنی ٹائی ٹینک تیار کرنے کے آخری مراحل میں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اولمپک کو بندرگاہ پر کھڑا نہ کیا جائے ورنہ کمپنی کو بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑتا۔ چنانچہ صرف دو ہفتے کی تلیل مدت میں جہاز کی مرمت کر اسے واپس ساحل پر لنگر انداز کر دیا گیا۔ اس قدر شگفتہ ساخت جہاز کو سمندر کے حوالے کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

اندرونی ٹوٹ بھوٹ کو نظر انداز کر کے ظاہری ساخت پر رنگ کی تہ چڑھا دینا ایسے ہی تھا گویا جنگجو سپاہی کی ٹوٹی پسیلوں کو جوڑے بغیر پٹی باندھ کر میدان جنگ بھیج دیا جائے۔ دلچسپ مگر حیرت انگیز بات یہ کہ جہاز جب مرمت کے بعد بندرگاہ پہنچا، تو اس کی ظاہری ہیئت، روپ اور رنگ و روغن ٹائی ٹینک کی شکل و صورت سے بہت مشابہ تھا۔ دور سے دیکھنے سے اس پر ٹائی ٹینک کا ہی گمان ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی لائف بونس پر بھی ٹائی

ٹائی ٹینک اپنی تکمیل کے بعد



دوسرا سوال یہ ہے کہ محض ایک جہاز کی انشورنس کا پيسا حاصل کرنے کے لیے سیکڑوں مقصوم لوگوں کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں دھکیلنا کیا ضروری تھا؟ یہ کہاں کی انسانیت اور کہاں کی عقل مندی تھی؟

مگر جب ہم مرنے والے لوگوں کی فہرست پر نظر ڈالیں، تو اس بھیا تک راز سے پروردہ لگتا ہے۔ انسان یہ سوچ کر ششدر رہ جاتا ہے کہ کوئی انجمن یا تنظیم اپنے مذموم مقاصد کے لیے ایسا شناک اور انسانیت سوز فعل کرنے پر کیسے آمادہ ہو سکتی ہے جس کے صدمے سے انسانیت آج تک سنبھل نہیں پائی؟

مخصوص قوتوں کا ورلڈ آرڈر

آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ اگر ٹائی ٹینک (اولپک) نہ ڈوبتا، تو دونوں عالمگیر جنگیں کبھی برپا نہیں ہوتیں۔ اقوام متحدہ کا ادارہ وجود میں نہ آتا جس کے سامنے تلے دنیا کا ہر ناجائز کام جائز ہو کر پایہ تکمیل تک

ٹینک والی زندگی بچاؤ کشتیوں جیسا رنگ چڑھا دیا گیا۔ اولپک کی مرمت پر واپسٹ اشار لائن کپنی کے ۵۰،۰۰۰ پاؤنڈ سٹرلنگ خرچ ہوئے جو آج کے لحاظ سے بھی بہت بڑی رقم ہے۔ جہاں چہ اب ایسی شاطرانہ چال کی اشد ضرورت تھی کہ نہ صرف اس ٹوٹے پھوٹے جہاز سے جان چھوٹے بلکہ انشورنس کا پيسا وصول کر کے واپس لے ہونے سے بھی بچا جاسکے۔

سوال یہ ہے کہ اولپک کو تباہ کرنا مقصود تھا، تو نئے تعمیر شدہ جہاز ٹائی ٹینک کا نام استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز ٹائی ٹینک کو کبھی نہ ڈوبنے والا جہاز قرار دے کر اس قدر تشہیر کیوں کی گئی؟ کبھی اصل وجہ یہ تو نہیں کہ واپسٹ اشار لائن کپنی ایک تیر سے دو کے بجائے کئی شکار کرنا چاہتی تھی لہذا یہ بہترین موقع تھا کہ بوڑھے اولپک پر رنگ و روغن چڑھا کر اسے ٹائی ٹینک کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

ہوتی ہے۔ جس کی عین ناگ کے نیچے مظالم کی گردن کھتی ہے، مگر اسے ظالم کے ساتھ ہمدردی جانے اور اس کی اشک شوئی کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

تف ہے ہماری مقلوبوں پر کہ نصف صدی سے زیادہ گزرنے اور اقوام متحدہ کا تمام ریکارڈ دیکھنے اور جاننے کے بعد بھی ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے ور پر کسی کی شنوائی ہو سکتی ہے۔ ہم آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہ ادارہ صرف خاص ممالک اور طبقوں کے مفاد کو تحفظ دینے کے لیے وجود میں آیا۔ اسے بھوک، غربت و جنگ زدہ بے

خانہاں، مقبورہ مظالم انسانیت سے رتی برابر ہمدردی بھی نہیں۔ یہ فصول پائیں اس کے ایجنڈے کا حصہ تھیں، نہ ہیں اور نہ کبھی ہوں گی۔

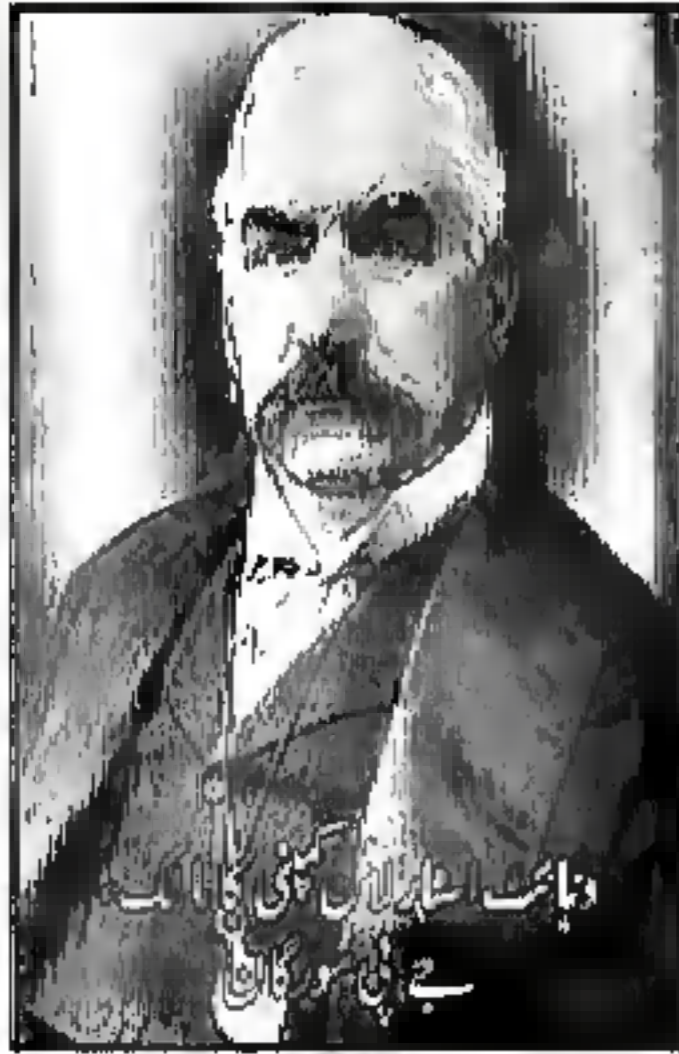
اقوام متحدہ کو وجود میں لانے والوں کا پیسا دنیا میں قیام امن نہیں بلکہ چھوٹے تنازعات کو باقاعدہ جنگوں میں تبدیل کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جنگ میں ملوث فریقین کے ہاتھوں اپنا بنایا ہوا اسلحہ فروخت ہو سکے۔ ایک مقصد

تیل سے مالا مال عرب ممالک میں اپنی نشا و مرضی کی قیادت لانا اور اسرائیل کو طاقتور بنا کر انھیں دفاع کے نام پر بے دریغ اسلحہ فروخت کرنا تھا۔

اقوام متحدہ کو وجود بخشنے والی طاقتوں نے پہلی جنگ عظیم کے لیے موافق حالات پیدا کیے۔ انہیں نادریدہ طاقتوں نے ہٹلر کو اپنی انگلیوں پہ نچایا۔ اس کے نازی ازم کو فروغ دینے کے لیے پیسا پائی کی طرح بہایا تاکہ دوسری عالمگیر جنگ کا جواز پیدا کیا جاسکے جس نے اسلحے

کی تجارت کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

انہی نادریدہ طاقتوں کی ایما پر یہود کے ساتھ انسانیت سوز مظالم روا رکھے گئے تاکہ اگلے چل کر یہودی ریاست کو وجود میں لایا جاسکے۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ انھیں یہودیوں سے ہمدردی ہے، ایسا ہرگز نہیں۔ وہ یہود رقم کھاتے، تو نازی جرمنی سے انھیں برطانیہ، فرانس یا روس کی طرف فرار کا راستہ دے دیتے۔ ان بے بسوں پر جان بوجھ کر چاروں طرف سے گھیراؤ لگا دیا گیا۔ ان کے لیے صرف دو ہی راستے کھلے رکھے گئے کہ یا تو جرمنی سے نکل کر فلسطین کی طرف کوچ کر جائیں یا انھیں جانوروں کی طرح بائک کر کیمپوں میں لایا جائے۔



ڈاکٹر اسرار اللہ کھٹک

کسی بھی قوم کو اگر ریاست بنانا مقصود ہو، تو وہ حصول کے لیے ایسا جان لیوا راستہ کبھی اختیار نہیں کرتی جس پر چل کر یہودی قوم اسرائیل تک پہنچی۔ یہ ملک یہودیوں کو بطور تحفہ نہیں ملا بلکہ اس ریاست کے قیام کے پیچھے مخصوص طاقتوں کے اپنے عزائم پوشیدہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہیکل سلیمان کی کھدائی کر کے سحر دانسوں کی وہ قدیم کتابیں بازیاب کی جائیں جنہیں حضرت سلیمان نے فتنہ و فساد کی بیج گئی کے لیے زمین کی گہرائیوں میں دفن کیا تھا۔

اقوام متحدہ کا مقصد یہ قرار مانا نہیں، بلکہ اسے وجود میں لانے والوں کا پیسا سونپنا (اقوام متحدہ کے تحت معیاری بیج فراہم کرنے والے ادارے) پر خرچ ہوتا ہے۔ اس ادارے سے منسلک ماہرین بیجوں کا معیار نہیں

بڑھاتے بلکہ ان میں جینیاتی ردوبدل کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر نامیاتی غذاؤں سے جنم لیا جنموں نے کئی جدید امراض مثلاً موٹاپے کو باقاعدہ وبائی مرض کی شکل دے دی۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے امریکا میں دس میں سے ایک آدمی غربہ ہوتا تھا۔ آج دس میں سے سات آدمی موٹاپے کا شکار ہیں۔ اب دکانوں میں خوردنی اشیاء کی نہ ختم ہونے والی فہرست دیکھ کر انسان چکرا جاتا ہے کہ کیا خرید لے اور کیا نہ خریدے۔ ان غیر نامیاتی غذاؤں نے کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک کو جنم دیا۔ لوگ ایسا خوردنی کی وجہ سے پھول کر کہا بن گئے۔ مگر بھوک ہے کہ مٹی ہی نہیں۔ آج یورپ اور امریکا دونوں کی سڑکوں پر لوگوں کی اکثریت موٹاپے کی وجہ سے عجب مستحکم خیز چال چلتی اور یہ زبان حال کہتی ہے۔

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اقوام متحدہ کو وجود میں لانے والوں کا پیسا "بگ فار ما" کے ذریعے عالج نہیں امراض کی علامات وقتی طور پر دبائے رکھنے پر خرچ ہوتا ہے تاکہ میں اور آپ دن رات محنت مشقت کر کے ان کی مہنگی ادویہ خرید سکیں۔ سرطان (کینسر) اور دیگر موبذی امراض کا خوف ہمیشہ ننگی تلوار کی طرح ہمارے سروں پر لٹکتا رہے اور ان سے نمٹنے کے لیے ہم ہر جائز و ناجائز وسیلہ اپنانے سے لجھ بھر کو نہ ہچکچائیں۔

یہ مونسائٹو اور بگ فار ما کن طاقتوں کی نمائندگی کرتی ہیں؟ ان کی ذمہ دار کن ناپیدہ ہاتھوں میں ہے؟ میں اور آپ تو یہی کہیں گے کہ یہودیوں کے ہاتھوں میں ہے مگر مختصر کیے، یہاں ہم بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ یہود میں آنے میں نمک کے برابر لوگ ان ناپیدہ قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن یہی مقدار دوسری اقوام میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس بات کی تفصیل میں جانے کی

اشد ضرورت ہے تاکہ ہم ایک غلط ثابت پار پار دہرا کر مزید غلط فیروں کا شکار نہ ہوں۔

جن خفیہ ہاتھوں نے یہودی مذہب میں صیہونی فرقے کو فروغ دے کر پورے مذہب اور قوم کو ریخمال بنایا، وہی طاقتیں عیسائیت میں بھی کیتھولک فرقے کے ذریعے بنیادی تبدیلیاں لاکر مطلق انسان پاپائے روم کو سرچشمہ طاقت اور اقتدار بنانے کی ذمہ دار ہیں۔ پاپائے روم کی تابعداری کا عیسائی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، یہ کھن چکر محض دولت اور اقتدار کے لیے وجود میں لایا گیا۔ چونکہ موجودہ زمانے میں اقتدار کا محور مذہب سے تجارت کی طرف منتقل ہو چکا لہذا اب ان طاقتوں کا محور بھی عالمی تجارت اور ذرائع ابلاغ ہیں جس کے ذریعے مختلف ممالک کے سیاہ و سفید کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

وسطی یورپ کے خزر

اب اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اسلامی فتوحات کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسلامی لشکر یورپ کی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے۔ وسطی یورپ میں خزر (Khazar) نام کی ایک کافر قوم رہتی تھی جن کے عقیدے کا ماخذ اور محور مصری قرائن کی تریہودی (ہورس اور ایزیس) اوریریس) تھی۔ اسلامی فتوحات کے نتیجے میں خزر قوم عجیب صورت حال سے دوچار ہو گئی۔ ان کے ایک طرف عیسائی برسر اقتدار تھے تو دوسری طرف اسلامی لشکر ان کی سرحدوں پر آہنچے۔ خزروں کو خدشہ تھا کہ ہر دو قوموں کے ساتھ ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ نیست و نابود ہو جائیں گے۔ دونوں میں ان کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے۔ لہذا خیمت یہی تھا کہ قوم خزر کوئی درمیانہ راستہ چن لے تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ ہر امن طور پر رہ سکے۔

چنانچہ انھیں یہ حل نظر آیا کہ خود کو یہودی ظاہر کر دیں اور یہی ان لوگوں نے کیا۔ یہودی مذہب اور نسل کے ساتھ ان کا دور دور تک واسطہ نہیں۔ مگر یہود کے لہارے ہیں جو نقصان اس قوم نے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو پہنچایا، اسے جان کر حیرت ہوتی ہے۔

انھیں چاہیے آپ اشکنازی یہودی کہیں، فری میسنری کا نام دیں، اوسمانی اور یسوعی کہیں، یا روتھ شیلڈ اور جے سوٹ، اپنے مقاصد اور طریقہ واردات میں وحدت و یکجہتی میں یہ ایک ہی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ انھوں نے کمال ہوشیاری سے اپنے مشرکانہ عقائد کی فاعلی عیسائیت کے اوپر چڑھا کر عیسائیوں کو عقیدہ تثلیث کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا۔ اس کی گرد میں حضرت عیسیٰ کی دعوت حق نہ صرف گم ہوئی بلکہ اس کا منبوم ہی اپنے نقطہ آغاز سے ۱۸۰ کے زوایے پر بالکل مخالف سمت چلا گیا۔ عقیدہ تثلیث کا منبع وہی قرائن مصر ہیں جن کی علامت ہرم اور ایک آنکھ پر مشتمل ہے۔ حیرت ہے، بالکل یہی علامت امریکا کے کرنسی نوٹ پر کہاں سے اور کیوں آگئی؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی دنیا (امریکا) کا وجود ہی ان قوتوں کی مرہون منت ہے؟

بین الاقوامی تنازعات اور انسانی ماحضروں میں وسیع پیمانے پر جنم لیتی تبدیلیوں کے پیچھے پوشیدہ ہاتھ انہی قوتوں کا ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام، بگ فار ما، مونسائٹو اور دونوں عالمگیر جنگوں کے پیچھے بھی انہی کا ایجنڈا کام کر رہا ہے۔ ڈی پاپولیشن یعنی آبادی کو کم کرنا اور زمین پر بستے والے انسانوں کو ایک مخصوص حد میں لانا ان کے ایجنڈے کا محور ہے؟ اس مقصد کے حصول کی خاطر مختلف پہاڑیاں مثلاً ایڈز، ایبولا، ہرذفلو وغیرہ ایجاد کرنا، خاندانی منصوبہ بندی لاگو کرنا، پینے کے پانی میں فلورائیڈ ملا نا، غیر

سوز ادویہ کو فروغ دینا، مونسائٹو کے ذریعے خوردنی اشیاء کے بچوں میں جینیاتی تبدیلی لانا، عام پانی کے بجائے بوتل کے پانی کو فروغ دینا ان کے منصوبے ہیں تاکہ نیورولڈ آرڈر کی راہ ہموار ہو سکے۔

اس گروہ کی علامت وہی قرائن مصر کی ہر طرف دیکھنے والی آنکھ ہے۔ یعنی ایسی برسر اقتدار آنے والی قوت جس کی آنکھ سے کسی کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پوشیدہ نہیں۔ آج کل آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ آپ کا بینک اکاؤنٹ، ای میل، ایسٹریٹ رپورٹ غرض ہر ذاتی قسم کی چیز کمپیوٹر میں محفوظ ہے، جن تک رسائی انگلیوں کے ذریعے چند سیکنڈوں کا کام ہے۔

دین اسلام کا دجال

دلچسپ بات یہ کہ ایسی ہی ایک آنکھ والی قوت کی ٹیشین گوئی مذہب اسلام میں بھی کی گئی ہے جسے "دجال" کہتے ہیں۔ اس کے متعلق پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا دریا ہوگا جبکہ دوسرے میں روٹی کا پہاڑ۔ بہت خوب! تو اب ڈبلیو ایچ او (WHO) کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے ہاتھ میں تمام نسلوں کے بیج اور بوتل بند پانی کے کارخانے ہیں۔ یہ کارخانے کن لوگوں کی ملکیت ہیں؟ جی ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا، وہی جے سوٹ، روتھ شیلڈ اور راک فیلرز جن کی بنیادیں خزر قوم سے پھولی ہیں۔ ان کا خدا فرعون مصر (ایک آنکھ والا) ہورس یا (دجال) ہے۔ اور جو نیورولڈ آرڈر (ہورس یا دجال کی حکومت کے لیے) ہزاروں سال سے سرگرم عمل ہیں۔ ان سب حقائق کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھنے کے لیے آئیے چلتے ہیں امریکی جزیرے جبرکال کی طرف۔

فیڈرل ریزرو سسٹم کا گھن چکر

یہ نومبر 1914ء کا زمانہ ہے۔ امریکی سینئر نیلسن آکدرج سمیت ہاتھی اور اشخاص... تب کے مالدار اور ماہر بینکار انتہائی وازداری کے ساتھ جزیرہ جیرکال پہنچے۔ پورے نو دن تک ایک خاص کمرے میں ان کے اجلاس ہوتے رہے۔ ان میں یہ نقطہ زیر بحث رہا کہ اجلاس کے شرکاء (جو آپس میں حریف تھے) اگر ایک دوسرے کے حلیف بن کر منافع بخش کاروبار میں سرمایہ کاری کریں، تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ لہذا مشفقہ طور پر ایک مشترکہ



بینک (فیڈرل ریزرو سسٹم) کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ خاص سودی منافع کے لیے قائم کیا گیا بینک ہے جس کا ایک شراکت دار دہانت اسٹار لائن کمپنی کا مالک ہے پی سورگن بھی تھا۔

مگر جہاں اس بینک کے قیام کے لیے بے سوٹ، روتھ شیلڈ اور فری مین میں شیر و شکر ہو گئے، وہاں برطانیہ کی کچھ بااثر شخصیات خلاف بھی تھیں۔ مزید برآں یہ لوگ لیگ آف نیشن کے خاتمے اور قیام اقوام متحدہ کے بھی سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لیگ آف نیشن

اردو ڈائجسٹ 136

منہ فافوت فیصلہ رکھنے والا ادارہ ہے جس کے فیصلوں کو کوئی ملک یا ادارہ سیوا ڈھکیں کر سکتا۔ مگر اقوام متحدہ کے قیام سے ایسی عالمی طاقت کا ظہور ہوگا جو جانب دارانہ فیصلے کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ امریکا جا کر امریکی عوام اور حکومت کو اپنے تحفظات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ امریکی عوام کو بتانا چاہتے تھے کہ فیڈرل ریزرو سسٹم انہیں کس گھن چکر میں پھنسانے والا ہے۔

تب امریکی عوام کے سامان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس بینک (فیڈرل ریزرو سسٹم) سے آسان شراکتہ بر ملنے والا قرضہ انہیں وینک کی طرح چاٹ جائے گا۔ گھر، گاڑی، ملازمت، دیگر اخراجات اور لامتناہی ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے دن رات انتھک محنت اور مشقت انہیں ذہنی طور پر پاپاچ بنا دے گی۔ انہیں اس بات کا علم ہی نہیں ہوگا کہ ۶۰،۵۰ سال کی مختصر زندگی میں کولہو کے پیل کی طرح محنت و مشقت کر کے جو پیسا بناتے ہیں، وہ جاتا کہاں ہے اور نتیجے میں انہیں کیا ملتا ہے؟... دہالیہ پن، بلڈ پریشر، ذیابیطس، سونپا اور الزائمر!

فیڈرل ریزرو سسٹم اور اقوام متحدہ کی مخالفت کرنے والے ان انسان دوست افراد میں بنجامن گولڈنہائم، آسٹی ڈورسٹراں اور جیکب آسٹر سرفہرست تھے۔ امریکا تک سفر کے لیے ان کی نظر انتخاب ہائی ٹینک (اولپک) پر پڑی۔ اس وقت ہائی ٹینک جہاز کی سفری سہولیات اور بے پی سورگن اور دیگر سرکردہ ہستیوں کے لیے سجائے گئے فرسٹ کلاس کیمین کا بڑا شہرہ تھا۔ فرسٹ کلاس کیمین کا ٹکٹ ۵۰ ہزار پاؤنڈ میں فروخت ہو رہا تھا جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے خوش خوشی فرسٹ کلاس کیمین کے ٹکٹ خرید لیے۔ ان کے دام و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ چین روٹنگ سے قبل بے پی

جنوری 2015ء

سورگن اور اس کے ساتھی اپنی بگمگ ملتوی کر انہیں بحر اوقیانوس میں غرق کرنے کی خاطر سفاک کپتان اور بوڑھے اولپک کے حوالے کر دیں گے۔

جہاز کی روانگی سے قبل بے پی سورگن سمیت ۵۵ افراد نے اپنی بگمگ ملتوی کر دی۔ اس نے بیماری کا بہانہ کیا۔ مگر جہاز کی روانگی کے دو روز بعد اسے فرانس کے ایک پرفیشنل ہونل میں اپنی محبوبہ کے ہمراہ دیکھا گیا۔

بقیہ ۵۴ افراد نے یہ کہہ کر اپنی بگمگ ملتوی کرانی کہ ان کی بیویوں نے بے خواب دیکھے ہیں۔ عجیب اتفاق کہ ان سب کی بیویوں نے ایک ساتھ ہی ڈراؤنے خواب دیکھے!

جنسوں نے بگمگ ملتوی کرانی

اگر منصوبے کا جائزہ لیا جائے، تو اس کی گہرائی اور تاریکی ہائی ٹینک (اولپک) کی آبی قبر سے بھی زیادہ وحشت ناک، تاریک اور

سفاک ہے۔ دنیا پر اپنا ایجنڈا مسلط اور نیورلڈ آرڈر کے قیام کی خاطر راستہ ہموار کرنے کے لیے انہوں نے جان بوجھ کر بوڑھے اولپک کو ہائی ٹینک کا نام دے کر اوقیانوس کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا۔

گویا ہائی ٹینک (اولپک) بطور چارہ استعمال ہوا۔ اس کے ذریعے بعض بااثر اور بالدار ترین ہستیوں کو پیش منظر سے ہٹانا مقصود تھا تاکہ ایک طرف فیڈرل ریزرو بینک اور اقوام متحدہ کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے اور دوسری طرف ان کی بے اندازہ دولت بھی ہاتھ آجائے۔

اردو ڈائجسٹ 137

ڈوبنے والی مالدار ہستیوں کی مجموعی دولت کا تخمینہ اس وقت پانچ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تھا جسے یسوی کارندوں نے مختلف حربے استعمال کر کے پسماندگان سے وصول کر لیا۔ ہمیں اس بات پر توجہ نہیں کہ ڈوبنے والوں کے پسماندگان مختلف مواقع اور جگہوں پر پراسرار انداز میں مردہ پائے گئے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ بگمگ ملتوی کرانے والے لوگ کون تھے؟ ان میں سرفہرست بے پی سورگن کا دست راست اور کاروباری شراکت دار، امریکی سٹیل کے کارخانوں کا مالک ہنری کلمے فرک تھا جس کا کاروبار عالمگیر جنگوں میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر گیا۔ ریلوے لائن اور بحری شپ یارڈ کا مالک جورج ڈبلیو واندر بیلٹ بھی جس نے دونوں عالمی جنگوں میں دور دراز تک ریلوے لائن بچھا اور نئے بحری جہاز بنا کر خوب منافع کمایا۔ امریکن چانکیٹ



امریکی ایک ڈالر پر طبع ہرم اور ایک آگھ

پروڈکشن ہرٹی کا بے تاج بادشاہ ملٹن ہرٹی جس نے دوڑوں عالمگیر جنگوں کے دوران فوجیوں کو چانکیٹ کی فراہمی کا ٹھیکہ کیا۔

امریکا میں اسٹکنازی یہودی زیر نگرانی کام کرنے والی فلمی کمپنیوں نے باقاعدہ فلم انڈسٹری کی شکل اختیار کرنی جسے ہم 'ہالی ووڈ' کے نام سے جانتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے، اس نام کے پیچھے کیا فلسفہ کار فرما ہے۔ ہالی ووڈ کے لغوی معنی ہیں مقدس یا چاروٹی چھڑی... وہی چھڑی جو سحر و افسوں کے دوران استعمال کی جاتی ہے۔ نام ہی سے ان

جنوری 2015ء

تعالیٰ نے انسان کو تندرست رکھنے کی خاطر اللہ بے شمار پھل اور میوہ جات پیدا فرمائے۔ موگ پھل بھی ان میں سے ایک ہے۔ یعنی ہوتی گرم گرم موگ پھل لوگ بڑی زہنت سے کھاتے ہیں۔ یہ عوام و خواص، نوجوانوں، بوزمیں، عورتوں اور بچوں سب کا دل پسند میوہ ہے۔ اسے فریب کا بادام بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں بہ کثرت پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک تیل کا پھل ہے۔ اسے مغز بادام کی طرح شوق سے کھایا جاتا ہے۔ سستا اور خشک میوہ ہے۔ آج کل اس کا موسم ہے۔ اس کا تیل بہت استعمال ہوتا ہے۔

موگ پھل کا آبائی وطن جنوبی امریکا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ایک ہزار سال پہلے آثار قدیمہ کے ماہرین نے بیرو کے ساحلی علاقوں کی کھدائی کی، تو انہیں وہاں موگ پھل کے بھی آثار ملے۔ آج برصغیر پاک و ہند میں دنیا بھر کی موگ پھل کی پیداوار کا ۴۰ فیصد حصہ پیدا ہوتا ہے۔



غریب کا بادام

موگ پھل

گوشت سے بھی زیادہ پروٹین رکھنے والا
اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ بیش بہا غذائی تحفہ

محمد ظہیر چودھری



جنوری 2015ء

اردو ڈائجسٹ 139

نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن وہ ایسے ہوائی جہازوں کے نکرانے سے زمین ہوس ہو گئے جو ان دیوبہکل عمارتوں کے سامنے چمچر کی حیثیت رکھتے تھے۔

دوران خانہ حقیقت یہ تھی کہ لیری سلور شین نامی کروڑ پتی شخص نے ان عمارتوں کا سودا خانہ نوے برس کی افساط پر کیا ہوا تھا اور ان کی انشورنس بھی اسی کمپنی سے کرائی جو نکرانے والے ہوائی جہازوں کی انشورنس کراتی ہے۔ کیا یہ اتفاق ہے؟

واقعہ ٹائن ایون سے ایک دن پہلے نیویارک ہوائی اڈے سے جہازوں کی پروازوں کا خصوصی مظاہرہ کیا گیا۔ اس دوران کنٹرول روم کو آگاہ کیا گیا کہ آج جو کچھ بھی ہوگا، آپ اسے معمول کے مطابق سمجھیے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں مظاہرے کا حصہ ہوگا۔ نتیجتاً اگلے روز یعنی گیارہ ستمبر کو دو ہوائی جہازوں کی غیر معمولی پرواز منظر عام پر آئی، تو کنٹرول روم سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ ایک اور اتفاق؟

۱۱/۹ سے ایک ہفتہ قبل ٹون ٹاورز میں ایک اسکول کی طرف سے کچھ طالب علم خصوصی طور پر آرٹ کی نمائش لگانے آئے۔ انہیں ہر کمرے میں جانے کی کھلی اجازت ملی کہ دروازوں پر مختلف رنگا رنگ چمکدار چیزیں چپکانی لگیں۔ عمارتوں کے طے سے ملنے والی ایسی ہی چیزوں کا جب جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ یہ دھماکا خیز مواد تھا جس کے ذریعے عمارتوں کو گرایا جاتا ہے۔ ایک اور اتفاق؟ یہ تو سچی جانتے ہیں کہ حادثے والے دن مخصوص (اشک نازی) لوگوں کا ایک فرد بھی عمارت میں موجود نہیں تھا۔ ایک اور اتفاق؟

اسی طرح امریکی شہر، اوکلاہوماٹی میں دھماکوں کے دوران بھی کچھ مخصوص لوگ جائے وقوعہ سے غائب تھے۔ ایک اور اتفاق؟



جنوری 2015ء

کا اصل عقیدہ نمایاں ہے۔ یہ قدیمی دیوی دیوتاؤں (فراعنہ مصر) کو پوجنے والے کافر ہیں مگر خود کو (اشک نازی) یہودی ظاہر کرتے ہیں۔ کئی یہودی انہیں اپنے میں سے ماننے کو تیار نہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح اپنے مذموم عزائم کے لیے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔

بال ہوز دولت کمانے کے لحاظ سے کئی صنعتوں سے آگے ہے۔ وہاں باقاعدہ سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کے باہم امتزاج سے ایسی کئی فلمیں بنتی ہیں جو مستقبل کے حالات کی عکاسی کریں۔ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ان فلموں کے بنانے میں بنیادی اولیت اور فوجیت سائنسی تحقیق اور نظریات کو دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں سائنس دانوں کی پوری نیم دن رات سائنسی تحقیق و جستجو میں مصروف رہتی ہے۔ بلکہ مختلف موضوعات کے الگ الگ شعبے قائم ہیں جہاں سائنسی بنیادوں پر مبنی کہانیاں لکھیں اور فلمائی جاتی ہیں۔ یہ محض دیوانے کی بڑبڑ نہیں بلکہ پوری تحقیق و تفتیش اور حقائق پر مبنی کہانیاں ہوتی ہیں۔

ٹائی ٹینک اور ٹون ٹاورز

یہ محض نظریہ ہے کہ ٹائی ٹینک (اولمپک) برہیلی ٹورے سے نکل کر دو نیم ہو گیا۔ جیسا کہ امریکی سرکاری بیان کے مطابق ہوائی جہازوں کے نکرانے سے "ٹون ٹاورز" زمین ہوس ہو گئے۔ اگر اسے سچ مان بھی لیا جائے، تو یہ بات سمجھ اور منطقی سے بالاتر ہے کہ زمین اسی وقت بلڈنگ نمبر سات خود بخود کیسے زمین ہوس ہو گئی؟ حالانکہ اس کے ساتھ پرندہ بھی نہیں لگرایا۔

سادگی اور بے وقوفی کی انتہا دیکھیے، مضبوط بنیادوں پر استوار ٹون ٹاورز کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ انہیں ہوائی جہاز نکرانے یا شدید قسم کے زلزلے سے کوئی

اردو ڈائجسٹ 138

جنوری 2015ء

اس کی پھلیاں زمین کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس کا شمار مغز اور بیج کے زمرے میں ہوتا ہے۔ موٹنگ پھلی کی کاشت سالانہ بنیاد پر ہوتی ہے۔ ایک پھلی میں بالعموم ایک سے تین دانے ہوتے ہیں۔ بعض تو انا اور بڑے ہوتے، بعض کتر اور چھوٹے۔ زمین کے اندر یہ دانے دو ماہ میں پک کر تیار ہو جاتے ہیں۔ پکنے کی صورت میں اس کی بیجوں کو اکھاڑ لیا جاتا ہے۔ چار سے چھ ہفتوں کے دوران یہ مکمل طور پر خشک ہو جاتے ہیں۔

موٹنگ پھلی کے غذائی اجزاء

اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ پھلی گرم خشک ہے۔ لہذا ۱۰۰ گرام موٹنگ پھلی میں غذائی اجزاء کا تناسب حسب ذیل ہے:

ناسورس ۳۵۰ فی گرام، چکنائی ۳۰.۱ فیصد، ٹولار ۲۸.۸ فی گرام، کیمیشیم ۹۰ فی گرام، وٹامن ای ۲۶.۳ فی گرام، کربھیات ۲۵.۳ فیصد، ریٹے ۲.۱ فیصد، رطوبت ۳۰.۰ فیصد، کاربوہائیڈریٹس ۳۶.۱ فیصد اور معدنی اجزاء ۲.۳۱ فیصد۔ کچھ مقدار میں وٹامن بی کپلیکس بھی پایا جاتا ہے۔ ۱۰۰ گرام موٹنگ پھلی میں حراروں کی تعداد ۵۶۷ ہوتی ہے۔

غذائی اور طبی اہمیت

موٹنگ پھلی میں دیگر پھلوں اور سببہ جات کی طرح بے شمار طبی اور غذائی فوائد مضمر ہیں۔ اس میں اعلیٰ درجے کی پروٹین وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ اسی پروٹین کی بنا پر اسے خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ ایک کلوگرام موٹنگ پھلی میں ایک کلوگرام گوشت کی نسبت زیادہ لحمیاتی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ جبکہ اتنی ہی مقدار میں اندوں کے بالمقابل تقریباً اڑھائی گنا زیادہ پروٹین ملتی ہے۔ اسی طرح خیر اور سویا بین کے سوا دیگر کوئی بھی نباتات پروٹین کی مقدار کے سلسلے میں موٹنگ پھلی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس میں پائی جانے والی پروٹین متوازن ہوتی ہے۔ بطور غذا

موٹنگ پھلی کو اگر بغیر بھونے کھایا جائے، تو اسے خوب چبا کر کھائیے کیونکہ اس کو جس قدر زیادہ چبایا جائے، یہ اتنی ہی زیادہ ترور ہضم ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں یہ دیر ہضم ہے۔ یہ موٹنگ پھلی کی خامی ہے۔ لیکن بھون کر استعمال کرنے سے اس کی یہ خامی دور ہو جاتی ہے۔ اسے پکالینے سے نشاستہ مزید قابل ہضم ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ پکانے کی زحمت سے بچنا ہو، تو اسے بھون کر آٹا بنا لیجیے۔

موٹنگ پھلی میں روغن وافر ہوتا ہے۔ اس لیے پیسنے سے یہ کھن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنے سے پیشتر تھوڑا سا خوردنی نمک ضرور شامل کر لیجیے۔ اگر اس کھن کا توام زیادہ گاڑھا ہو تو اس میں پانی وغیرہ نہ مائیے بلکہ پتلا کرنے کے لیے موٹنگ پھلی کا تیل ملا لیں۔

موٹنگ پھلی محض لذیذ غذا ہی نہیں، یہ شفا بخش اثرات بھی رکھتی ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

موٹا پانا

موٹا پانفسہ کوئی مرض نہیں، لیکن بہت زیادہ موٹا پنے سے جسم کئی بیماریوں کو گھیر لیتی ہیں۔ موٹنگ پھلی کے استعمال سے موٹا پنے میں کمی واقع ہوتی ہے۔ دوپہر کھانے سے کچھ دیر قبل مٹھی بھر موٹنگ پھلی (بھنی ہوئی) کھائیے ساتھ ہی بغیر چینی کے چائے یا کالی استعمال کیجیے۔ وزن میں رفتہ رفتہ کمی آ جائے گی۔ یہ نسخہ ہر تنے سے بھوک بھی لگتی ہے۔ نتیجتاً دیگر اغذیہ کے کم استعمال سے وزن بھی کم ہو جاتا ہے۔

زیادہ پیٹیس

اس عارضے میں مبتلا مریض اگر موٹنگ پھلی مناسب مقدار میں استعمال کریں، تو انہیں افاتہ رہتا ہے۔ مریض اگر روزانہ ۵۰-۶۰ گرام موٹنگ پھلی کھالیں، تو وہ غذائیت کی کمی سے محفوظ رہیں گے۔ بیشتر بدن کو دور کارنایا سین کی مقدار بھی پوری ہوتی رہے گی۔

دانتوں اور مسوڑھوں کا علاج

دانتوں کی مضبوطی میں موٹنگ پھلی اکسیر ہے۔ اسے نمک کے ساتھ ملا اچھی طرح چبا کر کھایا جائے، تو مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ یوں مسرت رساں جراثیم کا انسداد ہوتا اور دانتوں کا قدرتی رنگ برقرار رہتا ہے۔ موٹنگ پھلی کھانے کے بعد منہ پانی سے اچھی طرح صاف کر لیں تاکہ اس کے ذرات دانتوں میں نہ رہ جائیں۔

جریان خون اور نکسیر

بعض اوقات چوٹ لگنے سے زخم کی صورت خون مسلسل بہتا اور اسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ موٹنگ پھلی کا متوازن استعمال جریان خون (ہیپوفیلیا) کا کامیاب علاج ہے۔ حیض مقدار میں زیادہ آنے کے عارضے میں بھی موٹنگ پھلی مفید اثرات رکھتی ہے۔

چہرے کی تروتازگی

اس کا روغن حسن و جمال میں اضافے کے لیے مستعمل ہے۔ یہ بیرونی جلد کی نشوونما کرتا اور خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جوانی میں چہرے پر ظاہر ہونے والے کیل مہاسوں، چھانچوں اور کیلوں کی پیدائش روکتا ہے۔ موٹنگ پھلی کے روغن میں مساوی وزن لیموں کا رس شامل کر لینے سے سناج زیادہ بہتر اور حوصلہ افزا نکلتے ہیں۔ رات کو سوتے وقت یہ آمیزہ چہرے پر ملیے،

دکھتی رگ

امریکا میں عورتوں نے ایک نئی ایجاد پر بہت زبردست احتجاج کیا ہے۔ وہ ایجاد کیا ہے؟ ایک ایسا کیمرہ جو میک اپ کے باوجود چہرے کی اصلی تصویر اتارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (شیر سین ہنسر)

تروتازگی نکھار اور شادابی آ جائے گی۔

متفرق امراض

موٹنگ پھلی میں بے شمار فوائد پوشیدہ ہیں۔ مثلاً اس میں بہ آسانی ہضم ہو جانے والا تیل کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہ تیل جلد میں نرمی اور ملائمت پیدا کرتا ہے۔ معتدل طور پر سہل بھی ہے۔ ایسی خواتین جو بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں، ان کے لیے شکر اور دودھ کے ساتھ موٹنگ پھلی کھانا عمدہ اور طاقت بخش غذا ہے۔ اس غذا میں بر طرح کی چھوٹ روکنے کی صلاحیت ہے۔ فی بی اور یرقان کے مریضوں کے لیے یہ نادر روزگار شفا بخش دوا ہے۔

استعمال میں احتیاط

یہ یاد رہے کہ موٹنگ پھلی کو غذا کی جگہ نہ دیجیے۔ بعض محققین کی رائے میں موٹنگ پھلی کے روزمرہ استعمال سے جسم میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو بھولی ہوئی موٹنگ پھلی کھانے سے الرجی ہو جاتی ہے۔ سانس کی تکلیف اور بانٹوسوم ورم کے مریض موٹنگ پھلی کم کھالیں۔ ایذا اگر یہ موٹنگ پھلی نمک ملے پانی میں ابل لیں، تو زیادہ نقصان سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ معدے کے عوارض میں مثلاً اور یرقان کے مریض بھی اس سے گریز کریں۔

ہوئے دن سبھی کو یاد آتے ہیں، مگر یہ میرا بیٹے محبوب مشغلہ نہیں! میں تو اکثر شب تنہائی میں بھی ان دنوں کو یاد نہیں کرتی بلکہ سوچتی رہتی ہوں کہ آنے والے دنوں میں کہاں کہاں تجل خوارگی کرنی ہے؟ بجلی کا بل جمع کرانا ہے، گاڑی مستری کے پاس لے جانی ہے، کسی فنکشن میں جا کر کسی کتاب کی جھوٹی کپی خریدنی ہے، بیان کرنا یا ملکی حالات پر کڑھنا ہے۔

بیٹے دن یاد نہ کرنے کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ میں بچے ہوئے چھوڑوں میں سوئیاں مار کر بے اطف نہی

ہونا چاہتی۔ رفقا کی یاد اور لٹی مفلوں کی دھول سے میرا سانس ٹھنکے لگتا ہے۔

ہاں مگر یہ اقرار ضرور کروں گی کہ بیٹے دن میرے آس پاس سائے بن کر منڈلاتے رہتے ہیں۔ میں شعوری طور پر بے شک انھیں اہمیت نہ دوں، مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں..... اس تھکاوٹ گھوڑے کو بیٹے دنوں کی کچی سنی نے ہی وقت اور تجربے کی بہتی میں پکا کر یہ شکل دی۔

کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند

کیسی ہم بھی خوبصورت تھے

گزرے وقت کی کھٹی میٹھی یادیں جس کا پہیہ اپنا چکر کاٹتا اور سبھی میں قطرہ قطرہ جیون پاشتا ہے

نیلم احمد بشیر



میں خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں۔ دنیاوی طور پر مالدار نہ ہونے کے باوجود ہمارا گھرانا بہت الوکھا اور اٹنا پلٹا تھا۔ میں منہ میں سونے کا چھچھ لیے پیدا ہوئی..... ابا اویب تھے، اس لیے گھر میں ادب کے سٹہرے چمکاتے مہاڑ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ آرٹ، کلچر اور ٹیکنالوجی کی دولت کے دریا گھر ہی میں بہ رہے تھے۔ ایک طرح سے میں نے بہت زرخیز بچپن گزارا۔ یہ خوش قسمتی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

بچپن کی یادوں کے دریاچے دھیرے دھیرے وا ہوں، تو ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے جھونکے چہرے کو نرم نرم ہوتے دیتے ہیں۔ دیکھتی ہوں کہ اسکول ہیڈ ماسٹر دادا جی حقہ گڑ گڑاتے، بستر پر لیٹے ہائیم میگزین پڑھتے نظر آ رہے ہیں۔ دادی اماں مل وار پرانے بنایا جھٹے مٹلے کی لائبریری سے کوئی کتاب لانے بھیج رہی ہیں۔ لائبریری والا کہتا ہے ”کون سی کتاب سمجھوں..... اماں جی نے تو سب کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔“

گھر میں ابا کے ادبی دوستوں کی مٹھلیں تھیں۔ مجھے ان کی عالمانہ فاضلانہ باتیں سن کر بڑا مزا آتا۔ سات آٹھ برس کی تھی جب امی ابا مجھے ابن انشا کے گھر لے جاتے۔ ان کے گھر کمرے میں ایک شیف تھی جس پر بہت سی کتابیں قطار اندر قطار رکھی نظر آتیں۔ میں بڑوں کی نظر پھا کر اس پر چھٹی میں جاگھتی اور مٹھلیوں کتابیں پڑھتی رہتی۔

ایک رات حفیظ جانندھری کے کافمن (کراچی) والے گھر پر کلاسیک موسیقی کی مٹھل ساحل سمندر پر رکھی گئی۔ میں بچی تھی، اسکول یونیفارم ہی میں تادیر ساحل پر بیٹھی رہی۔ موسیقی کے سر سمندری ہواؤں کے سنگ آڑتے رہے..... مجھے بھوک لگی تھی اور غسل خانے بھی

نیلم احمد بشیر ممتاز اویب احمد بشیر (مرحوم) کی صاحبزادی ہیں۔ آپ کے افسانے باقاعدگی سے ادبی رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ آپ نے منفرد اپنی یادوں پر مشتمل زیر نظر تحریر بطور خاص اردو ڈائجسٹ کے لیے بھجوائی ہے۔ اس آپ بیتی میں ادبی چاشنی کی سبک بھی درجی بسی ہے۔



جانا تھا مگر کچھ نہ بولی۔ اس زمانے میں والدین کا رعب ایسا ہی ہوتا تھا۔ بچوں سے کچھ پوچھنا نہ جاتا، بس بتا دیا جاتا کہ انھیں یہ یہ کرنا ہے اور بس.....

ابن انشاء بچوں کی نگلیں لکھتے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ”بلو کا بستہ۔“ اس میں ایک نظم مجھ پر اور میری بہن پر بھی لکھی جس کا عنوان تھا..... ایک نیلی اک پوٹی۔ میں گڑیوں سے کھیلنے والی بچی نہیں تھی۔ اپنی شروع ہی سے دماغ النما تھا۔ کتابیں پڑھتی یا ممتاز مفتی، ابن انشاء، اشفاق احمد جیسے لوگوں کی باتوں پر سرزد ہوتی۔ کالج کے زمانے میں امریکی ناول ”Gone with the Wind“ پڑھا، تو اس کے ہیرو سے محبت ہو گئی۔ وہی میرا آئیڈیل بن گیا۔ مگر آئیڈیل کہاں ملتے ہیں؟ سو وہ بھی نہ ملا۔

ہمارے ابا نے گھر میں نظام سادات رائج کر رکھا تھا۔ میں دودھ پیتی بچی تھی، تو ابا کا حکم تھا کہ نیلم کو صرف ماں شہیں بلکہ نوکرائیوں اور مہترانیوں کا بھی دودھ پلایا جائے۔ ان کا کہنا تھا، ہر ماں ایک جیسی اور ہر ایک کا



دردِ سفید ہوتا ہے..... چنانچہ کئی نوکریوں اور جعداریوں کے بچے میرے رضاعی بہن بھائی بن گئے۔ شاید اسی لیے میرا مزاج بھی ہمیشہ عاجزانہ رہا۔ میں کبھی کسی اونچائی پر نہ پہنچ سکی۔

ابا کا یہ بھی حکم تھا کہ گھر میں جو ملازم رکھو، اسے پڑھایا جائے۔ لہذا ہم سب بچوں کی ڈیوٹی لگی رہتی کہ کسی ملازم کو کام کے بعد فارغ نہ بیٹھنے دیں۔ ہم ہمیشہ گھریلو ملازمین کو قاعدے اور اسے نبی ہی پڑھاتے پڑھاتے بڑی ہوئیں۔ مجھے ایک خاص الخاص ڈیوٹی سونپی گئی جس سے شدید کوفت ہوتی۔ گھر میں رکھے جانے والے ملازم جن میں مردوزن شامل تھے، جب گاؤں جاتے اور اوستے تو اکثر بتاتے کہ انہیں فلاں بیماری چٹ چکی یا کتے نے کاٹ لیا۔ بس یہ سنتا تھا کہ ابا مجھے حکم دیتے "تیلیم! اسے اسپتال لے کر جاؤ اور مجھے لگواؤ....." میں دل ہی دل میں کڑھتی طوعاً کرہاً ملازم کو ساتھ لیتی اور چند روز ہلانامہ اسے پیٹ میں نیکے لگوانے جاتی۔

آج سوچتی ہوں تو اپنے اوپر ترس آتا ہے اور یہ خیال بھی کہ آج کوئی باپ اپنی بیٹی کو نہ ایسا کام کہتا ہوگا اور نہ وہ اسے کرنے پر رضا مند ہوگی۔ دراصل ابا کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹیاں خود اعتماد بن جائیں۔ اچھا کھانا کھانے کا بھی چکا تھا۔ ایک روز ان کا جی چاہا کہ آج گھر میں مرغی پکائی جائے۔ اس زمانے میں چکن کو مرغی یا کلووی کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے گھر میں کلووی نہ تھی کیونکہ فریج نہیں تھا۔

مجھے بلایا اور کہا "دو نمبر بس پر چڑھو، ٹولٹن مارکیٹ جاؤ اور ایک مرغی خرید کر لاؤ۔" میں بارہ برس کی تھی۔ کرشن نگر سے اکیلے ٹولٹن مارکیٹ جا کر مرغی خریدنے کے خیال سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر ابا کو انکار نہ کیا جا

سکتا تھا۔ ذہل و بیکر کی بالائی منزل پر بیٹھی آنسو بہاتے میں سوچتی رہی کہ میرا باپ کتنا عقلم ہے جو اکیلے ہی مجھے سوئے دار بھیج رہا ہے۔ خبر نہ تھی کہ مجھے زندگی میں آگے چلنے اور تنہا سارے کام کرنے کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔

میرے اندر دو بڑی خراب عادتیں تھیں جو اب تک ختم نہ ہو سکیں۔ ایک یہ کہ مجھے بات بے بات رونا آ جاتا۔ گھر والے باقاعدہ فرمائش کر کے چھیڑتے اور کہتے "چل بھئی تیلیم رو رو کر دکھا۔" اور میں رونا شروع کر دیتی۔ رونا دراصل مجھے اس بات پر آتا کہ میں اتنی کمزور کیوں ہوں کہ کسی کے کہنے پر جھٹ رونا شروع کر دیتی ہوں۔ اب بھی یہی حال ہے۔

دوسری بری عادت یہ تھی کہ مجھ سے برتن بہت ٹوٹتے، مگر امی ابا سے اس بات پر کبھی ڈانٹ نہ پڑی۔ ابا تو باقاعدہ نالیاں بجاتے یوں جیسے میں نے سرکس کا کوئی کرتب دکھایا ہو..... اس پر مجھے اور رونا آتا۔ شادی کے بعد پیاگھر سدھاری، تو شوہر نے میرے ابا سے شکایت کی "آپ کی بیٹی برتن بہت توڑتی ہے۔"

ابا بولے "ہاں یہ برتن توڑتی ہے..... مگر کسی کا دل نہیں توڑتی۔"

شوہر نے سوچا "یہ بڑے پاگل لوگ ہیں..... عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں..... کیسے غلط خاندان میں شادی ہو گئی ہے میری!"

انہیں یقین آ گیا کہ تیلیم کی تربیت غلط ہوئی ہے اور یہ اصلاح کے بھی قابل نہیں۔ چنانچہ کیس بگڑ گیا۔

میں نے بی اسے پاس کرنے کے بعد نصیات میں ایم اے کرنے کا ارادہ کیا۔ نیو کیسپس دیکھتے ہی جھٹ اس میں داخلے لے بیٹھی۔ کیا خوبصورت خواہوں کی مگر جیسی جگہ تھی وہ! شہر سے دور، پُر سکون، خاموش، سرسبز

اور چند بد طرز تعمیر والی عمارت۔ میں دن و جان سے اس پر مرمی۔

ہم جماعت لڑکے لڑکیاں اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے گپیں ہانکتے..... اپنے اپنے پابند گھروں سے نکل کر جلس مخالف کو مانا، عام انسانوں کی طرح ان سے بات چیت کرنا اور ہونا نہ سمجھنا بہت اچھا لگتا۔ کبھی ہم کینٹین میں چائے پیتے، شہر کنارے بیچ کر گھانے گاتے اور کبھی کشتیوں میں سیر کرتے۔ لڑکے چوہ چلاتے، تو ہم لڑکیاں اپنے آپ کو کسی پاکستانی فلم کی ہیروئن سمجھنے لگتیں۔ وہ بھی کیا دن تھے!

مجھے یاد ہے، ایم اے کے زمانے میں، میں نے پہلی بار برگر اور چینی کھانے کھائے، تو بہت ہی سزا آیا۔ اس وقت پہلی بار یہ بھی پالاگا کہ کھانے کے ساتھ پانی ہی نہیں، بوتل بھی لینی جاتی ہے۔ اس سے پہلے میں سمجھتی تھی، بوتل صرف مہمانوں کو پلائی جاتی ہے۔ میرے لیے وہ نئی، جیراں کن اور خوشگوار دنیا تھی۔

ایک بار بس میں یونیورسٹی جا رہی تھی تو مال روڈ سے گزرتے ایک کار پر نظر پڑی۔ اس میں بھٹو صاحب سوار تھے۔ وہ ہمارے آئیڈل تھے۔ میں نے شور مچا دیا "بھٹو، بھٹو، بھٹو!" بس میں بیٹھے کبھی طلبہ و طالبات انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگے۔ انہوں نے بھی مسکرا کر جواباً ہاتھ ہلایا..... مہری رنگوں میں خون روڑ گیا۔ تب حکمران عام لوگوں کی طرح عام گاڑیوں میں سفر کر لیا کرتے تھے، مگر وہ دن بہت گئے۔

یونیورسٹی میں لڑکیاں فلپیر سمیٹی تھیں اور لڑکے جینز ٹی شرٹ وغیرہ! بھٹو صاحب کا عوامی سوت شلوار قمیض بھی فیشن کے طور پر پہنا جاتا۔ لڑکے لڑکیوں کی سنڈلیاں تیلیوں اور بھنوروں کی طرح ادھر سے ادھر اڑتی پھرتیں۔

رنگ باتیں کرتے تھے۔ دنیا جی الدین نے کہیں کا کوٹ پہن کر ٹی وی پر شو شروع کیا۔ جب وہ کہتے "ڈرامٹیکا تو لگاؤ۔" تو طبلے بجنے کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر بھی کھلبلی مچ جاتی۔

پچھلے سال جانے میرے جی میں کیا پائی، چالیس سال بعد اچانک یونیورسٹی کے نیو کیسپس جا پہنچی جو اب اتنا بیونیس رہا، وہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ میری عمر اور وضع قطع کی کوئی عورت شاید اب وہاں نظر نہیں آتی، اس لیے سب نے مجھے غیب نظروں سے گھورا۔ ایک اجنبی سی سرزمین تھی اور میں۔ نقاب میں ملبوس لڑکیاں اور اونچی شلواروں والے لڑکے الگ الگ گتھوں اور گھاس کے قلعوں پر بیٹھے تھے۔ مگر اب گھاس کی جگہ وہاں ٹنگی زمین تھی۔ راہداری کے ایک مخصوص حصے میں کھڑی ہو کر میں نے اس طرف نگاہ دوڑائی جہاں ٹیبل ٹینس کھیلا جاتا تھا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اب اس جگہ ٹوٹو کا پی کی مشین نصب تھی۔

کیسپس کے آغاز میں کھڑے بوڑھے برگڈ نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے پتے مجھے دیکھ کر وحیے، وحیے مسکرا دیے۔ لڑکے لڑکیاں کانوں سے سیل فون لگائے مصروف نظر آئے، میں نے سوچا، بٹے فون میں محبت سیل فون، انٹرنیٹ اور کار کے بغیر بھی ہو جاتی تھی۔

زندگی کی کہانی لمبی ہے..... ہمیں سارے بیٹے دن خوبصورت لگتے ہیں۔ دلت کا پیسہ اپنا چکر کاٹنا اور سب میں قطرہ قطرہ حیوان بانٹنا ہے۔ یہ دن بھی اچھے ہیں کیونکہ میں زندہ ہوں۔ زندگی ایک تحفہ ہے اور تحفہ ایک خوشی! جب تک جان سلامت ہے، سب اچھا ہے۔ میں وقت کی ہوں اور وقت میرا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ پہلے دل میں درد ہوتا تھا اور اب ہڈیوں میں!

طلبہ جان کی بازی ہار جاتے۔
خاص طور پر ایس ایس جی (ایٹنشل سروسز گروپ) کے جوانوں نے جس دلیری اور شجاعت کا ثبوت دیا، وہ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ہر حملہ آور کو ٹوٹکا کالے لگایا اور کوئی بھی ان کی زد سے بچ کر فرار نہیں ہو سکا۔

میں ان تمام جوانوں کو ہدیہ تحریک پیش کرتا ہوں جو دہشت گردوں کے سامنے سیدہ پلائی دیوار بن گئے۔ میری تمام ہم وطنوں سے اپیل ہے کہ سیکرٹری فورسز پر تنقید کے بجائے ان کی بہادری اور فرض شناسی کو سراہا جائے۔

اگر تحریک طالبان پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ وہ حملے سے پاکستانی قوم اور پاک فوج کو فوج زدہ کر دے گی، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے غلط دشمن کا انتخاب کیا ہے۔

میں اپنی بیگم کی شہادت کے باعث دل گرفتہ ہوں۔ آخر انسان ہوں اور اپنی ایک قیمتی ستارہ کو بیٹھا۔ مگر میں ہرگز خوفزدہ نہیں اور نہ ہی مجھے کسی قسم کی ٹھیکرہٹ سے بلکہ دہشت گردوں سے مقابلہ کرنے کا میرا جوش و دلائی کئی گنا زیادہ بڑھ گیا۔

مجھے فخر ہے کہ میری بیگم نے دلیری سے جام شہادت نوش کیا اور دہشت گردوں کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ انھوں نے بے مثال بہت کا مظاہرہ کر کے اپنے خاندان ہی نہیں پوری قوم کو سرخرو کر دیا۔ نیز وطن عزیز میں مثبت تبدیلی کی نقیب بن گئیں۔

آخر میں مع اہل خانہ میں ان تمام خواتین و حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مشکل گھڑی ہمارا دھکا بانٹا اور ہمیں دوسلا دھکا دیا۔

سہما تم نے دین و وطن کی خاطر اپنا لبو بہا دیا اور قرآن پاک کے مطابق تم ابدی زندگی پا چکیں۔ تم ہمیشہ ہماری یادوں میں ایسی رہو گی اور ہم تاحیات تمھاری عدم موجودگی محسوس کرتے رہیں گے۔

ترہیت میں پھر پور حصد لیں۔ چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے انھیں آرمی پبلک اسکول میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ وہ نرم لہجے میں گفتگو کرنے والی خاتون تھیں جن سے سبھی بچے محبت کرتے تھے۔ رحم دل تھیں اور اپنے کام سے مخلص!

جب ۱۶ دسمبر کو دہشت گردوں نے حملہ کیا، اسی دن سے خصوصاً سوشل میڈیا میں سامنے سے متعلق مختلف افواہیں اور کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ سیمانے طلبہ کی زندگیوں بچانے کے لیے حملہ آوروں کا ہمت سے مقابلہ کیا، حتیٰ کہ اپنی جان قربان کر دی۔

شہادت کا یہ واقعہ جس شکل میں پیش آیا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس کا ذکر مجھے اذیت و درد سے دوچار کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ دہشت گردوں نے انھیں زندہ جاوید کیا تھا۔

سوشل میڈیا میں اس بات کا بھی چرچا ہوا کہ پاک فوج کے جوان کچھ دیر بعد اسکول پہنچے۔ مزید برآں بہادری سیکرٹری فورسز پر ہمد اقسام کی تنقید بھی ہوئی۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ پشاور کے صرف کینٹ ایریا میں ۸۳ اسکول واقع ہیں۔ جبکہ شہر میں اسکولوں کی تعداد کئی سو تک جا پہنچتی ہے۔ چونکہ افرادی قوت محدود ہے، اس لیے تمام اسکولوں کو دہشت گردوں سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا۔

سانحہ پشاور نے میری دنیا اندھیر اور میرا خاندان اجاز دیا۔ تاہم حملے کے بعد سیکرٹری فورسز خصوصاً پاک فوج کے جوان جس پھرتی و مستعدی سے اسکول پہنچے، اس پر میں انھیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

تنقید کرتے ہوئے ہم یہ سچائی فراموش کر بیٹھے کہ جب حملہ آور داخل ہوئے، اسکول میں ۱۱۰۰ بچے موجود تھے۔ ان میں سے ۹۵۰ کو بحفاظت نکال لیا گیا۔ اگر ہمارے جوان اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر مردانہ وار "دورندوں" کا مقابلہ نہ کرتے تو نجانے مزید کتنے ہی



سانحہ پشاور



شہید بچہ اپنے شوہر کے ساتھ

ہمت و دلیری کی تابندہ نشانی

مجھے اپنی بیگم پر فخر ہے

سامنے میں شہید ہونے والی ایک اُستانی کے شوہر
دل گداز انداز میں اپنے قلبی تاثرات بیان کرتے ہیں

برگیزہ خیر طارق سعید

پبلک اسکول میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ ایک ماہر تعلیم تھیں۔ پچھلے سولہ برس سے آرمی اسکولوں میں طلبہ و طالبات کو فوجیہ تعلیم سے آراستہ کر رہی تھیں۔

جب میری تعیناتی پشاور میں ہوئی، تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ بیگم و باں اپنی ملازمت جاری نہیں رکھیں گی۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی توانائی اپنی ایجنڈا لڑی ڈگری کے حصول میں صرف کریں۔

مگر سہما کو دوس دتہ دہلیس کے عظیم کام سے عشق تھا۔ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ وہ فوجیوں کی تعلیم و

قومی تاریخ میں "منقوط مشرقی پاکستان" کے باعث ۱۶ دسمبر کا دن اداس و غمگین سمجھا جانا ہے۔ لیکن اب پاکستانی قوم خصوصاً بہت سے لوگ اسے سانحہ پشاور کے باعث بھی یاد رکھیں گے۔ ہمارے لیے منقوط مشرقی پاکستان کی طرح یہ بھی انتہائی دلہوز اور اذیتناک واقعہ ہے۔ اس سانحے نے قوم کو بری طرح متاثر کیا جو عوام کے شدید رد عمل سے عیاں ہے۔

سانحہ پشاور میں میری بیگم، سیمانے بھی جام شہادت نوش کیا۔ انھوں نے صرف ایک ماہ قبل ۵ نومبر کو آرمی



طالبان کا مکمل صفحہ

کچھ ایڈیٹروں، کالم نگاروں اور فی وی اینکرز نے خطیہ ایجنسیوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ دہشت گردوں کی پشت پناہی کرتی اور انھیں اپنا اثاثہ سمجھتی آئی ہیں، اسی لیے ان کے خلاف نتیجہ خیز آپریشن کرنے سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔ بعض دوستوں نے یہ بھی کہا کہ ریاست کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ آج ہم مذہبی شدت پسندی اور دہشت گردی کے جس الاؤ میں چل رہے ہیں، وہ اسی اقلیت کے نتیجے میں ساہیسا سال سے دکھ رہا ہے۔

ایک دانش ور سہانی نے یہ نکتہ اٹھایا کہ پاکستان طالبان کا موقف یہ ہے کہ پاکستان افغانستان میں غاصب فوجوں کی اعانت کر رہا ہے، اس لیے ہم اس سے لڑنے پر مجبور ہیں۔ اب غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب افغانستان میں ہر سر جنگ طالبان سے مذاکرات کیے جا سکتے ہیں، تو پاکستانی طالبان سے کیوں نہیں؟ ایک دماغی یہ بھی تھی کہ طالبان کا مکمل صفحہ ہونے تک پاکستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا گا۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، مارچ ۱۳ء، صفحہ ۲۱)

غلط پالیسیاں

ہمارے مسائل بہت گہرے اور الجھے ہوئے ہیں۔ ساتھ پینسٹ برسوں کی نااہلیوں اور حماقتوں نے پاکستان میں انتہا پسندوں، دہشت گردوں اور غلطی پسندوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ہماری خود غرضیوں، ہولناکیوں اور عوام دشمنیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اختصار کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری حشر قیادتیں جن میں سیاسی اور عسکری برابر کی شریک ہیں، معاشرے

یہ تحریریں آشکارا کرتی ہیں کہ ہم مسلسل ارباب اقتدار کو خیرداد کر رہے تھے کہ ”سانحہ پشاور“ جیسا انتہائی الم ناک واقعہ کسی بھی وقت ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ عوام دشمنی کو ہمیشہ دی گئی کہ اگر ہوش سے کام لے کر انتہا پسندی پر قابو نہ پایا گیا، تو یہ ہولناک صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ذیل میں انہی انتہائی تحریروں کا آنکھیں کھول دینے والا انتخاب پیش خدمت ہے۔

واضح سمت کا فقدان

دہشت گردی اور فرقہ پرستی کے زائعات آپس میں گڈبڈ ہو چکے ہیں جن کے سامنے حکومت بے بس دکھائی دیتی ہے اور قومی سلامتی کے حوالے بھی ہر لحظہ دباؤ میں ہیں۔ اس خون آشام صورت حال کے بارے میں معاشرے کے اندر گہری نشوونما تو پائی جاتی ہے مگر ہماری قومی قیادت، ہماری عدلیہ اور ہماری فوج ایک واضح سمت اختیار کرنے سے گریزاں ہیں۔ ہمارے بعض سیاسی اور مذہبی قائدین اسی ہولناک دہشت گردی کو امریکی سازشوں کا شاخسانہ قرار دے رہے ہیں اور انہیں فرقہ وارانہ تشدد میں بھی سراسر غیر ملکی طاقتوں کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔

ان کے خیال میں امریکا اور برطانیہ کی ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں حریت پسند لوگ اپنی آزادی کے لیے خود کش حملوں کا ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہیں، جن کے جذبوں اور قربانیوں کا احترام کیا جانا چاہیے۔ انہیں اس امر کا بھی پورا یقین ہے کہ افغانستان میں تائب فوجوں کے انخلا سے دہشت گردی ختم ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ تشدد بھی رک جائے گا، اس لیے امریکا اور اس کے حواریوں کے خلاف جہادی سرگرمیاں تیز تر کر دینا ہمارے تمام تر مسائل کا حل ہے۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، مارچ ۱۳ء، صفحہ ۱۶)

اردو ڈائجسٹ 149

جنوری 2015ء



وقت سے پہلے ہی جنم لیتی

سانحہ پشاور کی مہیب گونج

نوبل
انعام یافتہ فیشن طبیعیات دان، نوبل پور کا نوبل ہے۔ پیشین گوئی کرنا بہت سخیں کام ہے، خصوصاً جب وہ مستقبل کے متعلق ہوں۔ تاہم صاحبان نقل و دانش اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر مستقبل کے اندر جھانکنے کی سعی ضرور کرتے ہیں۔ اس حقیقت کی ایک مثال اردو ڈائجسٹ کے ساتھ شماروں میں شائع ہونے والی تحریروں اور اشعار ہیں۔

اردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ تحریروں سے ان چشم کشا اقتباسات کا انتخاب جن میں قومی ایسے کی پیشین گوئی کر دی گئی تھی اور ایسے سانحات سے نمٹنے کے لیے قابل عمل تجاویز بھی بتائی گئی تھیں

سجاد قادر



اردو ڈائجسٹ 148



کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات کے مطابق ڈھالتے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھیں، کیونکہ انھیں اپنی اصل طاقت بنانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ تعلیم، صحت اور ذرائع آمد و رفت کی بنیادی ضرورتوں پر بجٹ کا بہت کم حصہ خرچ کیا گیا اور معیاری تعلیم کے ذریعے معیاری قوم کی تعمیر کبھی اولین قومی ترجیحات میں شامل نہ ہو سکی۔ ایسی اقتصادی پالیسیاں وضع کی گئیں جن سے امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے گئے۔ ایوب خاں کی معاشی خوشحالی کا ما حاصل یہ تھا کہ بائیس خاندان پورے ملک وسائل کے مالک بن گئے۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، اکتوبر ۱۳، صفحہ ۲۵)

کچھ تجاویز

ہم ان خوں آشام حالات میں بہتری لانے کے لیے چند تجاویز پیش کرتے ہیں:

۱۔ کراچی ہو یا بلوچستان یا فاطما، ان میں خونریزی اور قتل و غارتگری کی جو المناک صورت حال بن گئی ہے، وہ جیسے تیس برسوں کی غلام یا غیر متوازن پالیسیوں کا نتیجہ ہے، اس لیے ان کی اصلاح کے لیے ہمیں تمام اسٹیک ہولڈرز کی مشاورت سے ایک طویل المدتی منصوبہ تیار کرنا اور پوری مہارت قدمی سے اسے عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ آج کی انتہائی دھماکا خیز صورت حال کے تجزیے کے لیے ایک قومی کمیشن تشکیل دینے کی ضرورت ہے جس میں جہاں دیدہ سیاست دانوں کے علاوہ عمرانی علوم کے ماہرین، جدید فکر کے حامل علمائے کرام، صحافی اور دانشور بھی شامل ہوں۔

اس کمیشن میں اچھی شہرت رکھنے والے ریٹائرڈ پولیس اور فوجی افسروں اور سفارت کاروں کی بھی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس کمیشن کو ساجیات اور

اردو ڈائجسٹ 150

سیاسیات پر تحقیق کرنے والے اہل علم کی اعانت حاصل ہونی چاہیے۔ یہ کمیشن حکومت کو فوری اقدامات کی بھی سفارش کر سکے اور ان انتظامات کی بھی جن کے ذریعے امن کی قوتوں کو استحکام حاصل ہو اور مائنڈ سیٹ میں جو بری تبدیلی واقع ہو۔

۲۔ گزشتہ دس پارہ برسوں سے دہشت گردی کا مقابلہ، فوج، پولیس اور ایف سی کر رہے ہیں۔ انھوں نے کمال بہادری اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا ہے اور ہماری تاریخ ان کی قربانیوں سے دمک رہی ہے۔ وہ فرنٹ لائن پر ہیں اور اسے پی سی کے ذریعے انھیں زبردست سیاسی کمک پہنچی ہے۔ اگر پوری قوم کی حمایت سے مذاکرات کامیاب ہو جاتے ہیں، جن کے قومی امرکانات پائے جاتے ہیں، تو اس کے غیر معمولی داخلی اور خارجی اثرات مرتب ہوں گے دہشت گردی کے خلاف جنگ ستمبر ۲۰۰۱ء سے جاری ہے جس کے نتیجے میں پاکستان پہلے سے زیادہ زخمی نظر آتا ہے۔

ہم اگر حکومت اور معاشرے کی سطح پر اسلامی شعائر کا احترام پوری طرح کر سکیں اور وہی آئی پی کلچر کے مظاہر کم کرتے جائیں، تو مذاکرات کے لیے تیس میں سے تیس بچیں گے۔ ضرورت تیار ہو جائیں گے۔ سیاسی قیادت کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مذاکرات میں عسکری قیادت ہی کلیدی کردار ادا کرے گی اور عسکری قیادت کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فوج اس وقت "دارنوں" میں ہے۔

۳۔ سیاسی اور فوجی قیادتیں حساس پوائنٹس پر دباؤ بڑھا کر دہشت گرد تنظیموں کو اس معاہدے پر رضا مند کر سکتی ہیں کہ وہ عبادت گاہوں، ہسپتالوں، شہری، بستیوں، ریل گاڑیوں اور بسوں پر راکٹ برسائیں گے، نہ خودکش حملے کریں گے، نہ فرقے اور نسل کی بنیاد پر عورتوں اور بچوں

کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اس کے عوض حکومت کی طرف سے عام معافی کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ داخلی سیکورٹی کی بنیادی ذمہ داری پولیس کی ہے جو اس وقت ایک سے زیادہ بحرانوں کا شکار ہے۔ سیاسی حکومتوں نے اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے ہزاروں کی تعداد میں سیاسی بنیادوں پر بھرتیاں کی ہیں جن سے اس فوری کی غیر جانب داری بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ دوسری طرف جب یہ دیانت دار فرض شناس افسر مجرموں پر ہاتھ ڈالتے ہیں، تو ممبران اسمبلی انھیں چھڑا کر لے جاتے ہیں۔ تیسرا طرف پولیس میں کرپشن عام ہے اور وہ پیسے بٹورنے کے لیے عام آدمی پر ظلم ڈھاتی ہے۔ چنانچہ پولیس اور عوام کے درمیان اعتماد کا رشتہ ٹوٹا ہوا ہے۔

چوتھی طرف اس کی ٹریننگ پرانی طرز کی ہے اور اس کے ہتھیار دہشت گردوں کے مقابلے میں نہایت فرسودہ اور غیر موثر ہیں۔ خطرناک حالات متقاضی ہیں کہ بتدریج ایک نئی پولیس فورس تیار کی جائے جس کی ٹریننگ اور ملازمت کے قواعد فوجی معیار کے ہوں۔

۵۔ سب سے ضروری بات یہ کہ میڈیا دہشت گردی میں آہ دتاب پیدا کرنے سے اجتناب کرے۔ ایک ہی منظر بار بار دیکھنے سے عوام ذہنی مریض بن جانے کے ساتھ ساتھ دہشت زدہ نظر آتے ہیں۔ نئی وی جینلز پر ایسے پروگرام پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کی صحیح روح ناظرین تک پہنچائی جائے اور ایک ایسی فضا تیار کی جائے جس میں عوام اپنے اندر مزاحمت کی طاقت پیدا کریں اور مجرموں اور دہشت گردوں کے سامنے فوری طور پر سر نہ رنہ کریں۔ جرائم پیشہ عناصر اور انتہا پسند بنیادی طور پر بڑے بڑوں ہوتے ہیں۔ ہمیں نوجوانوں کے لیے صحت مند سرگرمیوں کا ایک جال بچھانا

اردو ڈائجسٹ 151

اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا رخ ایک عظیم اور منصوبہ ریاست کی تعمیر کی طرف موڑ دینا ہوگا۔

وزیراعظم نواز شریف نے ان کے لیے تجھے منصوبوں کا اعلان کیا ہے جو ہمارے وطن عزیز کی تقدیر بدل سکتے ہیں، مگر اس کے لیے بڑے خلوص، پوری شفافیت اور قومی وسائل کے نہایت عمدہ استعمال کا عملی ثبوت دینا ہوگا۔ محبت، غنودہ و گزراور حسن تدبیر سے ایک دنیا فتح کی جاسکتی ہے۔ (پانچا کے زیر اہتمام ایک سیمینار، ہم کہاں کھڑے ہیں، اکتوبر ۱۳، صفحہ ۲۵)

قابل عمل روڈ میپ

پنجاب کے سواتیوں صوبے دہشت گردی اور سنگین مسائل کی لپیٹ میں ہیں۔ بلوچستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے علاوہ لاپتہ افراد اور سب شدہ لاشوں کا معاملہ سکھمیر اور بچیہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک انتہائی رپورٹ کے مطابق جسٹس (ر) جاوید اقبال کی سربراہی میں لاپتہ افراد پر جو کمیشن قائم ہوا تھا۔ اس نے ایف سی، خفیہ ایجنسیوں اور پولیس کے حاضر سرورس حکام پر فوجداری کے مقدمات قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ سندھ میں کراچی کا زخم ناسور بنتا جا رہا ہے اور آئے دن لوگ قتل اور اغوا کیے جا رہے ہیں اور بد امنی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ خیبر پختونخواہ میں بھی حالات بڑے سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھر وفاق دارالحکومت اسلام آباد لینڈ مافیا کے نرنے میں ہے اور ایک انتظامی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ ان حالات میں جناب وزیراعظم پر لازم آتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر قیادت فرمائیں اور صوبوں میں امن و امان قائم کرنے کے لیے مثبت قوتوں کو قومی باہت قائم پر جمع کریں اور اپنی خونے ڈنڈا زری سے انھیں شہرہ شکر کر دیں۔

نوری 2015ء

پاکستانی طالبان سے مذاکرات کی بات بیشتر سیاسی قائدین کرتے آئے ہیں، مگر اس کا ایک قابل عمل روڈ میپ تیار کرنے میں بعض رکاوٹیں حائل ہوتی رہی۔ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عسکر کی قیادت کے علاوہ ملک میں ایک بڑا طبقہ ان عسکریت پسندوں سے مذاکرات کے حق میں نہیں جو دستور پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے، جمہوریت کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں اور ملک میں ایک ایسی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں جسے عداوت المسلمین قبول کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ دہشت گردوں نے ہمارے ہزاروں فوجی جوان اور افسر شہید کیے ہیں اور چالیس ہزار سے زائد شہری موت کی نیند سلا چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں مسجدیں محفوظ ہیں نہ امام بارگاہیں، نہ جنازے کی نماز ادا کرنے والے غم گسار۔

ایسے میں نکتہ آغاز کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، تاہم صورت حال میں جو ہری تبدیلی یہ آئی ہے کہ امریکا افغان طالبان سے قطر میں باقاعدہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے والا ہے۔ اس بنیاد پر پاکستانی طالبان کو تشدد کی روش چھوڑنے پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ فوج نے جنوبی وزیرستان میں ان کی طاقت پر کاری ضرب لگائی ہے اور اس امر کا امکان پیدا ہو چلا ہے کہ انہیں افغانستان سے نکل پھینکا جاسکے۔ پاکستانی طالبان چوں چوں کا مرہب ہیں اور ان کی باقاعدہ ہائی کمان موجود نہیں۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ان میں سے ایک خاصی بڑی تعداد علمائے کرام کے سمجھانے سے راہ راست پر آجائے اور بارڈر کو درجہ رو جائیں۔ انہیں یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ پاکستان کے دستور میں جو اسلامی اصول درج ہیں، ان کے مطابق معاشرے کی تعمیر کی جائے گی۔ (کچھ اپنی زبان میں، شمارہ جولائی ۱۳ صفحہ ۱۹)

جارحانہ حکمت عملی

آج ہمارا وطن شدید اندرونی اور بیرونی خطرات کا شکار ہے۔ مشرقی سرحدوں پر بھارت کے ساتھ جھڑپیں شدت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور آئے دن دونوں اطراف جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے۔ طویل اور دشوار افغان بارڈر پر محاذ سرد ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ افغانستان سے امریکی اور نیو انوائج کا اخلا اور اس کے بعد کی صورت حال ابھی تک واضح نہیں ہو پا رہی۔ بھارت، افغانستان میں وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کر چکا ہے اور مستقبل میں افغانستان میں اپنی سادھ کے حوالے سے مضطرب ہے جس کے تانے بانے بلوچستان میں دہشت گردی کے واقعات سے ملتے ہیں۔ بلوچستان کے حالات پر حکومت کی طرف سے ابھی تک کوئی خاطر خواہ لائحہ عمل سامنے نہیں آسکا اور ہماری انوائج اور سیکورٹی فورسز سپریم کورٹ کے سامنے اپنا افراد کے حوالے سے جوابدہی کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔

کراچی کے حالات پر ہر محبت وطن کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ہر روز دس، بارہ افراد کا قتل معمول بن چکا ہے۔ ڈی آئی خان میں جیل توڑ کر قیدیوں کے فرار کا واقعہ ہو یا اسلام آباد میں ایک شخص کا جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہو کر قانون کے رکھواؤں کو چیلنج کرنا، ہماری اندرونی سیکورٹی پر بڑے سوالیہ نشان ہیں۔ امریکی انوائج کا ایٹم آباد میں اسامہ بن لادن کے خلاف آپریشن ہو یا اردن کے ذریعے بے گناہوں کی ہلاکت قوم کو اعتماد میں نہیں لیا جا رہا۔ اب تک دشمن کا نقصان کیوں نہیں کیا گیا؟ پچاس ہزار معصوم شہریوں کی شہادت کے ذمہ دار کون ہیں؟

ایک ایسی جارحانہ حکمت عملی جس پر وطن عزیز کی

تمام سیاسی جماعتوں کا اتفاق اور جس کے قابل عمل ہونے کا انوائج پاکستان کو یقین ہو، تیار کر کے قوم کو ذہنی و جسمانی تربیت کے ذریعے دشمن کے خلاف صف آرا کرنا ہوگا۔ عام شہریوں کی جسمانی تربیت کے لیے شہری دفاع کے محکموں کی از سر نو تعمیر، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کو فوجی تربیت جیسے NCC اور اسکاؤٹنگ وغیرہ کا احیاء اور وطن سے محبت کے جذبے کو قوم کے دلوں میں بیدار کرنے کے لیے میڈیا کے ذریعے "نشان حیدر" جیسے ڈراموں، ٹیلی فلموں، 23 مارچ کے موقع پر مسلح انوائج کی پریڈ اور وفاقی ساز و سامان کی نمائش جیسے پروگرامز وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ (نیشنل اینڈیٹرنوٹ، شمارہ ستمبر ۱۳ء)

دشمن نگاہی کو چوں میں

"کھلی جنگ" کے بارے میں یہ تلخ حقیقت پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ یہ ایک انتہائی پیچیدہ معاملہ ہے کیونکہ داخلی دشمن ہمارے گھر کے اندر چھپ گیا ہے اور وہ نگلی کوچوں، شہروں اور قصبوں تک پھیل چکا ہے جسے بیرونی طاقتوں کی سرپرستی بھی حاصل ہے جو پاکستان کو شدید عدم استحکام سے دوچار کر دینا چاہتی ہیں چنانچہ وہ ان دہشت گردوں کو فنڈز اور اسلحہ فراہم کرتی اور طرح طرح کے تقاضات اور تنازعات کو ہوا دیتی رہتی ہیں۔ ان عسکریت پسندوں نے مذہبی جنون پیدا کر کے نوجوانوں کو جنت میں داخل ہونے کے خواب دکھائے ہیں اور مسلمانوں پر کافروں کے لیبل چسپاں کر دیے ہیں۔

غربت، جہالت اور پوس ماہنگی بھی دہشت گردی میں اضافے کا باعث بنی ہوئی ہیں جبکہ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات بالائی طبقات کی غیر اسلامی زندگی کے خلاف شدید نفرت رکھتے اور پورے نظام کو تلپٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں "کھلی جنگ"

میں یقینی کامیابی حاصل کرنے کے لیے عام شہریوں، ہماری پولیس، ہماری سول آرمڈ فورسز، ہماری مسلح انوائج اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان مثالی کوآرڈینیشن اور ان کی جدید تھلڈوں پر تربیت از حد ضروری ہے۔ اس وقت قومی سلامتی اور بقا معاشرے کے برہنہ سے ایثار اور غیر متزلزل عزم کا تقاضا کر رہی ہیں۔ (کچھ اپنی زبان میں، ستمبر شمارہ ۱۳ صفحہ ۱۶)

ہم آہنگی کی ضرورت

حالات ہمیں جس سوز پر لے آئے ہیں وہ قومی سلامتی کی ایک واضح پالیسی فوری طور پر تشکیل دینے کے متقاضی ہیں۔ سول اور فوجی قیادت کو آپس میں ہم آہنگی پیدا کر کے تمام ریاستی اداروں کو دہشت گردی، علیحدگی پسندی اور خونریزی پر قابو پانے کے لیے ایک نئے ویژن اور ایک نئے عزم کے ساتھ تیار کرنا ہوگا۔ ہمیں اس انتہائی سنگین حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ ہمیں جس جنگ کا سامنا ہے وہ غیر روایتی ہے اور ہماری فوج، ہمارے رہنمائی ہماری پولیس اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس ہولناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح مسلح اور مستعد نہیں۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، شمارہ ستمبر ۱۳ء)

کھیل کی قیمت

پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہونا جارہا ہے۔ ہمارے دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے میڈیا کے ذریعے عوام کو صحیح سمت کی طرف راہنمائی کے بجائے مزید الجھن میں ڈال دیا ہے۔ سیاستدان بھی مسئلہ کی گہرائی میں جائے بغیر جذباتی بیانات دے کر نگلی سلامتی سے کھیل رہے ہیں۔ اس خطے کی تاریخ اور یہاں

صباح

ہو رہی ہے زیر و اماں افق سے آشکار
صبح یعنی دستر دو شیزہ لیل و نہار
پا چکا فرصت درود لعل انجم سے سپہر
کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسمان نے آمد خورشید کی پا کر خبر
عمل پرواز شب باندھا سر دوش غبار
شعلہ خورشید گویا حاصل اس بھیتی کا ہے
بوائے تھے دہقان گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نم سحر، جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی غائب شب زندہ دار
کہا ہاں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی غلط سے تیج آب دار
مطلع خورشید میں مضمحل ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوت گاہ جینا میں شراب خوش گوار
ہے تہ دلمان بار اختلاط انگیز صبح
شورش ناقوس، آواز ازاں سے ہمکنار
جائے گول کی ازاں سے طائران فہمہ سخ
ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار
(اقبال)

جنوری 2015ء

حوالے کر دیے تھے جہاں سے افغانستان پر بمباری
کرنے کے لیے پچاس ہزار سے زائد پروازیں کی گئیں
تھیں اور افغانستان کو کھنڈرات میں تبدیل کرنے کا عمل
مہینوں اور برسوں تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں
پاکستان بین الاقوامی دہشت گردوں کے زرمے میں آگیا۔
بارہ برسوں کے دوران مذہبی شدت پسندوں اور
دہشت گردوں کے ہاتھوں پچاس ہزار شہری شہید ہو چکے
ہیں، پانچ ہزار سے زائد دردی میں ملیوں جاں نثار جام
شہادت نوش کر چکے ہیں۔ ملکی معیشت کو اتنی ارب
ڈالروں کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس غلط فیصلے نے اس
خطے اور پورے عالم عرب کو بری طرح بلا کر رکھ دیا ہے
اور پاکستان کے مختلف حصوں میں خون کا دریا تھمنے کا نام
تھیں لے رہا۔

جمہوریت میں اچھا نظم و نسق چلانے کے مسلم
اصول ہیں جن پر جہاں جہاں عمل ہوتا ہے، بہت اچھے
نتائج سامنے آتے ہیں۔ پہلا اصول یہ کہ فیصلے کا بیند
میں کیے جائیں اور وزراء نے کرام اپنے اپنے دائرے
میں نظم حکومت چلانے کے ذمے دار ہوں۔ دوسرا یہ کہ
اقتدار و اختیار کئی سطح تک عوام کو تفویض کیا جائے۔
تیسرا یہ کہ سرکاری انتظامیہ کو سیاسی اثرات سے محفوظ
رکھا جائے اور ریاست اور فرض شناس لوگوں کا میرٹ
پر تقرر کیا جائے اور سینئر افراد کو قیادت سونپی جائے۔
وزراء اپنی کارکردگی کے لیے منتخب اداروں کے سامنے
جواب دہ ہوں اور ان کے احتساب کا ایک خود کار نظام
بھی کام کر رہا ہو۔ جمہوری حکومتوں میں آزاد عدلیہ اور
مہذب کی بڑی اہمیت ہے کہ وہ آئین اور قانون کی
حکمرانی کو یقینی بناتی اور رائے عامہ کی تشکیل کرتی ہے۔
(کچھ اپنی زبان میں، اپریل ۱۳ء)

اردو ڈائجسٹ 155

نوابزادہ لیاقت علی خان کی قیادت میں ہوا تھا جو حضرت
قائد اعظم کے دست راست کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ
عہدہ یہ تھا کہ اقتدار ایک مقدس امانت ہے جسے عوام کے
ہنپے ہوئے نمائندے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی حدود میں
استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔

اس امانت میں خیانت ہی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ
ریاست اور معاشرے میں تمام تر نساؤ کا ذمے دار ہے اور
ایک مدت سے کرپشن، بددیانتی، بدانتظامی، اقربا پروری،
دغا بازی اور عیش پرستی سماجی قدروں کا مقام حاصل کر چکی
ہیں۔ مغرب میں حکمران عام لوگوں کی طرح رہتے اور
قانون اور میرٹ کی سختی سے پابندی کرتے اور عوام کو زیادہ
سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے کمر بستہ رہتے
ہیں۔ انھوں نے اپنے شہریوں کے ساتھ وابستہ رہنے کا
ایک پیمانہ بنا رکھا ہے جس کی وہ پابندی کرتے ہیں
جبکہ ہم نے اپنے رب سے پار امانت اٹھانے کا جو عہد کیا
تھا اسے نہایت بے خوفی اور ڈھٹائی سے پاؤں تلے
روندتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم اگر حقیقی امن چاہتے ہیں تو غریب کو اس کا حق
دینا اور ظالم کا ہاتھ جھٹک دینا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں
سب کو برابر شریک رکھنا ہوگا۔ اسلام جو نئی نوع انسان
کے لیے مکمل ضابطہ ہدایت ہے اس کے شعائر کا احترام
اور اس کے اجرائی عدل کا فروغ وقت کی سب سے بڑی
ضرورت ہے۔ (کچھ اپنی زبان میں، مارچ ۱۳ء)

ایک غلط فیصلہ

اکثر اوقات غلطی میں ایسے ایسے فیصلے سرزد ہو جاتے
ہیں جن کی سزا آنے والی نسلیں بھی جھگڑتی رہتی ہیں جیسا
کہ جنرل پرویز مشرف نے ہائن ایون کے فوراً بعد
پاکستان کے زیادہ تر فضائی اڈے اتحادی فوجوں کے

ہنے والوں کی قدیم روایات کے گہرے اور اک کے بغیر
دہشت گردی کی وجوہات کا سراغ لگانا ناممکن نہیں تو دشوار
ضرور ہوگا۔ تاریخ کے اوراق سازشوں، بغاوتوں اور جنگوں
سے بھرے ہوئے ہیں۔ بیٹے نے باپ سے اور بھائی
نے بھائی سے تخت چھینا اور ان کو اندھا کر کے قید میں
زال دیا۔ اقتدار کی جنگوں میں لاکھوں لوگ بے رحمی سے
قتل کیے جاتے رہے۔

افغانستان اپنے منفرد محل وقوع کی وجہ سے عالمی
طاقتوں اور مہم جوؤں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ قبائل کی
باہمی دشمنی، اقتدار اور دولت کی ہوس نے ہمیشہ بیرونی
جنگجوؤں کی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں علاقائی بالا دستی کے
لیے ترکوں، ایرانیوں، انگریزوں، روسیوں اور امریکیوں
سب نے زور آزمائی کی۔ افغانستان آج بھی عالمی
طاقتوں کی چراگاہ بنا ہوا ہے۔ طاقت اور اقتدار کا کھیل
جاری ہے اور پاکستان دہشت گردی اور بد امنی کی دلدل
میں گھرا اس کھیل کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ (نیچنگ
ایڈیٹوریل، مارچ ۱۳ء)

اشرفیہ کا اسلوب زندگی

ہمارے ملک میں حالات جس رخ پر جا رہے ہیں
اس کے باعث ہماری سوسائٹی بڑے پیمانے پر اٹھل
پھل ہونے والی ہے جس کے نتیجے میں بلند بے حد
پست اور انتہائی پست بہت بلند ہو جائیں گے۔ ہمارے
حکمران طبقے اور اشرفیہ نے جو اسلوب زندگی اختیار کر
رکھا ہے اور امیر اور غریب کے درمیان جو ہولناک فاصلے
پیدا ہو چکے ہیں ان کے لٹن سے ایک خونریز انقلاب جنم
لینے والا ہے۔ اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے
لیے پوری قوم کو وہ پیمانہ وفا نبھانا ہوگا جس کا اعادہ
قرارداد مقاصد میں 13 مارچ 1949ء کو قائد ملت

اردو ڈائجسٹ 154



غم و اندوہ تصاویر کے آئینے میں



وزیر اعظم نواز شریف اور جنرل راجیل رنجی طالب علم کی ہمت بندھاتے ہوئے



ہمارے شاہین صفت کمانڈرز فوراً حملہ آوروں پر لوٹ پڑے



سچو کچھ غلط ہے!

پرسوں جوشی بھارت کے ممتاز شاعر و ادیب ہیں۔ مشہور فلم "مارے زمین پر" میں انتہائی جذبات انگیز گانے لکھ کر پاک و ہند میں شہرت پائی۔ البتہ پیشاور سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک منفرد فلم لکھی جو تڑپیں خدمت ہے! یہ بچپن تمہاری گود میں آنے سے کترانے لگے یہ ماں کی آنکھ سے بھاگتی زندگی ابہر آنے سے کترانے لگے سچو کچھ غلط ہے

جب تلواریں پھولوں پر زور آزمانے لگیں جب معصوم آنکھوں میں خوف نظر آنے لگے سچو کچھ غلط ہے

جب ٹکادیاں سہم جائیں جب تو تلی بولیاں خاموش ہو جائیں سچو کچھ غلط ہے

کچھ نہیں بہت کچھ غلط ہے کیونکہ زور سے پادش ہوئی چاہیے تھی پوری دنیا میں ہر جگہ چلنے چاہئیں تھے آنسو رونا چاہیے تھا اور پرالے کو آسمان سے پھوٹ پھوٹ کر شرم سے جھنجکی چاہیے تھیں انسانی گردنیں یہ سوچ کا وقت ہے ماتم نہیں سوالوں کا وقت ہے اگر اس کے بعد بھی انسان سر اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے سچو کچھ غلط ہے





دگہ گانیا پیغام

سیکڑوں معصوموں کے اندوہناک قتل عام سے کیا شدت پسندی کی آگ بجھ سکے گی؟

رافعہ زکریا

دسمبر ۲۰۱۳ء کی صبح آرمی پبلک اسکول پشاور میں امتحان کا وقت تھا اور زیادہ تر بچے امتحان ہال سے باہر کھڑے پرچہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

صرف ایک رات پہلے زبردست رنے لگائے گئے ہوں گے، آخری منٹ میں کچھ سوال یاد کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی اور طلبہ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ امتحان میں کیسی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔

ان کے ذہن صرف اور صرف ایک بات پر متوجہ ہوں گے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے دوستوں سے زیادہ نمبر حاصل کر لیے جائیں۔ انہوں نے مرنے کے بارے میں لڑباہل بھی سوچا نہیں: دگا۔

لیکن اسی وقت انہیں مارنے کے لیے ان کے قاتل قبرستان سے ملحق دیوار پھلانگ کر اندر آئے اور پہلے گراؤنڈ میں فائرنگ کی۔ اس کے بعد وہ امتحان ہال کی جانب پہنچے۔



کمیشن گل شیر (کرل تاسم) نے طلبہ کی عیادت کر کے انہیں مسکراہٹ کا تحفہ عطا کیا



بھارتی اسکولوں میں شہید پاکستانی طلبہ کو خراج تحسین پیش کیا گیا

گامیابی

ایک ذہین بے روزگار کی داستانِ عجیب جس نے کمائی کا بڑا انوکھا ڈھنگ دریافت کر لیا

جاوید بسام

پروفیسر
گورنمنٹ ایک کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ ایک روشن دماغ اور دانشور بھی تھے۔ کئی ظاہری و باطنی موضوعات پر ان کی گہری نظر تھی۔ نفسیات پڑھے ہوئے تھے اور صاحب کتاب بھی تھے۔ ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اکثر سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں ان کا شمار ہوتا۔

ایک دن انھیں قریبی شہر سے ایک خط موصول ہوا جسے پڑھ کر وہ غصے سے بھنا اٹھے۔ وہ خط راجہ نامی ایک نوجوان کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان لیکن عرصے سے بے روزگار ہے۔ ملازمت ملتی نہیں اور اگر ملے ہے تو جلد چھوٹ جاتی ہے۔ نوٹ اب فاقوں پر آچکی۔ اگر گورنمنٹ صاحب مہربانی کر کے اسے دو سو ڈالر بھیج دیں، تو اس کے کچھ دن اچھے گزر جائیں گے۔ گورنمنٹ صاحب نے ایک دفعہ پھر خط پڑھا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اگر راجہ ان کے سامنے ہوتا، تو اس کا بھی یہی حشر کر ڈالتے۔ وہ ایسے کام چور نوجوانوں سے خوب واقف تھے جو دل جہنی سے کوئی کام نہیں کرتے۔ روز ملازمتیں بدلتے اور نظریات میں لگے رہتے ہیں۔ وہ خط پھاڑنے لگے تھے کہ اچانک انھیں خیال آیا، اسے جواب دیا جائے۔ چنانچہ وہ خط لکھنے بیٹھ گئے۔

پہلے تو پروفیسر صاحب نے اسے خوب سخت باتیں سنائیں اور



دیکھیں گے یا تو کچھ عرصے میں ڈال دیا گیا یا اخبارات کے پیچھے صفحوں پر۔

بیروشیا پر ایٹم بم گرنے کے بعد جاپانیوں نے مرنے والوں کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی۔ بہت ہی مشکلوں سے انھوں نے مرنے والوں کے زیر استعمال رہنے والی مختلف چیزوں کے بچے کھچے آثار جمع کیے تاکہ وہ انھیں اس بات کی یاد دلاتے رہیں کہ انسان کس قدر گر سکتا ہے۔

ان یادگار ایشیا میں سے جو سب سے زیادہ دل توڑ دینے والی چیزیں مرنے والے بچوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں آدھا کھایا ہوا لٹچ، نامکمل کا پیاں اور خون آلود یونیفارم شامل ہیں۔

وہ جاپانی بچے اب نہیں رہے، لیکن کم از کم ان کو یاد رکھا جائے گا، ان کی معصومیت..... لافانی معصومیت کئی دہائیوں سے انسانیت کی اس مجرمانہ بے حسی کا توحہ پڑھ رہی ہے۔

لیکن پاکستان میں جہاں نوجوان، بچے، بوڑھے، سبھی دہشت گردوں کی وحشت کا نشانہ بنے ہیں، وہاں شاید اس طرح کی کوئی بھی ماضی کی یادگار تعمیر کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ ہر حملے کے ساتھ برہنہ برہنہ کے بعد اب دل و دماغ میں شاید اتنی جگہ موجود نہیں رہی کہ ہر کسی کی تفصیلات یاد رکھی جائیں۔

ہم ظلم ہوتا دیکھتے، ٹھنڈی سانس بھرتے، خیالات جھٹک دیتے اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اسی دوران حملے جاری رہتے ہیں اور اس ملک کے لیے دیکھوں کا نیا پیغام لاتے ہیں..... جواب قتل عام کا شکار ہوئے معصوم بچوں کے حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔



خود کو بچانے کے لیے غلیہ زمین پر لیٹ گئے اور اپنے جسموں کو ان گولیوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگے، جو ان کی جان لینا چاہتی تھیں۔ لیکن سگدل مارنے ہی کے لیے آئے تھے اور یعنی شاہدین کے مطابق فائرنگ میں کسی قسم کی اثر افزائی اور جلد بازی نہیں کی گئی۔

قاتلوں نے ایک ایک کر کے قتل کیے، پہلے ایک بچے پر گن تالی پھر دوسرے اور پھر تیسرے پر..... اور اس طرح تب تک یہ کھیل جاری رہا جب تک تعداد سو سے اوپر نہیں پہنچ گئی۔

اب یہ بچے خاموش ہیں اور اپنی اپنی قبروں میں جا چکے۔ ملک پھر حالت سوگ میں ہے، صدے میں ہے اور بربریت کی اس بدترین مثال پر ایک بار پھر غصے میں ہے۔

پاکستان میں جذبات کے اظہار کا پھٹ پڑنا عام طریقہ ہے۔ پچھلے ایک دہائی سے اس طرح کے حملے معمول بن چکے ہیں تو آنسو بھی کچھ عرصہ بہنے کے بعد سوکھ جاتے ہیں اور زیادہ کچھ تبدیل نہیں ہوتا۔

اگر اس طرح کے حملے کے امکان پر غور کیا گیا ہوتا تیاری اور سیکورٹی بڑھانی گئی ہوتی، تو شاید یہ ظلم جنم نہ لیتا، اس پر غصہ نہ آتا..... اور پھر بھول جانا بھی نہ پڑتا!

اعداد و شمار سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کے امکانات موجود تھے۔ عالمی اتحاد برائے تحفظ تعلیم (Global Coalition to Protect Education from Attack) کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۹ء سے لے کر ۲۰۱۴ء کے درمیان پاکستان بھر میں اسکولوں پر ۸۰۰ سے زائد حملے ہو چکے۔

گویا ایک دو نہیں بلکہ قتل عام کی '۸۰۰'

لگاڑا۔ جب غصہ کچھ کم ہوا تو اسے محنت کی عظمت پر طویل لیکچر دے ڈالا۔ چونکہ وہ غصے میں تھے اور بعض لوگوں کا دماغ ایسے وقت تیز چلتا ہے لہذا انہوں نے لفظ محنت کی کئی زوایوں سے وضاحت کر ڈالی۔ آخر میں قلم کی روانی میں وہ اسے قناعت اور سادگی کا بھی درس دے بیٹھے۔

خط بہت لمبا ہو گیا، اچھا خاصا کسی مضمون کا مسودہ لگ رہا تھا۔ بہر حال انہوں نے وہ خط اسے ارسال کر دیا۔ جلد ہی اس کا جواب آ گیا۔ راجر نے ان سے معافی مانگی تھی۔ ساتھ ہی لکھا کہ آپ کا خط پڑھ کر میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ ہٹنے لگی ہے۔ میں جاہل مطلق تھا، آپ کے گراں قدر خیالات سے بہت کچھ سیکھا۔ اب عہد کیا ہے کہ آئندہ بھی آپ سے سیکھتا رہا ہوں گا۔

اس نے مزید لکھا کہ میں وقت کی اہمیت اور اصول پسندی جیسے موضوعات پر بھی راہنمائی چاہتا ہوں۔ میں ایک لاپرواہی نوجوان ہوں۔ وقت کیا ہوتا ہے مجھے پتا نہیں۔ اسی طرح میں اصولوں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ آپ اگر ان باتوں پر کچھ روشنی ڈالیں گے، تو یقیناً یہ معلومات میری کردار سازی میں معاون ثابت ہوں گی۔ میں ساری زندگی آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

گورمن صاحب کی پیشانی پر غصے سے بل پڑ گئے۔ وہ بڑبڑائے: "پائل، پائل، مجھے فارغ سمجھتا ہے کہ میں اس کے خط کا جواب دوں۔" انہوں نے خط ایک طرف ڈال دیا۔ لیکن یہ موضوعات ان کے پسندیدہ تھے، چنانچہ کچھ دن بعد وہ اسے دوبارہ خط لکھنے بیٹھ گئے۔ انہوں نے پہلے اسے حسب عادت ڈانٹا پھر وقت کی اہمیت اور اصول پسندی پر مفصل خط لکھ ڈالا۔

نورانی راجر کا جواب بھی آ گیا۔ اس نے شکر یہ ادا

کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کے فرمودات میرے لیے روشنی ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میں طویل عرصہ اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ آپ کی باتوں سے میری شخصیت تبدیل ہو رہی ہے۔ آخر میں اس نے یکسوئی اور کردار کی مضبوطی پر بھی ان سے کچھ لکھنے کو کہا۔ گورمن صاحب بڑبڑاتے ہوئے پھر ان موضوعات پر بھی خط لکھنے بیٹھ گئے۔ راجر کا جواب فوراً آ گیا۔ ان کی تحریروں کی تعریف کے ساتھ ہی اس نے کچھ نئے موضوعات پر رائے مانگی تھی۔ غرض راجر کے خط آتے رہے۔ گورمن صاحب جواب دیتے رہے۔

اس طرح انہوں نے حج کی اہمیت، وعدے کی پاسداری، مساوات اور دیگر موضوعات پر مفصل خطوط لکھ ڈالے۔ آخر ایک دن راجر کا خط آیا۔ لکھا تھا، جناب آپ نے جس محنت اور جانفشانی سے میری ذہنی تربیت کا کام انجام دیا ہے، اس سے میرے تمام مسائل حل ہونے والے ہیں۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ اس کے بعد خط آنے بند ہو گئے۔

گورمن صاحب اپنے کاموں میں لگ کر جلد ہی اسے بھول گئے۔ دو مہینے بعد ایک دن وہ کچھ کتابیں خریدنے دکان پر گئے۔ مالک ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اس کے مستقل گاہک تھے۔ اس نے پچھلے دنوں شائع ہونے والی کچھ کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں اور ایک کتاب اٹھا کر بولا "گورمن صاحب! پچھلے ایک مہینے سے اس کتاب نے فروخت کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ان دنوں یہ "ہاٹ کیک" بنی ہوئی ہے۔"

گورمن صاحب نے کتاب لے کر دیکھی۔ اس کا عنوان تھا "کامیابی کے دس راہنما اصول۔" انہوں نے

الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بولے "میں نے اسے ادیب کی لگتی ہے، خیر دے دو۔"

دفتر پہنچ کر انہوں نے نئے کتابوں کا بندل سامنے رکھ لیا۔ کچھ دیر دوسرے کام نمٹاتے رہے پھر بندل کھولا اور پہلے "کامیابی کے دس راہنما اصول" نامی کتاب اٹھا کر دہرائی کرنے لگے۔ جوں جوں اس کے مندرجات پر نظر دوڑائی، ان کے چہرے کی رنگت بدلتی گئی۔ وہ تو وہی خطوط تھے جو انہوں نے راجر نامی بے روزگار نوجوان کو لکھے تھے۔ ٹیش میں آ کر انہوں نے پیش لفظ پڑھا، وہ راجر کی طرف سے ہی تھا۔

اس نے تمام باتیں صاف فکھی تھیں کہ کس طرح اس نے بے روزگاری سے تنگ آ کر پروفیسر گورمن کو خطوط لکھے۔ جواب میں انہوں نے کس طرح پند و نصائح سے اس کی راہنمائی کی۔ اس نے خطوط میں سے سوائے گورمن کی ڈانٹ ڈپٹ اور لٹاڑنے کے اور کوئی چیز صاف نہیں کی تھی۔ آخر میں لکھا "مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب مارکیٹ میں آنے کے بعد ضرور میری زندگی تبدیل ہو جائے گی۔"

گورمن صاحب اپنی نرم و آرام کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے جیسے انکاروں پر بیٹھے ہوں۔ وہ سنسیاں پھینچتے ہوئے فرماتے: "بیٹا جی! زندگی تو میں تمہاری ایسی تبدیل کروں گا کہ تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔ میں ابھی تمہیں اس کا مزا چکھاتا ہوں۔"

وہ فون اٹھا کر کسی کا نمبر ماننے لگے تھے کہ دروازہ کھلا اور ان کے درمیان دوست اور وکیل، مسٹر ایم دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ چپک کر بولے "آبا گورمن! میں نے سوچا آج کھانا تمہارے ساتھ کھایا جائے۔"

وہ کچھ رکے پھر حیرت سے بولے "لیکن تم تو اس

وقت کسی لال نماز کی طرح نظر آ رہے ہو۔ لگتا ہے کچھ دیر میں تمہارے کانوں سے دھواں نکلنے لگے گا۔ تمہاری چندیا کے چند بال بھی بالکل سیدھے کھڑے ہیں۔ میرے عزیز! تم بناؤ گے کہ کیا حادثہ پیش آ گیا؟"

پروفیسر گورمن نے کتاب ان کے آگے پھینک دی اور بولے "یہ دیکھو!"

وہ بولے "بہت اچھی کتاب ہے۔ میں نے بھی پڑھی ہے بلکہ میں تو آج کل نئے والوں کو اسے خریدنے کی تلقین کرتا ہوں۔"

گورمن غصے سے دہاڑے "تم نے شاید اس کا پیش لفظ نہیں پڑھا۔"

"بیٹا! مجھے پیش لفظ پڑھنے کی عادت نہیں۔" وکیل صاحب نے کہا۔

"تو اب پڑھ لو۔" گورمن گرجے۔

وکیل صاحب نے پیش لفظ پڑھا اور زور وار قہقہہ لگایا: "بابا بابا!" یہ تو اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہو گیا۔

"لطیفے کو بھراڑ میں ڈالو، میں تمہیں اسی وقت اپنا وکیل کر رہا ہوں۔ تم اس پر مقدمہ دائر کریں گے۔"

وکیل صاحب مسکرائے اور بولے "پیارے گورمن! اس سے کیا ہوگا؟"

"میں اسے مزا چکھانا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے ساتھ فرما کیا ہے۔ اسے میرا نام بطور ادیب دینا چاہیے تھا۔ اسے کتاب کی آمدن بھی مجھے دینی پڑے گی۔"

وکیل صاحب سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے "راجر نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے یہ کتاب خود لکھی ہے۔ اس نے تو جوں کے توں تمہارے خطوط شائع کر دیے۔"

پولیس نے بھی غریب پہ کر دیا

احسان

ایک احمق کا اور اس ماجرا وہ قانون کے رکھوالوں کی بچھائی کندھ میں جا پھنسا

رزاق شاہ کوہلر

نے بڑے فخر اور مان کے ساتھ اس کا نام **باپ** بہادر شاہ ظفر رکھا تھا مگر یار لوگوں نے اسے بہادر شاہ ظفر بنا دیا۔ اس میں تصور کہنے والوں کا نہیں، وہ واقعی ڈفر تھا۔ اس نے کبھی کوئی کام سوچ سمجھ کر نہیں کیا۔ اس کے نزدیک سوچ بچار کرنا دنیا کا فضول ترین کام تھا۔ چنانچہ وہ جب بھی کوئی کام انجام دیتا تو سوچنے کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ نتیجہ اس کی توقع کے برعکس نکلتا۔ مگر وہ بھی اپنی نوعیت کا واحد انسان تھا۔ ہمیشہ اپنی جمالت نقدیر کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہو جاتا۔

بھلے وقتوں میں اس نے جیسے تیسے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ اسے ایک سرکاری دفتر میں بطور نائب قاصد ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ باپ کی پھنکار اور مان کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ لیکن کچھ



گزارش

اس قوم کو ملے موقع تو حالات بدل سکتے ہیں طور طریقے کیا انداز بدل سکتے ہیں حالات کی سنگینی اتنی نہیں جتنا ہے شور برپا آپ کوشش تو کریں، خبر کیا اخبار بدل سکتے ہیں ہر بات میں تصور سابقہ حکومت کا ہی نہیں اپنی بھی غلطی مانیں تو حالات بدل سکتے ہیں ہر کام کے لیے نہ مانگیں جادو کی چھڑی خدا سے مانگ کر تو دیکھیں حالات بدل سکتے ہیں اللہ دین کا چراغ تو ہیں پرانی باتیں جناب آپ جلا دیں بجلی کا چراغ تو حالات بدل سکتے ہیں یہ کیا کم ہے کہ عوام ہے آپ کے ساتھ چھوڑ دیں امریکا کا پیچھا تو واقعی حالات بدل سکتے ہیں جھوٹوں کے پلندے تو ٹھٹھے جانے والوں کے بھی پاس آپ سچ اپنا کے تو دیکھیں حالات بدل سکتے ہیں ہم نے اپنا سمجھ کر دیا ہے موقع آپ کو آپ ہمیں اپنا تو سمجھیں حالات بدل سکتے ہیں ہم نہیں کہتے کہ بدلیں نظام ہی ضرور اسی نظام کی اصلاح کر دیں تو حالات بدل سکتے ہیں (محمد قاسم رضا، تنگے عالی، گوجرانوالہ)

پیش لفظ میں تمہارا نام بھی دیا ہے..... اس میں دھوکا کہاں ہے؟

”دھوکا ہے۔ اس نے مجھے ایک منصوبے کے تحت یہ نطوطا لکھنے پر اکسایا۔“ وہ تھملا کر بولے۔

”ٹھیک، لیکن اگر تم چاہتے تو اسے جواب نہ دیتے۔ وہ تمہارا کیا کر لیتا؟ تم شاید اس بات سے واقف نہیں کہ نطوطا قانوناً مکتوب الیہ کی ملکیت تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ جو چاہے ان کا کر سکتا ہے۔ چاہے انہیں آتشدان میں بھسوک دے یا سینے سے لگا کر رکھے یا شائع کرادے۔ ہاں اس بات کا خیال رکھنا جاتا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو یا کسی کی عزت پر حرف نہ آئے۔ ہم یہ کیس پہلے دن ہی بار جائیں گے۔“ وکیل صاحب نے کہا۔

گورمن صاحب کسی ہارے گھوڑے کی طرح کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ وکیل صاحب بولے ”یار گورمن، دل بڑا رکھو، سمجھو یہ تمہاری ہی نئی کتاب مارکیٹ میں آئی ہے۔ بس اس کی آمدنی اور کوئی لے اڑا اور اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ پہلے ہی تمہاری کئی کتابیں مقبول عام ہو چکیں اور ہر کتاب نے تمہارا بینک بیلنس اوپر ہی پہنچایا ہے۔ میرا تو خیال ہے، تم راجہ کو مبارک باد کا ایک خط لکھ ڈالو۔“

گورمن صاحب آہستہ آہستہ معمول پر آرہے تھے۔ بولے ”خط تو میں نہیں لکھ رہا، ہاں جلد ہی اس واقعہ پر ایک کہانی لکھوں گا۔“

وکیل صاحب مسکرا کر بولے ”یہ ہوئی نہ بات۔ چلو اب جلدی سے کہانا منگوا لو۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے اور ہاں یہ کہانا تمہاری طرف سے ہو گا۔“ یہ سن کر پروڈیوسر گورمن مسکرانے لگے۔

پدخواہ اور حامد قسم کے لوگ بر ملا کہتے، یہ تو کڑی اس کی خداداد جماعتوں کا نتیجہ ہے اور نہ وہ بھرتی تو کلرک ہوا تھا۔ وہ لوگوں کی باتوں کا قطعی برا نہ مناتا۔ جانتا تھا کہ لوگوں کا کام ہی باتیں بنانا ہے۔ اگر سماعتوں کو ایسی باتوں پر غور کرنے کی زحمت نہ دی جائے تو دل کو تکلیف نہیں ہوتی۔ سو وہ ایسی باتوں پر توجہ نہ دیا کرتا۔ نائب قاصد کی ملازمت اس کے لیے سود مند ثابت ہوئی۔ اس میں نقل استعمال کرنے کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی اور یہی شے اس کے پاس نہیں تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں پہلوانوں کی طرح مضبوط تھے۔ اس میں بہترین پہلوان بننے کی تمام خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ لیکن ذفر کا اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ دفتر میں اس کی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ بس ہفتے میں ایک دو بار بے عزتی ہو جایا کرتی جو اس کے نزدیک مقبوض بات نہیں تھی۔ اس کے بقول بے عزتی صحت مند رہنے کے لیے بہت ضروری تھی۔ ہفتے میں کم از کم ہر شخص کو ایک بار ضرور بے عزتی کرنی چاہیے ورنہ آدمی کا معدہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ اگلے سیدھے خواب دیکھنے لگتا ہے۔

ایک دن اس نے دفتر سے تنخواہ کے ۲۰ ہزار روپے وصول کیے۔ وہ پھر ایک شائیک پلازا پہنچ گیا جہاں سے وہ جوتے خریدنا چاہتا تھا۔ پلازا کے سامنے لوگوں کا جھانکنا لگا تھا۔ وہ سب سامنے پیادہ راہ کے کنارے کھڑی موٹر سائیکل کو بول دیکر سے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی اڑن طشتری ہو اور غلطی سے زمین پر اتر گئی۔ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت اور چہروں پر خوف طاری تھا۔

قریب جا کر اس نے ایک نوجوان سے استفسار کیا تو وہ بولا "یہ لاوارث موٹر سائیکل ہے، پتا نہیں کون کم بخت یہاں چھوڑ گیا۔ اس کا ہوا بھی نشست پر پڑا ہے۔"

اس نے کہا "تو میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟ ہٹوے میں اس کا شناختی کارڈ موجود ہوگا۔ نکال کر دیکھ لو، سب معلوم ہو جائے گا۔"

"تمہارا داہن تو ٹھیک ہے؟" نوجوان نے مگھورا۔ "یہ کیسی بات کر رہے ہو؟ آج کل تو کوئی پاگل کتا اور پولیس والا بھی لاوارث موٹر سائیکل کے قریب نہیں پہنکتا تو ہم کیسے جائیں؟..... کیا پتا اس میں کسی نے نام ہم فٹ کر رکھا ہو۔ ہم ہیں سے کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں۔" وہ آگے بڑھا۔ "ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ موٹر سائیکل کس کی ہے؟"

"رک جاؤ احمق!" نوجوان نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ "کیوں کہتے کی موت مرنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "کہتے کی چار ٹائیس ہوتی ہیں اور میری وہ ہیں۔ میں کہتے نہیں آدمی کی موت مروں گا۔ چھوڑ دو مجھے، میں ضرور معلوم کروں گا کہ یہ موٹر سائیکل کس کی ہے؟"

نوجوان اسے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے چلایا "بھائیو! اس پاگل کو روکو، یہ موٹر سائیکل کی نشست پر پڑا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے یہ پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگتا ہے۔ خدارا! میری مدد کرو۔"

لوگوں نے جب یہ سنا کہ ایک پاگل موٹر سائیکل کے قریب جا رہا تو وہ بدواں ہو کر مختلف اطراف میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ نوجوان نے لوگوں کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی اسے چھوڑ کر یوں بھاگا جیسے سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لینے والا کھلاڑی بھاگتا ہے۔ اب میدان صاف تھا۔ وہاں دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اطمینان سے چلنا موٹر سائیکل کے قریب پہنچا اور ہوا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

ہٹوے میں چند مڑے مڑے کاغذ اور نصف درجن کے لگ بھگ ملا تاتی کارڈ بھرے ہوئے تھے۔ ابھی اس

نے تین عدد کارڈ ہی دیکھے تھے کہ اچانک ایک خطرناک صورت شخص اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"اٹے چور کے بچے! تمہیں ہمت کیسے ہوئی میرا ہوا اٹھانے کی؟" وہ اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے بولا "چوری کرتے ہو اور وہ بھی دن و ہائے، شرم نہیں آتی؟"

"تن..... نہیں..... جناب..... مم..... میں چور نہیں۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کو اس مت کرو۔" وہ گرجا۔ "دلاور بھائی نام ہے میرا، مار مار کر جلیہ دگاڑ دوں گا۔"

"دلاور بھائی! خدا کی قسم..... مم..... میں چوری نہیں کر رہا تھا۔" وہ گڑگڑایا۔ "میں تو آپ کا شناختی کارڈ تلاش کر رہا تھا۔ دراصل میں....."

"چپ۔" دلاور بھائی نے قطع کلامی کی۔ "میرے شناختی کارڈ کے ساتھ تمہارا کیا تعلق؟ بول..... جواب دے؟"

"وہ جی..... مم..... میں..... میں..... اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن دلاور بھائی نے اس کے ہاتھ سے ہوا اچھینا اور کھول کر دیکھنے لگا۔

"اٹے چور!" دلاور بھائی چلایا۔ "اس میں پورے تیس ہزار روپے کی رقم تھی۔ وہ کہاں گئی؟"

"مم..... میں خدا کی قسم کھتا کر کہتا ہوں کہ اس میں ایک روپہ بھی نہیں تھا۔" اس نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔ "آپ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" دلاور نے پولیس والوں کے انداز میں پوچھا۔

"بہادر شاہ ظفر۔"

"وہ جسے انگریزوں نے رنگوں میں پھڑکا دیا تھا؟"

"تن..... نہیں جی..... میں دوسرا ہوں۔"

"ہوں۔" دلاور نے ذومستی انداز میں سر ہلایا اور پھر ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "سنو بھی بہادر شاہ ظفر....."

"ذفر نہیں جی ظفر۔" اس نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے۔" دلاور بولا۔

"اب میری بات غور سے سنو۔ اگر تم نے میری رقم چرائی ہے تو چپ چاپ واپس کر دو۔ میں تجھے معاف کر دوں گا ورنہ بات تمہارے تک جائے گی۔ پھر تمہیں وہ چور پان بھی تسلیم کرنا پڑیں گی جو تمہارے باپ دادا نے کی ہوں گی۔"

"میں نے کوئی چوری نہیں کی، خدا کے لیے میرا اعتبار کریں۔ اس ہٹوے میں یہی کچھ تھا جو تمہارے سامنے ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھی طرح نہیں مانو گے؟"

"مم..... میں کوئی بھی قسم کھاتے کے لیے تیار ہوں۔" وہ گڑگڑایا۔

"ٹھیک ہے۔" دلاور جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے بولا "اگر تم خوشی سے تمہارے کی سیر کرنا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔"



بہادر شاہ ظفر گزشتہ تین گھنٹوں سے حوالات میں بند تھا۔ تمہارے انچارج خون خوار قسم کا انسپکٹر تھا۔ اس نے بہادر شاہ ظفر کی تمام منتوں اور قسموں کو سر کی ایک ہی جنبش سے رد کر دیا۔ تلاشی لینے پر اس کی جیب سے واقعی تیس ہزار روپے کی رقم برآمد ہوئی۔ چنانچہ انسپکٹر نے اسے چوری کرنے کے جرم میں قید کر دیا۔ دن کے دو بجے اس کا باپ دو پڑوسیوں کی معیت میں تمہارے پہنچا اور انسپکٹر کی منت سماجت کرنے لگا۔



دور جدید کا حیرت انگیز سوال

دو ارب عیسائی کیسے ڈیرہ کرو کر اور یہود کے جنگل میں پھنسے؟

امت مسلمہ کے خلاف یہود و نصاریٰ گٹھ جوڑ کی اصلیت آشکار ہوتی ہے

رضی اللہ عنہ

حیرت کی بات یہ کہ ان دونوں کو عیسائی ڈیشوا بھی من و عنین درست تسلیم کرنے لگے ہیں۔ بس وجہ ہے، یہودیوں کے انسانیت دشمن ہر اقدام پر وہ اب ان کے ساتھ کامل تعاون کرتے ہیں۔ ایک سو سال پہلے تک جو قوم (عیسائی) یہودیوں کی جانی دشمن تھی، وہ اب ان کے من گھڑت خدائی دعوے آسانی سے تسلیم کرنے لگی ہے کیونکہ ان کی مقدس الہامی کتب اور تورات (عہد نامہ قدیم) کو یہودیوں کے مانند عیسائیوں کے ہاں بھی مستند خدائی کتب تسلیم کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی انجیل (گوہیل) کے مطالعے کا آغاز عیسائی انہی مذکورہ کتب

یہودی قوم اپنے صحیفوں میں درج من گھڑت خدائی ٹیٹھن گویوں کی بنیاد پر دنیائے عیسائیت کو ہمیشہ مرعوب کیے رکھتی ہے۔ اس کے صحیفوں میں درج ہے کہ خدا تعالیٰ قوم بنی اسرائیل سے بہت خوش ہے اور وہ اسے اپنی جہتی قوم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کنعان فلسطین کا ملک اس نے انہیں ان کے چہیتے ہونے کی بنیاد ہی پر تحفے میں عطا کیا۔ اسی باعث یہودی مذہبی شخصیات عیسائیوں پر ہمیشہ زور دیتی ہیں کہ ان کے حقوق تسلیم کیے بغیر عیسائی ہرگز ترقی نہیں کر سکتے۔

جنوری 2015ء

اردو آن لائن 169

گستاخ پروانہ

شاعر منور نقوی ایک مرتبہ چراغ کی روشنی میں رات کو کچھ لکھ رہے تھے کہ یکا یک ایک گستاخ پروانہ عالم وارثی میں شعلے سے آگرایا۔ پروانے کے ساتھ ساتھ چراغ بھی بجھ گیا۔ پہلے تو آپ اندھیرے میں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ان کے منہ سے اچانک نکلا۔
الہی آگ ہی لگ جائے اس جذب محبت کو
جلے کوئی نرے کوئی، اندھیرا میری محفل میں
(سدید رحمن، لاہور)

نے چلکے تیار کیا، ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور پھر بہادر شاہ ظفر کو حوالات سے نکال انیسٹر کے سامنے پیش کر دیا۔ انیسٹر نے پولیس والوں کے روایتی انداز میں اسے پھیر دیا اور آخر میں بولا "اب جاؤ آئندہ کبھی ایسا مت کرنا ورنہ سیدھے جیل جاؤ گے۔"

وہ باپ اور مناسبتوں کے ساتھ باہر نکلا تو معاً اس کی نظر ایک سپاہی پر پڑی۔ وہ تھک کر رک گیا۔

باپ نے کہا "کیا بات ہے، تم اس پولیس والے کو اتنی حیرانی سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"یہ..... یہ وہی ہے، جس نے مجھے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ میں اسے تیس چھوڑوں گا۔"

"بکو اس مت کرو۔" باپ نے اسے ایک ٹیچر جڑا اور پھر کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

☆ ☆ ☆

"کچھ دیر بعد وہ سپاہی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور جیب سے تیس ہزار روپے کی رقم نکال انیسٹر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ دونوں نے زوردار توجہ لگایا اور پھر رقم تقسیم کرنے لگے۔



جنوری 2015ء

انیسٹر نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ مگر جونہی وہ خاموش ہوا انیسٹر اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "بزرگوار! ایسے کیسے چھوڑوں جب کہ اس سے مال سرفہ بھی برآمد ہو چکا۔ اس کے خلاف تو ایف آئی آر کئے گی، کم سے کم دو سال اسے بڑے گھر میں رہنا پڑے گا۔"

"جناب! مہربانی فرمائیں، میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"نا۔" انیسٹر نے فنی میں سر ہلایا۔ "میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ اسے کیسے کیسے سزا ضرور ملے گی۔"

"اس کی فوکری چلی جائے گی جناب۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "خدا کے لیے اس پر نہ سہی مجھ غریب

پر ہی رحم کر لیں۔ بیٹے کی آمدن ہی سے میرا گھر چلنا ہے۔ اس کی ملازمت چلی گئی تو میرا چولہا بجھ جائے گا۔ میں آپ کے پیروں پر گرنے کو تیار ہوں۔ مجھ پر رحم کریں۔"

"میں مجبور ہوں باباجی۔ کاش کہ یہ میرے اختیار میں ہوتا۔"

باباجی رونے لگے۔ ساتھ ساتھ انیسٹر کی منت سماجت بھی جاری رکھی۔ غیر متوقع طور پر انیسٹر کا دل کھل گیا۔

"بس باباجی بس۔" انیسٹر نے بتلون کی جیب سے رو مال نکالا اور اپنی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولا "آپ نے تو مجھے بھی رلا دیا۔ ٹھیک ہے، میں آپ کے بیٹے کو شخصی مناسبت پر چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اسے اچھی طرح سمجھا دیں کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے۔"

"م۔۔۔ میں سمجھا دوں گا جی۔" باباجی نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ انیسٹر صاحب! میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

باباجی مناسبتی ساتھ لے کر آئے تھے۔ پولیس والوں

اردو آن لائن 168



سے کرتے ہیں۔

چنانچہ قدرتی بات ہے کہ یہودیوں کے عقائد کا نفوذ لازمی طور پر ان کے دل و دماغ میں ہو جائے۔ اسی لیے یہودی عیسائیوں کو جب خدا کا یہ فرمان سناتے ہیں "بنی اسرائیل کو تنگ کرنا خود خدا کی ناراضی مولیٰ لینا ہے" تو عیسائی پیشوا ان کی مخالفت کرنے سے از خود کتراتے ہیں۔ یہودیوں کا کمال ہے کہ اپنے صحیفوں کی بنیاد پر دو ارب کی بڑی قوت رکھنے والی عیسائی قوم کو انہوں نے اپنے تختے میں کس لیا۔

جنگوں کی آگ بھڑک اٹھی

بنی اسرائیل کے اس قدیم دعویٰ نے کہ "نیل کے ساحل سے لے کر تاجناک فلسطین یہ سارا وسیع و عریض خطہ خدا نے انہیں اس کی ذمہ داری ہونے کے سبب ازراہ عنایت عطیہ (بہ) کیا" مشرق وسطیٰ میں تمام جنگوں کی آگ بھڑکائی۔ وہ کہتے ہیں اس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب تورات میں بار بار کیا ہے۔ مثلاً انجیل کتاب، پیدائش (Genesis) باب ۱۵ آیات ۱۸-۱۶ میں دونوں طریقے سے اعلان کیا گیا ہے:

"میں نے یہ ملک تیری نسل کو دریائے مصر سے لے کر اس بڑے دریائے (فرات) تک قبیلوں، قزلبوں، قدمونیوں، حیتیوں، فرزیوں، فرانیوں، اموریوں، کنعانیوں، جرجاسیوں اور جوسیوں (تمام قوموں) سمیت دے دیا۔" ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف جان ایف واڈورڈ (Valwood) لکھتا ہے:

"اس خدائی وعدے سے مراد آج کے دور کا

اسرائیل دریائے اردن کا مغربی کنارہ اور عراق، سعودی عرب اور شام کے ممالک کے بڑے بڑے شہر مراد ہیں۔" (کتاب آرمیگا ڈون، آئل، اینڈ دی ایٹل ایسٹ کراسس۔ ص ۲۹-۲۸)۔

یہ خدائی وعدہ کسی بھی قسم کی شرط سے وابستہ نہیں۔ یعنی اس کا بنی اسرائیل کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری سے کوئی تعلق نہیں۔ خدائے یہ خطے انہیں بس اپنی دے دیے، خواہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں! اسی طرح ایک اور جگہ خداوند فرماتا ہے:

"اے اسرائیل گھبرانہ جا، کیونکہ دیکھ میں تجھے اور تیری اولاد کو غلامی کی سر زمین سے چھڑاؤں گا۔ یعقوب (بنی اسرائیل) واپس آئیں گے اور راحت و آرام سے رہیں گے اور کوئی انہیں نہ ڈرا سکے گا کیونکہ میں تیرے ساتھ ہوں۔" (برمیاہ ۳۰، آیات ۱۱-۸)

برطانیہ کی سرپرستی

صیہونیوں نے قیام اسرائیل کے لیے جب عالمی مہم گیرم شروع کی تو برطانیہ انہیں مذکورہ دعووں اور کچھ دیگر سیاسی حالات کی بنا پر ان کے بہت زیادہ دہانوں میں آگیا۔ اتفاق سے تب برطانیہ سپر پاور تھا۔ بہت کچھ تو اس سیاسی دہانے کی وجہ سے اور کچھ جنگ عظیم اول (۱۹۱۷ء) میں یہودی قوم کی ہمدردی پانے کے لیے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے قیام اسرائیل کے لیے ۱۹۱۷ء کو اعلان بالفور کا اجرا کر دیا۔ تاہم عرب دنیا نے اس اعلان کو یکسر مسترد کر ڈالا۔

لہذا عربوں کی جانب سے بڑھتے ہوئے ہنگاموں اور سیاسی دہانے کے باعث برطانیہ، قیام اسرائیل کی اس دستاویز پر طویل عرصے تک عمل درآمد کرنے سے تاصر رہا۔ مصلحت

یہ تھی کہ اتنی بڑی عرب برادری سے وہ اپنے تعلقات برقرار رکھے۔ چنانچہ اعلان بالفور کے باوجود برطانیہ نے یہودیوں کے فلسطین میں مزید داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ اس کے باوجود ۱۹۳۹ء تک چار لاکھ یہودی حیرت انگیز طور پر کسی نہ کسی طور فلسطین میں داخل ہو گئے۔ یہی وہ سال تھا جب دوسری عظیم جنگ کا بھی آغاز ہوا۔ "انجمن اقوام" کی جانب سے برطانیہ اس وقت فلسطین کا نگران اعلیٰ تھا۔

جنگ عظیم دوم کے اختتام پر اقوام متحدہ نے طے کیا

کہ امریکا اور روس دونوں ممالک کی آشریاد سے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تاہم یہودیوں کو اپنی آزاد ریاست کے جلد از جلد قیام سے حد درجہ دیکھی تھی۔ اسی لیے فلسطین سے برطانویوں کو نکال باہر کرنے کی خاطر صیہونی دہشت گردوں نے یروشلم

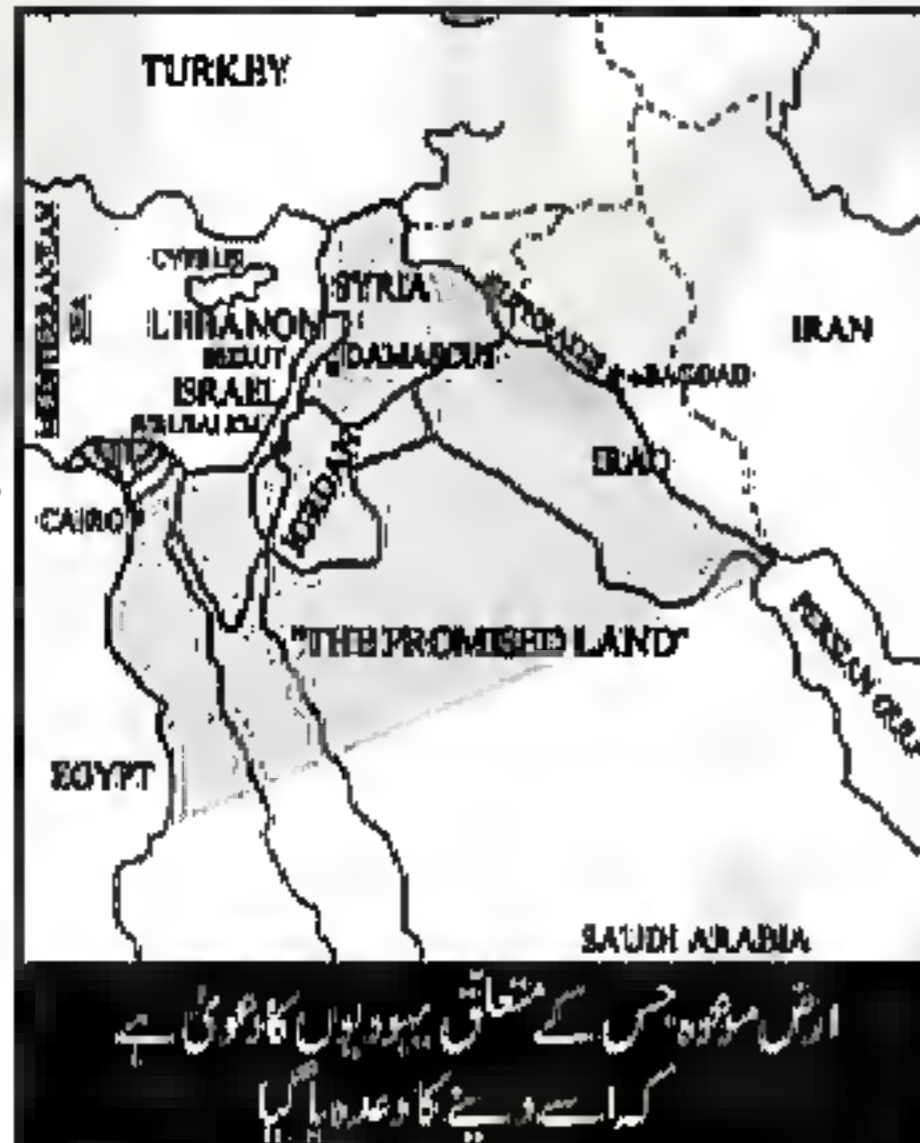
کے کنگ ڈیوڈ ہونل کو دھماکوں سے آزادیا جہاں نگر اس برطانوی انوائج قیام پذیر تھیں۔ بعد ازاں ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو صیہونیوں نے از خود قیام اسرائیل کا اعلان کر دیا۔ حیرت انگیز امر یہ کہ یہودی بڑوں کے غیر قانونی اقدام کی مذمت کسی ایک مہذب گوری قوم نے نہ کی اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔

پائپل کی پیش گوئیاں

کتاب "برمیاہ" باب ۲۳ یوں پیشین گوئی کرتی ہے "پہلیں ان تمام ممالک سے جہاں جہاں میں نے انہیں ہانک دیا تھا جمع کروں گا اور انہیں ان کے گلے خانوں میں لاؤں گا اور وہ چلیں گے اور بڑھیں گے۔ خداوند فرماتا ہے دیکھ وہاں دن آئے ہیں کہ میں واڈورڈ کے لیے ایک نئی نسل پیدا کروں گا اور اس کی بادشاہی، ملک میں اقبال مندی اور عدالت و صداقت کے ساتھ ہوگی۔ یہود (یروشلم) اس کے عہد میں نجات پا جائے گا اور اسرائیل (یہودی) سلامتی سے سکونت کر سکے گا۔"

(آیات ۶-۴)

کتاب ایزائیل بیان کرتی ہے کہ "تب وہ جائیں گے کہ میں خداوند ان کا خدا ہوں۔ میں نے ہی انہیں غلامی میں قوموں کے اندر روانہ کیا تھا اور میں نے ہی انہیں ان کے اپنے ملک میں جمع کیا تھا اور ان میں سے کسی ایک کو بھی پیچھے نہ چھوڑا تھا۔" (باب ۳۹، آیت ۲۸)



ارض موعودہ جس کے متعلق یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ اسے دینے کا وعدہ کیا گیا

قارئین سے گزارش ہے کہ پائپل کی یہ پیشین گوئیاں پڑھ کر دل چھوٹنا نہ کریں کیونکہ اس میں شامل تمام کتابیں جعلی اور تحریف شدہ ہیں۔ ان کے دہانوں نے کتب سے اصل نکال کر من پسند آیات درج کر دیں۔ خدا نے اگر اس قوم سے کوئی وعدہ کیا بھی تھا، جیسا کہ قرآن مجید بھی دو تصدیق کرتا ہے تو یہ وعدہ ان کی وفاداری اور تقویٰ کے ساتھ مشروط تھا۔ یعنی اگر وہ اللہ

کے ساتھ وفاداری کا رویہ اختیار کریں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ عمدہ سلوک کا مظاہرہ کرے گا۔ انہوں نے اپنی سازشی ذہنیت کے باعث ان تمام وعدوں سے خدائی شراڈ کو نکال باہر کیا اور محض اس بات کا اٹھدورا پیٹ رہے ہیں کہ خدائے یہ سارا خطہ انہیں از خود ہبہ کر دیا۔ اب اس چھیتی قوم کی جو بھی مخالفت کرے گا، دنیا میں وہ لازماً ہر بادی کے انجام سے دو چار ہوگا۔

یہود پہ حضرت عیسیٰ کی پھٹکار اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سرکش یہودیوں کو



قرون وسطیٰ میں یورپ میں یہود کو مسیحی جرائم پر جلانا مسئول تھا

ان آیات میں نذات۔ ڈپٹ کرنے کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود کو یہ بھی ہدایت کرتے ہیں کہ آنے والے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہ خوش دلی کے ساتھ استقبال کریں۔ دوسری طرف یہودی متکاروں کو طنز کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

”اے ساہوکارے اُنہی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟“ (متی ۲۲، آیت: ۲۳) اور ”اے احمق اور اندھرو۔“ (متی ۲۲، آیت: ۱۷)

قابل غور بات یہ کہ چلنے پھولنے کی ایسی ہی پیشین گوئی اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمائی ہے۔ وہ کہتا ہے:

”اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے پہلدار کروں گا اور بہت بڑھاؤں گا۔ اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔“ (پیدائش ۱۷، آیت: ۲۰)

حضرت اسماعیل کے حق میں اشجلی کتابوں میں درج مذکورہ پیشین گوئیاں کئی مقامات پر مزید ملتی ہیں جو تمام پوری بھی ہوں۔

دوسری طرف بنی اسرائیل سے متعلق خدائی خوشخبریاں سچیل کی تا حال منتظر ہیں۔ چار ہزار سال بعد بھی بنی اسرائیل موعودہ وسیع و عریض خدائی خطے سے محروم ہیں۔ جو کچھ بھی زور بردستی نہ کہ بطور خدائی انعام اسے حاصل ہوا یعنی (اسرائیل) وہ بھی بس جیونا سا ارضی گوشہ ہے۔ یہودیوں کو کنعان (فلسطین) بھی اب تک مکمل طور پر حاصل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح عالمی طور پر بھی منتشر شدہ یہودی بھی قیام اسرائیل کے باوجود موعودہ وطن

ذات ڈپٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”اے یروشلم، اے یروشلم (بنی اسرائیل)، تو جو نیکوں کو قتل کرتا اور رسولوں کو سنگسار کرتا ہے۔ کتنی بار میں نے چاہا ہے کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو جمع کر لیتی ہے، میں بھی تیرے لڑکوں (قوم) کو جمع کروں مگر تو نے ایسا نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران کیا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب مجھے ہرگز نہ دیکھو گے جب تک کہ نہ کہ لو کہ ”مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آیا ہے۔“ (متی ۲۳، آیات: ۳۹-۳۷)

واہن نہیں لوٹ سکتے۔ حالانکہ بائبل میں بیان کیا گیا تھا: ”میں ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی پیچھے نہ چھوڑوں گا۔“

تمام تر کشش اور مراعات کے باوجود یورپ، امریکا اور دیگر ممالک کے بے شمار یہودی آج بھی اسرائیل آنے کو تیار نہیں، بے شک وہیں کے نزدیک یہ ان یہودیوں کا گناہ کبیرہ ہی ٹھہرے! حیرت انگیز طور پر قرآن پاک بھی ایسی بات بیان کرتا ہے ”قیامت سے پہلے ہم یہودیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔“ (بنی اسرائیل: ۱۰۳) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان

صدر ناصر کی اسرائیل پر تھوپی گئی جنگ رمضان ۱۹۶۷ء کے باوجود اسرائیل کی موجودگی کا واضح مطلب یہی ہے کہ (۱) اسرائیل پر خدا کا ہاتھ ہے۔ (۲) بنی اسرائیل خدا کی چھیتی اور محبوب امت ہے اور (۳) یہ وسیع و عریض خطہ یہودیوں کے ساتھ ایک سچا خدائی وعدہ ہے۔

یہ لوگ دلیل دیتے ہیں کہ گزشتہ چار ہزار برس میں جن اقوام نے بھی اسرائیلیوں (خدا کی چھیتی قوم) پر ذلت، غلامی، تشدد اور جنگ مسلط کی تھی، قرب قیامت پر ان سب کو آخر کار ایک خدائی قہر و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۶۱ صحیفہ ”جرمیاء“ دونوں

طریقے پر اعلان کرتا ہے ”وہ سب جو تجھے نکلتے ہیں، خود نکلے جائیں گے اور تیرے سب دشمن قیدی بنا لیے جائیں گے اور جو تجھے غارت کرتے ہیں خود غارت ہو جائیں گے اور ان سب کو جو تجھے لوٹتے ہیں میں خود لٹا دوں گا۔“ (باب ۳۰، آیت: ۱۶)



جرمنی کے نظر بندی کیمپ میں قید یہود

ان کا دعویٰ ہے، رومی سلطنت جس نے یہودیوں کو سدا عذاب میں مبتلا رکھا تھا، آخر کار تباہی سے دو چار ہوئی۔ (یہ

حقیقت بہر حال وہ دنیا پر آشکار نہیں کرتے کہ مذکورہ رومی سلطنت کو یہودیوں کے حسن مسلمانوں نے تباہ کیا تھا۔ یہ فاتح محمد عثمانی تھے جن کے حملوں سے رومی سلطنت کلڑے کلڑے ہوئی۔ مذکورہ دانشوران مزید دلیل دیتے ہیں کہ رومی شاہی زار خاندان جو ساری زندگی یہودیوں کا درپے آزار رہا، کیونسٹ انقلاب کے نتیجے میں یہیبت اور زندگی کا نشانہ بنا اور ہلکے ہوئے جو یہودیوں کا فسطی اور خون دشمن تھا، بالآخر خود کشی کے انجام سے دو چار ہوا۔

کے بارے میں ایک پیشین گوئی فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے مدینہ اجاز اور یروشلم آباد ہو رہا ہوگا۔ (ابوداؤد بخاری)

خدا کا ہاتھ بعض عیسائی اور تمام صیہونی مسیحین اس بات کا علانیہ اظہار کرتے ہیں کہ عرب دنیا اور تمام مسلم ممالک کی بدترین مخالفت، عربوں کی لگاتار مسلسل عسکری مزاحمت،

نصیب

ایک بے آسرا بیوہ نے اپنوں سے آس لگائی تھی مگر وہ بھی نرا اس میں بدل گئی

احمد ندیم قاسمی



19۶۷ء کی مہر اسرائیل جنگ کے بعد یہود نے یروشلم اور دریائے اردن کا مغربی کنارہ چھین لیا۔ ان کے نزدیک یہ قبضہ سو فیصد درست تھا کیونکہ یہ بھی موعودہ خدائی فطے کا ایک حصہ ہی ہے۔ سابق وزیر اعظم موشے دایان نے بھی دؤگ طور پر کہا تھا: ”تمام مقدس شہروں کے مقدس شہر (Holy of the Holies) میں یہودی اب کبھی واپس نہ جانے کے لیے لوٹے ہیں۔“ جبکہ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ”یروشلم غیر قوموں سے اس وقت تک پامال ہونا رہے گا جب تک کہ غیر قوموں کی معیار اقتدار پوری نہ ہو جائے۔“ (انجیل لوقا: ۲۱، آیت ۳۳)۔ دوسرے الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیش گوئی کر رہے ہیں کہ یروشلم کو تو ایک دن بالآخر اجازت ہونا ہی ہے۔

معیشوں کی بنیاد پر یہودی دعوے تو ضرور بڑے بڑے کرتے ہیں لیکن جان بوجھ کر یہ حقیقت نہیں بناتے کہ ان کا یہ تمام سیاسی کردار اور ان کے ملک کا تمام استحکام محض امریکی و مغربی حمایت کے بل بوتے پر ہے۔ سات ارب کی عالمی آبادی میں ان کی حیثیت آٹے میں نمک برابر ہے۔ جس دن بھی امریکی عوام پر اصل صورت حال واضح ہوئی کہ کس طرح ان کا پیسا یہودیوں کے استحکام میں استعمال ہو رہا ہے اور کس طرح ان کی حکومتیں اسرائیل کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر باقی رہی ہیں، اسی دن سے یہودی بھر پور ترین بربریت اور تشدد کا نشانہ بننے لگیں گے۔ ایک بار پھر انہیں اسی ذلت و رسوائی سے گزرنا پڑے گا۔ اسرائیل تو ان کا محض عارضی ٹھکانا ہے! دنیا بھر کو وہ اپنے جسوں نے خدائی وعدوں کی بنیاد پر بے شک مسلسل بے ذوق بناتے رہیں، لیکن ان کی یہ تمام زیرکی اور چالاکی ایک دن خود خدائی وعدوں کی بنیاد ہی پر انہیں لے ڈوبے گی۔

عذاب نازل ہوا

یہ سارے حقائق درست ہو سکتے ہیں لیکن بڑی عیاری کے ساتھ وہ اس موقع پر اپنے سابق بدترین دشمن، یورپی اقوام کا ذکر گولی کر جاتے ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جنہوں نے یہودیوں کو تقریباً دو ہزار سال تک پورے یورپ میں بری طرح رگیدا، قتل کیا، جلا یا اور زمین و جاندار سے محروم کیا۔ ان کی پیشین گوئیوں کی بنیاد پر تو یورپ کی ان عیسائی اقوام کو بھی اصولاً خدا کی ”پہیلی قوم“ کو عذابوں میں مبتلا کرنے کی وجہ سے فنا و برباد ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ان پر اللہ کا غضب نازل ہونا تو کچھ یہ یورپی اقوام پہلے سے بھی زیادہ منبھوت اور مستحکم ہو چکی ہیں۔

اسپین، اٹلی، جرمنی، فرانس، ڈنمارک، اٹلی اور برطانیہ وغیرہ کئی لحاظ سے عالمی قیادت کے منصب پر بھی فائز ہیں۔ لہذا اس موقع پر یہودی اگر ان عیسائیوں کا ذکر کرتے تو خدا کی پیشین گوئی دنیا کو یقیناً غلط نظر آنے لگتی۔ اسی لیے انہوں نے سلسلہ حقائق میں ان اقوام کا ذکر ہی گول کر دیا۔ بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تمام راج الاوتت کتب مقدسہ، جعلی، من گھڑت اور انسانی کلام ہیں۔ اصل عبرانی انجیلیں تو یروشلم اور نیپل کی بار بار تباہیوں اور آتشزدگیوں کے باعث آج سے کئی ہزار سال پہلے ہی دنیا سے مٹ چکیں۔ اس لیے ان کی پیشین گوئیوں پر انسان کیسے اعتبار کر سکتا ہے؟

مسلمان بہ لحاظ تعداد ایک صدی کی نسبت آج بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں جبکہ خدا کی پہلی قوم، بنی اسرائیل محض ڈیڑھ کروڑ کی آبادی ہی پر اٹک گئی۔ ایک طرف ان کی دشمن قومیں مسلسل پھیل رہی ہیں اور دوسری طرف یہودی سکتے پٹے جا رہے ہیں! یہ کیسی الہامی پیشین گوئی ہے؟

میاں تھا اور ہالوں نے اجڑ کر مانگ کو غائب کر دیا تھا۔ وہ ایک دہائی بھگو بھگو کر وری کے حاشیے پر گر رہی تھی۔ ہرگز کے ساتھ اس کی استینا کئی تک ہٹ جاتی۔ میلے ہاتھوں کے پیچھے اس کی کلائی کا سندان چمک چمک جاتا۔

رئیسہ بیگم کو سب سے پہلے انہی سڈول بازوؤں نے رضیہ کی طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی پرلے کو نے ہی ہنسی ہوئی دہائی لیے بیٹھی تھی۔ جب پہلی بار رضیہ کے بازو کا گوند لپکا، وہ ذرا سی چونکی اور پھر رضیہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے نئے سرے سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

”اچھا تو رضیہ بیٹی یہ تم ہو۔۔۔ یہ ہوتی۔۔۔ تمہاری جنگی ہوئی لانی آنکھوں کے گوشوں میں سے یہ جگنو سے کیسے جھانک رہے ہیں! تمہارے بال ایک دم اتنے کیوں بڑھ آئے کہ فرش کو چھو رہے ہیں! یہ کیسے ننھے ننھے بھنور ہیں جو تمہارے گالوں میں بن بن کر ٹوٹ رہے ہیں۔ تمہارا جسم ہوں بھرا بھرا سا کیوں لگتا ہے جیسے تم نے پھر پینے کے بجائے مزہ رکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب تم سترہ سال کی ہو رہی ہو اور پڑوں میں سترہ سال کی عروس تین بچوں کی ماں بن چکی۔ مگر بیٹی! ابھی کل تک تو تم گڑیاں کھیل رہی تھیں! ہم تمہارے رشتے کے بارے میں یوں رواداری میں سوچتے تھے، جیسے ابھی تو چار برس پڑے ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ اس سے پہلے مل گیا، تو ٹھیک دورہ ایسی جلدی کیا ہے! پر بیٹی، اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اگر میں دو مہینے کے اندر تمہارے ہاتھ پہلے نہ ہونے، تو اپنی ہی آگ میں جھلس جائیں گے، یہ ایسا کیسی شہسہ کیا ہو گیا رضیہ بیٹی!۔۔۔ لیکن جب باپ کی موت بیٹی کی جوانی کا انتظار نہیں کرتی، تو وہ باپ کی موت کیوں روکے؟“

”میرے نصیب!“ رئیسہ بیگم ماتھے پر چٹاخ سے

ہاتھ مار کر کر روئے لگی۔

رضیہ دہائی کو پھینک کر ماں کی طرف لپکی۔ بیٹی نے روتی ماں کو اپنے بازوؤں میں لیا اور پکھ پکھ کر کہنے لگی ”مت روئے امی! اس طرح تو آپ کی بیٹائی بھی آنسوؤں میں بہ جائے گی امی۔“

روتی ہوئی ماں جیسے سوچ میں پڑ گئی، بیٹی کے بازو کتنے لمبے تھے کہ انہوں نے پوری ماں کا احاطہ کر لیا۔ بیٹی کے جسم میں کتنی گرمی تھی اور اس کی سانسوں میں کیسی شعلے کی سی لپٹ تھی۔ ماں نے بیٹی کو ذرا دیر کے لیے یوں غور سے دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہے۔ ”بیٹی، تم اب تک کہاں تھیں؟“

مانا کہ بیٹی پیدا ہوتے ہی ماں کے ذہن میں رشتوں کی گرہیں بند ہونے لگی ہیں۔ رئیسہ بیگم نے بھی رضیہ کے لیے رشتوں کا پورا دستہ تیار کر رکھا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اب تک وہ سچ سچ چل رہی تھی۔ شوہر کے بازو کا سہارا لے کر سچ سچ چلنے ہی میں مزا آتا ہے۔ وہ سوچتی تھی، حامد بڑا نہیں مگر چار سو بھی کوئی تھوڑا ہے؟ چار سو میں تو رضیہ کا ایک جوڑا بھی نہیں آئے گا۔ شکور بڑا وجیہہ جوان ہے مگر صرف وجاہت کوئی کہاں تک پہنچا جائے؟ اور پھر رضیہ کیا کم وجیہہ ہے! دنیا بھر میں اس کی سی آنکھیں کوئی دکھاوے تو اللہ قسم! اپنی آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ میں تنہا دوں۔

رضیہ کے ابا کہا کرتے تھے۔ ”یہ تمہاری بیٹی اپنی آنکھیں کہاں سے لائی ہے؟ میری آنکھیں تو ماشاء اللہ ہیں، تمہاری آنکھوں کو زیادہ سے زیادہ اللہ ماشاء اللہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ رضوی کی آنکھیں!“ اور پھر رضیہ نے تو ابھی ایف، اے پاس ہی کیا تھا۔ بی اے تک پہنچنے کی تو رشتے آئی آپ، دہائی کیوتروں کی طرح پھڑ پھڑا کر اس کے

قد میں ہیں ڈھیر ہونے لگیں گے۔

اور اب رئیسہ بیگم شہر کے سبھی لڑکوں کی ماؤں کے قدموں میں زخمی کیوتروں کی طرح پھڑ پھڑا کر ڈھیر ہونے لگیں جو رضیہ کے ابا کی زندگی میں ان کے ذہن میں بھرتی کے امیدواروں کی طرح صرف باندھے کھڑے رہتے تھے۔ مگر کسی نے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ رضیہ کی طبیعت کیسی ہے! سب نے رئیسہ بیگم کو بیوہ کی حیثیت سے دیکھا۔ یہ کسی نے نہ دیکھا کہ بیوائیں مائیں بھی ہوتی ہیں اور وہ اپنی بیٹیوں کے رشتوں کی ڈالیاں سجا کر نہیں پھرا کرتیں۔ یہ کام تو بیٹیوں کی ماؤں کا ہوتا ہے۔ یہاں تو بیٹیوں والیوں کا طرز عمل کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے رئیسہ بیگم کے شوہر کے ساتھ اس کی بیٹی بھی مر گئی۔

”ہا! بہن رئیسہ بیگم۔“ سب کہتیں ”اسی لیے تو بڑی بوڑھیوں ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھیں کہ اے اللہ میاں، ہمیں اس جہان سے سرتاج سے پہلے اٹھا لیجو۔ ہمیں وہ بھول نہ بننے دیجو، جس کے گرد بلبلیں نہیں منڈلاتیں بلکہ جن پر چڑیاں بیٹھ کر جاتی ہیں۔“

ہر گھر سے وہ یہ کہتی ہوئی انھی ”اب چالوں بہناں! بھائیں بھائیں کرتے ہوئے گھر میں رضیہ بیٹی گھبرا رہی ہوگی۔“

صرف ایک گھر میں اس کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔

”ارے بیٹھو بھی رئیسہ بیگم، کہاں چلیں؟ ایسی بھی کیا جلدی جیسے یہ بتانے آئی ہو کہ ہم جا رہے ہیں۔“

رئیسہ بیگم نے کھٹوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں چالوں بہناں۔ وہاں اس ویرانے میں جسے کبھی ”فرحت کدو“ کہتے تھے، میری رضیہ بیٹی گھبرا رہی ہوگی۔“

”ارہی ہاں وہ رضیہ بیٹی۔“ بانو بولی ”اللہ رکھے وہ تو

نعت رسول مقبول ﷺ

بے شک بلند ہوں پہ ہے فہم و شعور کی جس دل میں جاگزیں ہے محبت حضور کی کس و جہاں گنبد خضرا ہے دیدنی ”چادر تھی ہوئی ہے مدینے پہ نور کی“

دل باغ باغ ہوتا ہے اس سرزمین میں چلتی ہیں ہر طرف ہی ہوائیں سرور کی میں اُمتی ہوں ان کا شفاعت کی ہے امید فہرست یوں طویل ہے جرم و قصور کی جو شخص ان کے سایہ رحمت میں آ گیا اس پر عنایتیں ہوںیں رب غفور کی باقی رہیں گے تا بہ قیامت بفضل رب قرآن پاک اور شریعت حضور کی عالم نہیں تھے غیب کے فیضانِ رب تھا یہ رکھتے تھے سوجھ بوجھ وہ سارے امور کی جاتے تھے حال پوچھنے دشمن کے گھر بھی وہ پیار کی نہی نے عبادت حضور کی خود جنت الہی میں جاتے رسول پاک کرتے دعائے مغفرت اہل قبور کی میں خوش نصیب مجھ پہ گھر مہرباں ہیں وہ لکھنا ہو صدق دل سے میں نعتیں حضور کی (گھر اعلیٰ، کراچی)

اب پوری سیانی ہوگی۔ میں نے تو سال بھر پہلے اس شرف النساء کے گھر دیکھا تھا، اس کی بیٹی کی شادی پر۔ سب لوگ مایوں بیٹھی ہوئی عدلیہ کو چھیڑ رہے تھے۔ جب رضیہ بیٹی دروازے پر نمودار ہوئی، اور اللہ قسم رئیسہ بیگم، خوشامد کی بات نہیں، سارا کراہوں سننا کر رہ گیا کہ بس، جتنے وہ گئے سب کے سب۔ رضیہ بھی گھبرائی کہ یہ ایسا ایک کی سب کو کیا ہو گیا۔ اس معصومہ کو کیا خبر کہ ہم سب اللہ کی قدرت دیکھتے حیران ہو رہے ہیں کہ اچھا تو ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ پلک تک نہ جھپک سکو۔ جھپکو تو سمجھو کوئی گناہ کیا ہے۔ خدا نصیب کرے، کبھی ہے وہ؟ اب کی موت نے تو اسے نچوڑ لیا ہوگا!

گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھتی ہوئی رئیسہ بیگم اب آہستہ آہستہ بیٹھ چکی تھی۔ بولی "موم کی مریم ہو رہی ہے میری جان۔"

"اب تو اس کی ساری لکریں تمہی کو کرنا ہوں گی۔"

بانو بولی۔

"ہاں بہناں، اور کون ہے اس کا؟" رئیسہ بیگم اب پھسکڑا مار کر بیٹھ چکی تھی۔ "بس صرف اتنا سا کام باقی ہے کہ بات کہیں طے پا جائے۔ جہیز تو اس کا دو برس پہلے سے تیار رکھا ہے۔ آدھی درجن نیمکلیوں سے لے کر انشاں اور سیندر تک۔ بس اتنا سا ہے کہ کہیں نصیب جاگیں۔"

"نصیبوں نے تو اس زمانے میں بھنگ پی رکھی ہے بس۔" بانو بولی "یہ ہمارے پردوں میں عاقلہ کو دیکھو، باپ کی اتنی بڑی دکان ہے کہ چاہو تو تانگے سمیت اندر چلی جاؤ۔ پر پانچ سال تک ماں باپ کان دھرے بیٹھے رہے کہ دروازے پر کوئی دستک دے، تو انہیں۔ جب کوئی راستہ بھول کر بھی نہ آیا، تو بیٹی کو اٹھا کر ایک اسکول ماسٹر

کے پٹے باندھ دیا۔ اب اس کے گھر دوسرے میں چڑی جڑواں بچے پیدا کر رہی ہے۔"

"وہ لڑکی تو مصورت کی بھی اچھی تھی۔" رئیسہ بیگم ڈر کے مارے بول دی کہ کہیں بات ختم نہ ہو جائے۔

"صرف اچھی؟" بانو نے کہا۔ "اچھی خاص تھی۔"

"تو پھر تم نے اپنے انور کے لیے کیوں نہ پوچھا؟"

رئیسہ بیگم نے ٹوہ لگانا چاہی۔

الٹا بانو اس کی بات کی ٹوہ تک پہنچ گئی اور ادھیڑ پنے کے باوجود منک کر بولی۔

"اس نے تو درجن لڑکیوں میں سے ایک کو چن بھی لیا۔ اس کے ابا جج سے واپس آ جائیں، تو شاید اگلے چاند کی چودھویں تک....."

"مبارک ہو۔" کے الفاظ رئیسہ بیگم نے "آف ہو" کے لہجے میں ادا کیے اور گھنٹوں پر ہاتھ رکھے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اللہ کا شکر ہے۔ اللہ پھولے پھلے۔"

"آئیں۔" بانو بولی "بس چلیں؟"

"ہاں بہنا چلوں۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ!" رئیسہ بیگم نے کہا اور راستے بھر سوچتی آئی کہ ٹھیک ہی تو کہا ہے بانو نے، سچ سچ اب ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔

برآمدے میں رضیہ پرانا الم کھولے بیٹھی تھی۔ "امی" اس نے کہا "یہ جو لاہور والی خالہ زلیخا ہیں، جو آپ سے لپٹی کھڑی ہیں۔ یہ اچھی پہلی ہیں آپ کی کہ ہمارے ابا کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے ہمدردی کا ایک کارڈ بھی نہ لکھا۔"

"تو ہم نے کہاں لکھا تھا اسے۔" رئیسہ بیگم بولی، اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا "اسے پتا چلتا تو خط کیا لکھتی خود

تہنہ تہنہ۔ خود نہ آسکتی تو اپنے سلیم کو بھیج دیتی۔ پر اسے کوئی بتانا بھی تو۔"

"اکبر ماسوں نے لاہور میں سب کو نو بتایا تھا۔"

رضیہ بولی۔ "اس روز کہہ نہیں رہے تھے کہ ادھر انہیں نارملہ ادھر وہ کھار لے کر سب جانے والوں کے ہاں اطلاع دے آئے۔"

"زلیخا کا نام نہیں لیا تھا اس نے۔" رئیسہ بیگم بولی۔

"میں نے سب کے نام پوچھے تھے، مگر زلیخا کا نام کہیں نہیں آیا۔"

"آپ نے بھی تو یاد نہ دلایا۔" رضیہ نے کہا۔

"ہاں میرے اجڑے ذہن سے بھی اتر گیا۔ برسوں ہو گئے دیکھتے ہوئے۔ اس وقت سلیم کی سبیں بھیگ رہی تھیں۔ ایف اے میں پڑھتا تھا۔ اب ایم اے میں تو ضرور ہو گا....." ذرا سارک کر بولی "بیٹی ذرا کاغذ قلم تو اٹھا لاؤ۔ اکبر کو لکھ دوں کہ وہ زلیخا کو جا کر بتائے۔ میں تو اس کا پتا ہی بھول گئی ہوں۔"

خفا لکھ کر اس نے برق اور حاد رنگی کے نکلز پر لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

تیسرے روز دستک ہوئی، رضیہ تے دروازہ کھولا، تو وہیں سے چلائی..... "اے امی، یہ تو اکبر ماسوں ہیں۔" پھر وہ ماسوں کو پیچھے چھوڑ بھاگتی ہوئی آئی اور کمرے میں جھانک کر بولی "اکبر ماسوں آئے ہیں امی۔"

مگر رئیسہ بیگم نے کسی قسم کے جذب کا اظہار نہیں کیا۔ بڑے سکون سے بولی "ہاں ہاں، آئے ہیں، تو ٹھیک ہے۔ میں نے ہی تو بلایا تھا۔"

"کیوں بلایا تھا؟" اکبر کمرے میں آ کر بولا "بلایا تھا 'نو ساٹھ ہی یہ بھی تو لکھ دیتیں کہ کیوں بلا رہی ہو۔ اب تم دونوں کو جیتا جاگتا دیکھ کر جان میں جان آتی ہے۔ ورنہ

جانے کیسے کیسے بھیا نک نقشے آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ یہ "نورا" اپنی "نورا" کے الفاظ لگتے تو الفاظ ہیں، مگر اصل میں پستول کی گولیاں ہیں، لے کے کاہجہ بلا دیا گھر بھر کا، توبہ ہے۔" دوسرے دنوں ہاتھوں میں دبا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"یونہی تو نہیں بلایا۔" رئیسہ بیگم بولی۔ "کوئی بات ہے جو بلایا۔"

"کیا بات ہے؟"

"اب تمہیں نہیں بلاؤں گی، تو اور کیسے بلاؤں گی؟"

"ٹھیک ہے، میں یہ کب کہتا ہوں، پر باجی، یہ بھی بتاؤ کہ خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں ویسے سب خیریت ہے۔"

"تو پھر ادھر آؤ۔ دونوں یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تو تم لوگوں سے ملا ہی نہیں۔" ذرا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اکبر نے پوچھا "بھئی باجی۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ مجھے بلایا کیوں تھا۔ تم نے تو سولی پر لٹکا رکھا ہے مجھے۔"

"بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔" رئیسہ بیگم نے رضیہ کی طرف کچھ اس طرح دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی جیسے امی نے اسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا ہو۔

"تم کہاں چلیں رضیہ؟" اکبر نے پوچھا۔

"ماسوں جان، میں ذرا ادھر....."

"جانے دو۔" رئیسہ بیگم فوراً بول اٹھی۔ "جاؤ بیٹی تم ماسوں کے لیے چائے تیار کرو۔"

رضیہ چلی گئی، تو اس نے اکبر سے کہا "دیکھو اکبر! رضیہ کے ابا کے مرنے کے بعد مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو رضیہ کے لیے بیاہ کا انتظام اور دوسرے اپنی موت کا انتظار کرنا ہے۔"

"باجی....."

"یہی بات، باقی، تم خط میں بھی تو لکھ سکتی تھیں۔"

"ہاں! رضیہ بولی۔" "نہی کا لگتا ہے۔"

رئیسہ بیگم کچھ دیر تک لٹائے کو لٹتی چلتی رہی، جیسے سوچ رہی ہے کہ کس طرف سے چاک کروں۔ اگر چاک کر لوں تو کہیں خدا اپنی عبادت بولنے نہ لگے۔ رضیہ چپکے سے کمرے میں سے نکل آئی۔

رئیسہ بیگم اسے جاتا دیکھ کر مسکرائی۔ لٹانہ چاک کیا۔ آدھا خط پڑھنے تک یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چھٹی رہی۔ پھر یکا یک چراغ کی طرح بجھ گئی۔ پھر وہ ایک غیر انسانی چیخ مار کر وحشیوں کی طرح کمرے سے باہر نکلی۔ رضیہ دوڑی آئی۔ رئیسہ بیگم نے خط اس کے ہاتھ میں ٹھونس کر پوری قوت سے کہا "اسے پڑھو۔ اوتھا اونچا پڑھ کر سناؤ۔ سارے محلے کو سناؤ، ساری دنیا کو سناؤ۔"

"امی! رضیہ نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ مگر رئیسہ بیگم نے رضیہ کو اپنے آپ سے جیسے فوج کر الگ کر دیا اور اسے ڈپٹ کر بولی۔ "پڑھو۔"

رضیہ ہولے ہولے پڑھنے لگی۔ اس کے اکبر ماسوں نے اپنی "بیاری باجی" کو اطلاع دی تھی کہ ایک عجیب اتفاق ہو گیا:

"میں تمہیں خط لکھتا تو کیسے لکھتا۔ ہوا یہ کہ میں زلیخا بہن سے ابھی ادھر ادھر کی باتیں کر رہی رہا تھا کہ اس نے جھٹ سے اپنے سلیم کے لیے میری رخسانہ کا رشتہ پوچھ لیا۔ اب میں حیران کہ کیا کروں؟ پھر سوچا کہ رخسانہ بھی تو تمہاری بیٹی اور رضیہ سے سات سال بڑی ہے۔ آج رخسانہ کے تفسیب جاگے ہیں، تو کل رضیہ کے بھی ضرور جاگیں گے۔ سو بات وہیں طے پاگئی۔ ہمار جب نکاح کی تاریخ منظر ہوئی ہے۔ تم ہفتہ عشرہ پہلے پہنچ جانا۔ رضیہ کو بھی ساتھ لیتی آنا۔ یہاں دو تین لڑکے میری نظر میں ہیں۔۔۔ دعا کا طالب اکبر!"

اکبر نے شکایت کی۔ "تمہیں، اکبر پیارے! ایسی باتیں خطوط میں لکھنے کے زمانے گزر گئے۔ آج کل ڈاک کا کیا اعتبار۔ غلطی سے یہ خدا اڑوں پڑوں والوں کے ہاتھ لگ جائے، تو اشتہار بنا پھرے۔"

مگر بھر خاموشی رہی۔ پھر رئیسہ بیگم بولی "پھر اب کیا ارادہ ہے؟" اکبر بولا "ٹھیک ہے۔ جاتا ہوں۔ بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی مناسب بات ہے۔"

چائے پی کر اکبر واپس چلا گیا۔ اور ادھر رات گئے تک ماں بیٹی ایک دوسرے سے یوں جھینپی جھینپی پھرتی رہیں جیسے کوئی بات کریں گی، تو کچھ ٹوٹ مات جائے گا۔ "جاگ رہی ہو میری رضو۔" آخر رئیسہ بیگم نے اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑا۔

"ہاں امی! رضیہ بولی "پڑھ رہی ہوں۔" "میں آج بہت خوش ہوں۔" رئیسہ بیگم نے راز فاش کیا۔

"شکر ہے۔" رضیہ بولی۔ پھر خاموشی چھا گئی، کیونکہ رئیسہ بیگم کو بات آگے بڑھانے کے لیے کوئی نئی بات نہ سونجھی اور رضیہ بات آگے بڑھانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اسی کیفیت میں ایک دن گزرا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ ایک مہینہ گزرا۔ آخر ایک روز رئیسہ بیگم نے اکبر کے نام ایک لمبا خط لکھا۔ برقع اوڑھا اور گلی کے کٹڑ پر لیٹر بکس میں ڈال آئی۔ تین چار دن بعد ڈاک کے دستک دی۔ رضیہ دروازے کی طرف لپکی، اور خط لا کر ماں کے حوالے کر دیا۔ "اکبر کا معلوم ہوتا ہے۔" رئیسہ بیگم نے کہا۔

مزاحیہ غزل

پہلی خطا ہی اس کی اگر درگزر نہ ہو
پھر عاشقی کا شوق اسے عمر بھی نہ ہو
اکثر میں سوچتا ہوں فریب نظر نہ ہو
برقعے میں دیکھنا کہیں اس کی "مدد" نہ ہو
بہوی کے سامنے تمہیں آپا جو کہہ دیا
اتنی سی بات پر خطا مائی ڈیئر نہ ہو
آنکھوں میں لے کے لڑکیاں پھرتی ہیں بجلیاں
شاید وزیر بجلی کو اس کی خبر نہ ہو
اسے شاد، تھانیدار سے تم تک شکا کرو
ورنہ یہ رات تھانے میں اپنی بسر نہ ہو

فخر اللہ شاد

"ہاں جانتا ہوں۔"

"اس کا بیٹا سلیم۔" رئیسہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔
"ارے ہاں..... ہاں۔" اکبر بھی ڈراما مسکرایا۔

اب رئیسہ بیگم المہمان کے ساتھ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ "کچھ اتنے امیر بھی نہیں کہ خرے کرنے لگیں۔ سیدھا سادہ، درمیانہ گھرانہ ہے۔ پھر زلیخا کے ساتھ میرا اتنا پرانا تعلق ہے کہ مجال ہے جو وہ انکار کر جائے۔ تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں کہاں اس بڑھاپے میں مادی ماری پھروں گی۔ اگر تمہارے ساتھ چلی بھی جاؤں، تو رضیہ کو اکیلے کیسے چھوڑوں؟ اسے بھی لے جاؤں، تو یہ باتیں کیسے سنوں کہ رشتے کی خاطر جینی کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے، نمائش کے لیے۔ سو تم یوں کرو کہ واپس جا کر اسٹیشن سے سیدھے زلیخا کے گھر پہنچو اور اس سے سیدھی بات کرو۔ کہہ دو رئیسہ نے یونہی کہا تھا۔"

"سنو تو! مجھے ایسی گورڑی بیوا نہیں جن کی کوئی زینہ لولا نہیں ہوتی، یہی تو کیا کرتی ہیں اور کر ہی کیا سکتی ہیں؟ تو بات یہ ہے کہ رضیہ کے رشتے کا انتظام کرنا ہے جلدی سے۔ اتنی دیر نہ لگے کہ بیٹی ہاں سے اس کی طبیعت کا حال بھی پوچھے، تو ایسا لگے جیسے اپنے بیاہ کی یاد دہانی کر رہی ہو۔"

"یہ تم مجھے بتا رہی ہو باجی؟" اکبر نے بہن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں بھی تو رخسار اور وردانہ کا باپ ہوں، اور وہ تو رضیہ سے پانچ پانچ سات سات سال بڑی ہیں۔"

"پھر یہ کہ بڑا مشکل ہے، مجھے دیکھو، لاہور میں رہنا ہوں۔ اتنا بڑا کاروبار ہے۔ بنگلہ ہے، سوٹر ہے۔ سب کچھ ہے مگر داماد نہیں ملتا۔ سب کہتے ہیں لڑکیاں زیادہ پڑھی لکھی نہیں۔"

"پر رضیہ نے تو ایف اے پاس کر لیا ہے۔" "ٹھیک ہے مگر وہ سیالکوٹ میں رہتی ہے ما۔ لاہور، کراچی میں، دہلی تو ایک دن بھی نہ لگتا۔"

"تو میں لاہور میں اٹھ آؤں؟ میں تو اس کام کے لیے دنیا کے آخری کنارے تک جانے کو تیار ہوں۔"

"آ جاؤ۔" اکبر نے کہا۔ "سنو! رئیسہ بیگم کا ایجا اچانک بدل گیا۔" ایک رشتہ ہے۔

"کہاں؟" اکبر دم دم بخود سارہ گیا۔ "لاہور میں!" "لاہور میں؟" اکبر نے یوں پوچھا، جیسے لاہور میں رشتے کی موجودگی ناممکنات میں شامل ہے۔

"ہاں ہاں۔ میری وہ بیٹی ہے، تم تو اسے جانتے ہو، زلیخا۔"

قابو بھی پالیا۔ دوسرے پاکستان میں بار بار مارشل لا کے نفاذ اور کمزور جمہوریت نے عوام میں عدم اعتمادی پیدا کر دی۔ اسلام ہمارے اتحاد کی بنیاد ہے۔ اور اردو تو ملی زبان

ترقی و خوش حالی کی نرید

نئے صوبے

بننے چاہئیں؟

صوبوں کی قلت کے باعث دو دروازے علاقوں میں مقیم لاکھوں پاکستانی انتظامی و قانونی مسائل سے دوچار ہیں

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی



جس سے تمام قوم اتحاد میں پروٹی جاتی ہے۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر ہم عدم اتحاد کا شکار ہیں۔ ایک اہم وجہ صوبے کم ہونا بھی ہے۔ اگر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی مثالیں سامنے رکھی جائیں تو یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ صوبوں کو خود مختاری دی جائے تو ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر مضبوط تر بن کے ابھرتا ہے۔ اس ضمن میں مندر ذیل ممالک کی مثالیں پیش ہیں:

نام ملک	کل صوبے
جرمنی	۱۶ صوبے
کینیڈا	۱۳ صوبے اور ۳ علاقے
چین	۲۲ صوبے اور ۸ خود مختیار علاقے
ناجییریا	۳۱ صوبے
افغانستان	۳۳ صوبے
ملائیشیا	۲۷ صوبے
فرانس	۲۲ صوبے
چلی	۱۲ صوبے اور ایک شہری علاقہ
ایران	۲۳ صوبے
ترکی	۸۱ صوبے
انڈونیشیا	۲۷ صوبے
جاپان	۴۷ صوبے
سعودی عرب	۱۳ صوبے
امریکا	۵۰ ریاستیں
سنگاپور	۵ صوبے
لجیریا	۲۸ صوبے

سنگاپور کا رقبہ ۶۲۴ مربع کلومیٹر ہے اور اس کے پانچ صوبے ہیں۔ جبکہ پاکستان کا رقبہ ۷۹۶۰۱۹۶ مربع

کلومیٹر ہے اور اس کے صرف چار صوبے ہیں۔ اسی طرح جنوبی ایشیائی طور پر پاکستان سے چھوٹے کئی ممالک کہیں زیادہ صوبے یا ریاستیں رکھتے ہیں۔ وجہ یہی کہ انتظامی، سیاسی اور معاشی امور بہتر طور پر چلانے کے لیے زیادہ صوبوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ورنہ بہترین انتظام حاصل نہیں ہو سکتا۔

پنجاب کی آبادی ساڑھے آٹھ کروڑ ہے۔ یہ آبادی جرمنی کے برابر ہے جہاں انتظامی صوبے ۱۶ ہیں۔ جرمنی زبردست معاشی اور عسکری قوت ہے۔ سرنی لٹکا جیسے چھوٹے ملک میں بھی انتظامی اکائیاں ۱۶ ہیں یعنی ۸ صوبائی کونسلیں اور ۶۸ ضلعی کونسلیں۔

دنیا کے مختلف ممالک کی مثالوں سے عیاں ہے کہ پاکستان میں نئے صوبے تشکیل پانے چاہئیں۔ مثال کے طور پر سرائیکی صوبہ (مرکز ملتان) اور صوبہ بہاولپور وقت کی ضرورت ہیں۔ پونچھوہار کا بھی علیحدہ صوبہ بننا چاہیے جس میں راولپنڈی، چکوال، جہلم اور اٹک کے اضلاع شامل ہوں۔

انتظامی لحاظ سے پنجاب کی تقسیم لازمی ہے۔ صادق آباد سے لاہور کا فاصلہ قریباً ۵۰۰ کلومیٹر بنتا ہے۔ انتظامی سہولت کے تحت اگر بہاولپور صوبہ بن جائے تو عدالتی، انتظامی اور دفتری معاملات نمٹاتے ہوئے عوام کے لیے فاصلے سمٹ جائیں گے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ علاقے جو لاہور سے انتظامی و تجارتی طور پر منسلک اور بہاولپور سے دور ہیں، وہ جنوبی پنجاب میں نہ شامل کیے جائیں مثلاً میانوالی اور بھکرہ وغیرہ۔

اسی طرح سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں بھی مزید صوبوں کی ضرورت ہے۔ قانا اور پونچھوہار کو بھی علیحدہ صوبہ بنانا چاہیے۔ پونچھوہار کے اضلاع کی آبادی ناروے،

بچھلے بولے:
 ذوں ایک خیر خواہ سے ملاقات ہوئی۔

”واہ، واہ ماشا اللہ! خوب مزاح لکھتے ہیں ابھی کل ہی کے اخبار میں آپ کی تحریر دیکھی۔“
 تعریف سن کر اچھا تو بہت لگا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی کسر نفسی سے کام لینا پڑا: ”جی بس یہ آپ کی مہربانی ہے کہ پڑھ لیتے ہیں ورنہ ہم کچھ ایسا خاص بھی نہیں لکھتے۔“
 یہ عاجزی ہمیں بہت ہنسی پڑی۔ گویا ہوئے: ”جی واہی آپ کا منعمون زیادہ خاص تو نہیں تھا۔ بس آپ کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔“

بعد ازاں انھوں نے ہمیں ایک عدد مشورے سے

انداز تحریر سنوارنے کو

ہم نے پاکستانی فلم دیکھی

اسی سالہ ہیرو اور ہیروئن کی غیر معمولی اداکاری نے فرسٹ کلاس ڈانٹوں سے آشنا کر دیا

ملیب امین قیصرانی



ہیں کیونکہ تمام صوبے جغرافیائی لحاظ سے ملحق ہیں۔
 پاکستان میں زیادہ صوبوں کی بدولت سیاست و معیشت میں بہتری آئے گی۔ جرائم بھی کم ہوں گے۔ ہر صوبے کی سطح پر عدلیہ کا ادارہ بہتر طور پر کام کر سکے گا۔ سستا اور فوری انصاف ملے گا۔ اس سلسلے میں انگریز آقا لارڈ میکالے کا فوجداری قانون بدل کر شرعی نظام تفتیش نافذ کرنا ہوگا۔ فرعون پولیس کی غنڈہ گردی اور رشوت خوری بھی ختم ہوگی۔

اس وقت نئی سوچ، نئی انقلاب اور ایسی نوجوان قیادت کی ضرورت ہے جو عوام کی خادم بنے نہ کہ حاکم۔ بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان نے کتنے پلاٹ اور دولت چھوڑی تھی؟ ہمیں عوام و وطن دشمن حاکموں اور سیاست دانوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ظالم بادشاہ اور فرعون قیامت کے دن باری تعالیٰ کے سامنے چیونٹی بن کر نمودار ہوں گے۔ پھر ان خبیثوں کو کوڑے مار کر جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ قیامت کے دن پاکستان کے فرعون اور کرپٹ سیاست دان خدا کو کیا جواب دیں گے؟

سنہری باتیں
 عمل میں انخاص عمل سے زیادہ محنت ہے۔ (عبداللہ ظہیق)
 جس شخص کی لوگ عزت اور تکریم کریں اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو حقیر اور کمتر خیال کرے۔ (عبداللہ منزلی)
 جسے گمان ہو کہ وہ حقیقت سے قریب ہے وہ دراصل حقیقت سے دور ہوتا ہے۔ (علی بن اسماعیل)
 حقیقی راحت نفسانی خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرنے ہی میں ہے۔ (یوسف اسباط)
 روزخ سے نجات چاہتے ہو تو خلق خدا کی خدمت کرنے کو اپنا شعار بناؤ۔ (شمس تبریزی)
 تو اضع یہ ہے کہ تو جسے بھی دیکھے اپنے آپ سے بہتر سمجھے۔ (عقابی ہارونی)
 (تحریر: رفیقان، عادل والا)

بھی تو اتر دیا: ”آپ اپنے مزاج میں نکھار لانا چاہتے ہیں تو مزاجیہ کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ خاص طور پر وقت ملے تو پاکستانی فلمیں ضرور دیکھیں۔“

ان کے مشورے کا ایک حصہ تو سمجھ میں آیا کہ چلو ٹھیک ہے مزاج لکھنے کے لیے مزاجیہ تحریریں پڑھنا ضروری ہے۔ مگر مشورے کا دوسرا حصہ سر کے اوپر سے گزر گیا۔

”پاکستانی فلموں سے آپ کی مراد شاید مزاجیہ فلمیں ہیں؟“ ہم نے تصدیق چاہی۔

”ضروری نہیں۔۔۔ کوئی بھی فلم دیکھ لیں۔“ بات چلے تو نہ بڑی تاہم تجسس ضرور ہوا کہ پاکستانی فلم میں آخر ایسا کیا جادو ہے کہ کسی فلم کار کے مزاج میں نکھار لے آئے۔

☆☆

ڈی وی ڈی لینے کسی دکان پر جانا ہماری روایت پسند نظر میں معیوب حرکت تھی کہ کسی شناسا سے سامنا ہوا تو خواہ مخواہ منہ چھپاتے پھریں گے۔ تاہم تجسس اپنی جگہ رہا۔ بالآخر ایک دن خود کو تہ چادر میں چھپا کر بازار نکلے۔ ایک صاحب جو شکل و صورت سے کالی معقول نظر آتے تھے ان کی دکان میں داخل ہوئے اور کہا: ”کچھ معیاری پاکستانی فلمیں دکھائیے۔“

انہوں نے ہمیں ایک نظر سر سے پاؤں تک دیکھا پھر زریب دہرایا: ”پاکستانی معیاری فلمیں۔“

پھر دکان کے عقبی حصے کی طرف آواز لگائی: ”شیدے! صاحب کو پاکستانی معیاری فلمیں دکھاؤ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر ہمیں سر سے پاؤں تک گھورا۔ چند لمحوں بعد شیدا فلموں کا ڈھیر لے

اردو ڈائجسٹ 186

آیا اور پوچھا: ”کون سی فلم کی ڈی وی ڈی چاہیے آپ کو؟“

ہمارے خیر خواہ نے ہمیں کوئی نام نہیں بتایا تھا سو ہم بولے ”کوئی سی بھی دے دیجیے۔“

اب انہوں نے نام گونا گونا شروع کیے: ”شریف گجر، بدعاش گجر، بدتمیز گجر، لڑاکا گجر۔۔۔۔۔“

بڑی مشکل سے آگے بند باندھا کہ صاحب اس طرح کی فلمیں نہیں چاہئیں اور کہا: ”آپ کے پاس

رومانی فلمیں ہوں گی؟“ وہ پھر سے شروع ہو گئے:

”کلین شیڈ گجر، کالا گجر، اولی گجر۔۔۔۔۔“ مزید بحث و تمجیس کا حوصلہ نہ رہا تھا سو گویا ہوئے:

”بس کوئی سی بھی دے دیں اور براہ مہربانی مجھے فلم کا نام مت بتائیے گا۔“

☆☆

ڈی وی ڈی لیے گھر پہنچے۔ پھر اپنے ایک دوست کو بلا لیا۔ دراصل ہم فلمیں بہت کم دیکھتے ہیں اور فلم اسی وقت سمجھ آتی ہے جب کوئی ساتھ بیٹھ کر ہمیں بتاتا رہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ تجھے کی حد درجے منت سماجت کے بعد لپ ٹاپ ملا۔ ڈی وی ڈی لگاتے ہوئے اس پر بڑا سا ”گجر“ لکھا ہوا ہم نے دیکھ لیا۔ اور پھر فلم شروع ہوئی۔

ایک ”ساٹھ سالہ“ باپ اپنی اپنی ”بچپاس سالہ“ بیٹی کے ہمراہ کسی ظالم ڈیرے کے ظلم سے تنگ آ کر بھاگ رہا تھا۔ پولیس کی دو گاڑیاں ان کے تعاقب میں تھیں۔ باپ بیٹی ویرانے میں سے ایک گھر میں جا چھے۔ دوست نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا کہ یہ گھر خالی ہو

جنوری 2015ء

گا۔ گھر خالی ہی تھا تاہم منظر میں کچھ کئی محسوس ہوئی۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کونے سے اچانک ایک بھینس سامنے آئی، ”صدائے چارو“ بلند کی ادا سے دم ہلائی اور یوں منظر مکمل ہو گیا۔

گھر پہنچ کر باپ بیٹی کے ساتھ ڈائریکٹر کی نبی امداد ایک عدد کلاشکوف کی صورت شامل ہو گئی جس کا پہلے سارے فسانے میں کہیں ذکر نہیں تھا۔

اور پھر پولیس کی صرف دو گاڑیوں سے کم و بیش ستر لاکھ اترے اور انہوں نے علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بیٹی نے کلاشکوف کا بٹ دیوار کی اینٹ اکھاڑنے کے لیے مارا تاہم وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بیٹی نے زریب کچھ پڑھا۔ ہمیں شک ہے کہ وہ واقعتاً دعائیں پڑھ رہی تھیں یا اس مشکل سین پر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو گالیاں دیتی رہی۔

بہر حال اگلے ہی پل نہ صرف اینٹ بیٹی بلکہ وہاں بے سوراخ سے پولیس اہلکاروں پر گولیاں بھی برسے لگیں۔ نشانہ ایسے غضب کا اور ڈائریکٹر کی نبی امداد اس کمال درجے کی تھی کہ ابتر ترین فائر ہوئے اور ادھر تیرہ پولیس والے لڑھک جاتے۔ یوں صرف سات آٹھ گولیوں نے ستر سپاہیوں کا کام تمام کر دیا۔

گو اس کرشماتی سین کے بعد ہمارے مزاج میں خاطر خواہ نکھار آ گیا تب بھی ہم کسی طور دوسرا منظر دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ ہمارا دوست ایک ہاتھ سے ہنسی کے مارے پیٹ پکڑے ہوئے تو دوسرے سے ہمیں کھینچ کر بچانے کی سعی میں تھا۔ سو اس کے اصرار پر مجبوراً ہمیں بیٹھنا پڑا۔

اگلے منظر میں انسانی طاقت کا زبردست مظاہرہ

اردو ڈائجسٹ 187

ڈاکیمنٹ کو ملا۔ ایک بڑا ٹرک سڑک پہ گاڑن تھا۔ جب پل کے نیچے سے گزر رہا تھا تو اچانک جھٹکے سے رک گیا۔ ڈرائیور باوجود کوشش کے ٹرک اپنی جگہ سے ہلانے پر بھی قادر نہ ہوا۔ تب کیمرا رقتہ رقتہ اوپر کی جانب اٹھا اور ہم ایک بار پھر ڈائریکٹر کی پیشہ ورانہ خوبیوں اور فراست کے قائل ہو گئے۔

دور پہاڑی پر کھڑے کھنگریا لے بالوں والے ایک ”اسی سالہ“ نوجوان نے ایک رسا وہاں سے پھینکا تھا۔ نوجوان کو پھر فیسی مدد کی ضرورت تھی جو اسے میسر رہی۔ پل کے اوپر سے پھینکا گیا یہ رسا ہائر جیکڑے میں کامیاب رہا۔ پھر ہماری گنہگار آنکھوں نے اس ولی کے ہاتھوں کا کمال دیکھا۔ وہ رسا سیکڑوں ٹن وزنی ٹرک فضا میں بلند کرنے لگا۔

واللہ! ہمیں ان سورما کی خوداک پر چنداں شک نہیں کہ دیکھیں آرڈر پر ہوانے اور پھر بانسے کا سیرپ ساتھ رکھ کر تناول فرماتے ہوں گے۔ وہی بے چاری بدجنسی تو وہ سر ہانے بیٹھ نکلنے باندھے انہیں کھتی ہوگی۔ خود ہمارے محلے میں ایسے ایسے سورما رہتے ہیں کہ کھانے کے لیے بیٹھیں تو گھر والے رضا کا وہانہ طور پر اپنے حصے کا کھانا بھی ان کے آگے رکھ خالی خولی چنے چبارے ہوتے ہیں۔

اگر کوئی ہم سے کہہ دے کہ یہ فلم پاکستان کی فلمی صنعت کا شاہکار ہے۔ کوئی دعویٰ کرے کہ یہ فلم اپنے حصے میں جیسوں قومی ایوارڈ رکھتی ہے تب بھی ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہو گا۔ بلاشبہ اس فلم میں جو کچھ مزاج دیکھنے کو ملا وہ دیگر سماج کی بیشتر فلموں میں عمقاً ہوتا ہے۔

جنوری 2015ء

جسے اللہ رکھے، اُسے کون چکھے

محبہ اللہ نے پچالیا

بہلا پھسلا کر معصوم لوگوں کو لوٹنے والے
ایک خطرناک گروہ کا سنسنی خیز قصہ

مہ جبین

سچا واقعہ

نے لیڈی میٹلیگن کالج، لاہور میں نیا نیا
داخلہ لیا تھا۔ لڑکیوں سے زیادہ واقفیت بھی
نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ وقت لیکچر سننے، نوٹ
بنانے اور برآمدے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے رہنے میں
گزرتا۔ بیرون ختم ہونے پر میں سڑک سے رکشا پکڑتی
اور گھر چلی آتی۔

سب سے زیادہ تکلیف دو لمحات میرے لیے یہی
ہوتے کیونکہ ہمارے کالج کے ساتھ ہی ٹیلی کالج اور
دوسرے بے شمار تعلیمی ادارے واقع ہیں۔ چھٹی کے وقت



اردو ڈائجسٹ 188 جنوری 2015ء

کسی سواری کا ملنا جوئے شیر لانا ہوتا۔ بیس عموماً کچھ کچھ
بھری ہوتیں۔ ویسے بھی مجھے دو بیس بدلنا پڑتی تھیں۔ اس
لیے عموماً رکشا پر گھر جاتی۔ چاہے اس کے لیے مجھے دو گھنٹے
کھڑے رہنا کیوں نہ پڑتا۔

ایک بار جماعت میں میری طبیعت بھاری سی ہو
گئی۔ سر میں شدید درد ہونے لگا۔ لگتا تھا ابھی بھار چڑھ
جائے گا۔ میں نے بیرون چھوڑ کر گھر کی راہ لی۔ اتفاق ایسا
ہوا جو نہیں میں کالج کے دروازے سے نکلی، سامنے سے
ایک رکشا آتا نظر آیا۔ میرے ہاتھ دینے سے پہلے ہی وہ
رک گیا۔ بن سوچے سمجھے میں بھی اس میں جا بیٹھی جیسا
کہ عموماً نہیں کرتی ہوں۔

میں نے رکشے والے کو گھر کا راستہ بتایا اور بے فکر
ہو کر بیٹھ گئی۔ رکشے والا مضبوط جسم کا کمر عمر لڑکا تھا۔
تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بڑی سٹھکی سے بولا ”باجی
مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ آپ اجازت دیں
تو عرض کروں۔“

میں کچھی، شاید راستے کے متعلق کچھ کہے گا۔ میں
نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میرے جواب پر کہنے لگا ”باجی
دراصل میں کل سے بہت پریشان ہوں۔ آپ پہلی
سواری ہیں جسے میں قابل اعتماد سمجھ کر اپنی پریشانی بتا رہا
ہوں۔ آپ مجھے یہی نظر میں اپنی بہن لگی ہیں۔ میری
بہن سوات میں رہتی ہے۔“

میں ان پر خلوص الفاظ سے کچھ مگنی اور اس کی
حوصلہ افزائی کی کہ مجھے بتائیے، کیا بات ہے؟

وہ بولا ”باجی کل دو پہر میرے رکشے میں ایک غیر ملکی
عودت چڑھی تھی۔ وہ مجھے انارکلی لے گئی۔ مجھے ٹھہرا کر
خریداری کی پھر مجھے اسٹیشن چلنے کا کہا۔ میں اسے اسٹیشن
چھوڑ آیا۔ باجی میں اسے چھوڑ کر ہوٹل کھانا کھانے اترتا تو

اردو ڈائجسٹ 189

تین بنڈل اپنے رکشے میں پڑے دیکھے۔ وہ مہم صاحب
انہیں چھوڑ گئی تھیں۔ میں فوراً ہی اسٹیشن پہنچا۔ مجھے وہ نہیں
ملی، نہ جانے کون سی گاڑی میں چلی گئی تھی۔ پہلے سوچا، یہ
بنڈل تھانے دسے آؤں۔ لیکن باجی میں تھانے جانے
والی چیزوں کا حشر جانتا ہوں۔

”ایک بار میں نے ایک مسافر کا ہنود تھانے جا کر
دیا۔ آپ یقین کریں، تھانے دار نے میرے سامنے ہنود
کھول کر پیسے تقسیم کر لیے اور پچاس روپے مجھے پکڑا کر
کہا کہ باجی بیٹھ کر۔ باجی! میں نے بنڈل کھولے۔ ایک
میں تین ساڑھیوں ہیں اور دوسرے میں سفید موتیوں کا
قیمتی ہار۔ تیسرے میں سرسئی رنگ کی شال ہے۔ میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ اکیلا آدمی ہوں، کوئی
بھی چیز میرے کام کی نہیں۔“

بات کچھ ایسی تھی کہ میرے دل کو جا لگی۔ میں بن
سوچے بول پڑی ”مجھے دکھاؤ، اگر قیمت کم لوگے تو میں
خرید لوں گی۔ تم پیسے رکھ لیتا۔“

اس نے رکشا روکا اور آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔
پھر بولا ”باجی مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں۔ ایک بہن
میری پردیس میں ہے، دوسری آپ کو کہا ہے۔ یہ چیزیں
آپ رکھ لیں۔ مجھے لگے گا، اپنی بہن کو دے دیں۔“

اس کی آواز خلوص و محبت سے کانپ رہی تھی۔ میں
دل ہی میں سوچ رہی تھی کہ کم قیمت پر یہ چیزیں ضرور
خرید لوں گی۔ اس نے پھر رکشا اشارت کر دیا اور کہنے لگا
”باجی اس کے بدلے آپ مجھے اچھی جگہ ملازمت دلا
دیتا۔ یہی میری خوش بختی ہوگی۔“

میں حیران تھی کہ جن چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے، وہ تو
مجھ تک پہنچی بھی نہیں۔ پھر میں نے ایک دم محسوس کیا کہ

جنوری 2015ء

لندن میں کیا گزری!

حیرتوں اور مصیبتوں کے ملاپ سے جنم لینے
والے جذباتی لمحات کی دلچسپ سرگزشت جن
سے ایک دیسی خاتون کو ولایت پہنچ کر ٹھنڈا پڑا

راشدہ علوی

علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم ہوئے،
ذوالفقار تو قوم جمہوریت کے جشن منانے لگی۔
انہوں نے ۱۹۷۲ء میں بیمہ زندگی
قومیا نے کا اعلان کر دیا۔ بینک اس کے دو سال بعد
قومیا نے کئے۔ بیمہ قومیا نے کا اعلان اچانک تھا۔ قومی
آسپلی میں بحث ہوئی، نہ کسی سے مشورہ مانگا یا لیا گیا۔
انگلہ قدم میں صنعت و حرفت جس میں ملوں اور فیکٹریوں
کے ساتھ گاؤں میں آنا پینے کی بجلی بھی شامل تھی، قومیا نے
گئی۔ آخر میں پرائیویٹ اسکولوں کی باری آئی۔ بہت سی
چھوٹی صنعتیں یعنی چکیاں اور اسکول دو تین سال کے اندر
اندر اپنی موت آپ مر گئے۔ انگلہ میں سال بمشکل کوئی
اسکول کھلا اور صنعتیں ابھی تک ضعف کا شکار ہیں۔

سج کاری یا نیشنلائزیشن کی باد مخالف نے ہماری
زندگی کا دھارا بھی بدل دیا۔ میرے شوہر محمد حسین
علوی کا تعلق بیمہ زندگی کے شعبے سے تھا۔
عمر کا بیشتر حصہ اسی صنعت سے وابستہ
رہے۔ انہیں اس ابھرتی صنعت کے
تازہ ناک مستقبل پر یقین تھا۔ عام
آدمی جو نوآبادیہ سے اپنی
زندگی



بھکاری

گھر کے دروازے پہ کمر کے چاند ماری بے دھڑک
آ گیا ہے مانتے کوئی بھکاری بے دھڑک
واسطہ دیتا ہے اپنی بھوک کا افلاس کا
کمر کے شامل اس میں اپنی گریہ زاری بے دھڑک
دس روپے کے نوٹ سے کم بھیک وہ لیتا نہیں
منہ بناتا ہے اگر دیں ریز گاری بے دھڑک
ہاتھ خالی لے کے گھر سے یہ نکلتا ہے غریب
لوٹتا ہے کمر کے اپنی جیب بھاری بے دھڑک
صبح دم رکھتا نہیں کیسہ میں اک پائی مگر
شام کو ہوتا ہے وہ اٹھارہ ہزاری بے دھڑک
جانتا ہے مانتے کا اک سے اک اعلیٰ ہنر
ہست نئے نالک رچائے یہ مداری بے دھڑک
بینک کا نمبر اسے جو دیکھ لے آتے ہوئے
دوڑتا ہے تھانے اس کی پٹاری بے دھڑک
لال حق پہ گھڑے سائل کو جب آواز دی
درجنوں آئے نکل اس کے حواری بے دھڑک
دیکھتا ہوں جب کسی سٹاکول والے کو ضیاء
دل پہ لگ جاتا ہے کوئی زخم کاری بے دھڑک
(شرافت ضیاء، اسلام آباد)

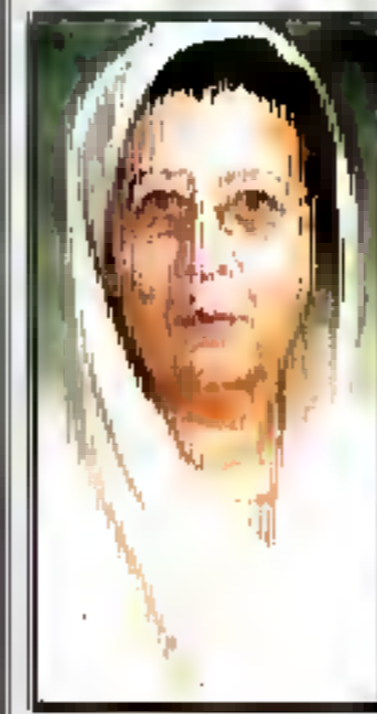
بچا رہ جلد ہی پکڑا گیا۔ اس کی جو درگت بنی سو بنی لیکن
اس انکشاف نے مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ یہ ایسے گروہ کا
ایک فرد تھا جو صرف تباہ مرد و زن کو لوٹنے کی خاطر رکشا
ڈرائیوری کرتے ہیں۔ اللہ نے مجھے بردقت بچا لیا۔ اگر
ذرا سی بیوقوفی کر جاتی تو تھانے کیا ہو جاتا۔

رکشا غلط راستے پر جا رہا ہے۔ میں نے کہا "بھائی! میرا
گھر تو مزنگ کی طرف ہے، یہ راستہ غلط ہے۔"
میرا منہ بولا بھائی بٹا اور کہنے لگا "باجی میں آپ کو
دو تھلے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں۔ دراصل صبح جلدی میں
تھا، اپنی کونٹری میں ہی بھول آیا۔ آپ رکشے ہی میں
رہیے، میں چٹکی بجاتے ہی لے آؤں گا۔"
میں یہ وقت بنی اس کی باتیں سنتی رہی۔ سمن آباد
سے بھی کچھ دور آگے آگئے تو مجھے پہلی دفعہ کچھ شبہ سا ہوا
کہ یہ شخص کہیں مجھے چکر تو نہیں دے رہا؟ میں نے حسوس
کیا کہ اب اس کا رویہ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ میری توجہ میں
کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کہیں تحفوں کے لالچ میں
اپنی جان نہ گنوا بیٹھوں۔ اسی وقت میرے ذہن میں اپنے
بہنوئی کا خیال آیا جو تھانے وار ہیں۔ وہ گھر آ کر اکثر
غریب رہی کی ایسی باتیں سناتے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا بیگ باہر پھینک دیا
اور چلا اٹھی "بھیا! ذرا ایک منٹ رکنا، میرا بیگ گر گیا۔"
"بھیا" اپنی "بھن" کی چال میں آ گیا۔ اس نے
رکشا روکا۔ میں چھلانگ لگا کر بیگ لینے لگی۔ سڑک پر
ہلکی ٹریک چل رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ رکشے
والا واپس پلٹا اور بولا "چلو باجی دیر ہو جائے گی۔"

میں نے بیگ کھول کر نوٹ بک نکالی اور رکشا کا
نمبر نوٹ کرنے کی غرض سے پیچھے ہٹی۔ آپ یقین کریں
اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے رکشا
اشارت کیا اور یہ جاوہ جا۔ لیکن میرے ذہن پر رکشے کا
نمبر ابھی طرح جم چکا تھا۔

نمبر نوٹ کر کے میں نے دوسرا رکشا پکڑا اور گھر آ
گئی۔ میں نے بہنوئی کو سارا قصہ سنا کر رکشے کا نمبر دیا۔



محترمہ راشدہ علوی پیٹال (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد والدین کے ہمراہ راولپنڈی چلی آئیں۔ گریجویٹیشن کے بعد کچھ عرصہ اسکول میں بچوں کو تعلیم دی۔ شادی کے بعد برطانیہ چلی گئیں اور وہیں آباد ہیں۔ لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی، اس لیے اپنی یادداشتیں لکھنے لگیں۔ آپ کی پہلی کتاب ”بستے بستے بستی“ ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اسلام آباد میں بیتے وقت پر لکھی گئی۔ دوسری کتاب ”ہر اوجھیا“ ۲۰۱۳ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مصنفہ نے لندن میں گزرے لمحات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ زیر نظر مضمون اسی آپ جیتی سے بھد شکر یہ لیا گیا ہے۔ اس سفر و آپ جیتی کے چیدہ حصوں سے آئندہ بھی قارئین لطف اندوز ہو سکیں۔

میں یا اس کے بعد حاصل کر رہا تھا، وہ ان کے مشاہدے میں تھے۔ جب وہ ضائع ہوتے دیکھے تو کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

کرنا کیا تھا، بس مضامین لکھ کر اخباروں کو بھیجے گئے۔ پڑھے لکھے لوگ یہی کیا کرتے ہیں۔ میری زندگی کے فائدے اور قومیاں کے نقصانات پر لکھا۔ کئی آوازوں نے لیکر کہا اور شاباش دی۔ میڈیا نے ساتھ دیا۔ لیکن جمہوری حکومت کو یہ مشورہ دخل در معقولات لگا اور سخت ناپسند آیا۔ خیر حکومت کا حق ہے کہ جس چیز کو نامناسب سمجھے، ناپسند کر دے۔ ویسے بھی یہ کوئی قومی اسٹیبل کا فیصلہ تھوڑی تھا، فرد واحد کی آواز تھی۔ نظر انداز کرنا مشکل نہ تھا، لیکن حکومت نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔

محمد حسین علوی کو مضامین لکھنے کی پاراش میں اب سرکاری بیروہ سہنی سے معطل کر دیا گیا۔ ساتھ میں ذہنی سیاست چکاتے اور سینھوں کا آد کار بننے کا الزام لگا۔ ان میں سے کوئی بھی الزام قابل دست درازی پولیس نہ تھا۔ پھر بھی تفتیش کا لاشعاری سلسلہ شروع ہو گیا۔ سال بھر کی چھان بین کے بعد پولیس تھک بار کر بیٹھ گئی، کوئی جرم

انٹرنیشنل کے قومیاتے ہی انٹرنیشنل فیڈرل کے سربراہ، روشن علی بھیم جی پر ملک چھوڑنے کی پابندی لگ گئی۔ شوہر معطل ہو چکے تھے۔ صدمہ کے ساتھ یہ فکر بھی لگ گئی کہ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندرا! تین برس پابندی ختم ہونے میں گئے۔ پابندی ختم ہوتے ہی بھیم جی لندن جاتے کو تیار ہو گئے تاکہ آغا حسن عابدی سے لندن میں انٹرنیشنل کمیٹی کھولنے کے لیے سرمائے کی بات چیت کر سکیں۔ ہاں کا اشارہ ملتے ہی اپریل ۱۹۷۴ء میں میرے شوہر بھی لندن پہنچے اور دونوں نئی کمیٹی کی تشکیل میں جیت گئے۔

مارک لینن میں دفتر کھولنے سے پہلے بی۔ٹی ہاؤس، یوسٹن میں دو بیڈ روم کا فلیٹ کرائے پر لیا گیا۔ اس کی صفائی ستھرائی، برتن

بستروں کی چھاڑ پونچھ کے لیے ایک عورت روزانہ آ جاتی۔ کھانا پکانا البتہ ایک محلہ تھا جسے سر کرنا پڑا۔ بھیم جی قیام بنا لیتے تھے۔ لیکن بقول خود ان کے ہفتہ بھر یہ کھانا کھانے کے بعد لفظ ”قیمہ“ ہی بھوک اڑانے کو کافی ہوتا۔ شوہر نامدار انڈیا ایلے کے بھی قابل نہ تھے۔ پرویس جانے سے پہلے میں نے کچھ ہدایات دینے کی کوشش کی تھیں جنہیں ”اللہ مالک ہے“ کہہ کر مال دیا گیا۔ بیٹھنے کا سکر دفتر کا کام دینے لگا۔

ہاتھ بنانے کو تھیں شیریوانی اور احمد رشید دفتر آنے گئے۔ دونوں لندن اور اس کی انٹرنیشنل کمیٹیوں کے بارے

میں اچھی خاصی سداہ بدہ رکھتے تھے۔ کھانے کے غیر تسلی بخش حالات دیکھ کر احمد رشید نے ہفتہ وار کھانا پکانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ برخوردار خود رشید ہاشمی جوانوں ذمہ داری سنبھالی کرنے کے بعد حالت تذبذب میں تھے کہ پاکستان جائیں یا نہ جائیں ۲۰۱۰ بڑے کام آئے۔ وہ مٹھے بھر کر مارش خریدنے اور کپڑے ڈرائی کلین کرانے کو اپنی خدمات پیش کرتے گئے۔

آسٹریائی لڑکی کی فرمائش دفتر کی خط کتابت کے لیے ایک بھارتی لڑکی اینڈ کو سیکرٹری رکھا گیا۔ لیکن وہ جلد بیچارہ چا کر بھارت چلی گئی۔

اس کے بعد بریجنڈ آئی، چوتیس سال حسین و جمیل آسٹریائی لڑکی، کام میں ماہر، وقت کی پابند اور چست و چالاک تھی۔ تین ہفتے مشین کی طرح



کام کرنے کے بعد اس نے بھیم جی اور علوی صاحب سے بات کرنے کا وقت لیا۔ خیال تھا کہ وہ تنخواہ بڑھانے کی بات کرے گی۔ اور دونوں اس کے لیے تیار تھے۔ لیکن بات شروع ہوئی تو چکرا گئے۔ گفتگو کچھ یوں تھی:

بریجنڈ: کیا میں بد شکل ہوں؟
دونوں: بالکل نہیں۔
بریجنڈ: مجھ میں کوئی ہسمانی کمی ہے؟
دونوں: نہیں، بالکل نہیں۔
بریجنڈ: پھر کیا وجہ ہے کہ آپ دونوں میں سے کسی نے مجھے آج تک چائے پانی یا سینیما تھیٹر کی دعوت تو در

کنارہ میری تعریف میں ایک حرف تک نہیں کہا۔

دونوں ایک زبان بولے: ”تم ہمیں اپنی بہن بیٹی کی طرح قابل احترام لگتی ہو۔“

وہ آگ گولا ہو گئی، بولی: ”ماں بہن بنا نہیں اپنی بہن جینی کو میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں ایک عورت ہوں اور ویسا ہی سلوک چاہتی ہوں، تاکہ ایک مشین کا سا، جو آئی، کام کیا اور چلی گئی۔“ اب دونوں کا جواب تھا کہ اصل میں ہم شادی شدہ ہیں اور۔۔۔۔۔

وہ ترست بولی: ”کیا میں نکاح پڑھانے کا کہہ رہی ہوں؟ بس کبھی کبھی کھانا کھلانے یا سینما دیکھنے کی بات کرتی ہوں، اس میں کیا حرج ہے؟ ویسے بھی تمہاری بیویوں کو کیا پتا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“

اس پر وہ شریف آدمی بولے ”ساری بات بھروسے کی ہے۔“

اب وہ کچھ شکست خوردہ سی ہو گئی اور بولی ”مجھے ان عورتوں سے ضرور ملوانا جن کی عدم موجودگی میں بھی تم کوئی نامناسب حرکت کرنے کو تیار نہیں۔“

اس کے بعد بات نہیں خوشی ملے ہو گئی اور دونوں اسے کھانے پر لے گئے۔ ہو سکتا ہے، یہ جنت کا دروازہ نہ ہو لیکن وہ پاکستانی حضرات کے لیے دلانگہ کھڑکی سے تازہ ہوا کے جھوکے ضرور آنے لگے۔

ہم تو چلے پرویس

منزل شوق و ارمان کو میری روانگی اگست ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ لندن ان دنوں بھی خوابوں کی دنیا تھی جہاں جانے کی تمنا ہر دوسرے دل میں مزجتی رہتی۔ خود میرے دل میں لندن دیکھنے کی دہلی دہلی خواہش سلگتی۔ اسکول کالج کے زمانے سے اس کے پاس و دور کا تصور دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ انگریزی ادب کی ہر کتاب لندن کے قصوں

سے بھری ہوتی۔ اس کے شاعر اور موسم کب سے ہمیں لہا رہے تھے۔ زیادہ تر ان کتابوں میں سبزہ ہی سبزہ لکھا ہوتا۔ اگر کسی دھول دھپے کا ذکر آیا بھی، تو ہم نے اسے قابل دراعتنا نہ سمجھا۔

یہ حالات تھے جب ہمیں لندن کا بلاوا آیا۔ وطن چھوڑتے، ماں باپ رشتے داروں اور دوستوں کو خدا حافظ کہتے اور دسترخوان سمیٹتے ہوئے مال اپنی جگہ لیکن نئی دنیا دیکھنے کا شوق ہر غم پر حاوی ہو گیا۔ اللہ پر بھروسہ کرنا تو دود کو پس پشت ڈال سفر کے لیے تیار ہوئے۔ پاسپان نقل بھی کہیں ادھر ادھر کسکا دیے گئے۔ یوں سفر کو وسیلہ ظفر بنا ہم لندن روانہ ہوئے۔ ہر مہاجر کی طرح خیال تھا کہ حالات سدھرتے ہی واپس لوٹ آئیں گے۔

ہوائی جہاز کے روانہ ہوتے ہی پاؤں کے نیچے سے حقیقتاً زمین سرک گئی۔ بچوں کا ساتھ تھا، ورنہ رورود کرنی نارنج مرتب کر دیتے۔ اب کیا نکھیں، رات گئی بات گئی۔ سفر کا حال اپنی بے خبری اور بے غلٹی کا اعتراف ہے۔ کس منہ سے کہیں کہ سفر ائیر فرانس سے ہوا اور ہاتھ میں ایک فرامک نہ تھا۔ کس طرح اقرار کریں کہ پانچ سالہ احمد رات کا کھانا کھائے بغیر سو گیا اور صبح چار بجے پیرس سے ناشتا خریدنے کی کوششیں ناکام رہیں۔ کیونکہ دس ڈالر کی رقم اتنی بڑی تھی کہ بینک کے علاوہ اس کی ریڑ گاڑی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔

اس بات سے بھی بے خبری تھی کہ جہاز میں چائے کے ساتھ ”پورک“ کے سینڈویچ آئیں، تو دوسرا منگوا لیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کم علمی کی داستان ہمیں بس ہو جاتی، تو کیا حرج تھا لیکن قصبہ طویل ہے۔ ایتھر ہوائی اڈے پر جہاز سے نکلنے کے بعد کوسوں پیدل چلنا پڑے گا علم نہ تھا اور کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ لندن گھومنے والے کسی

ادیب، سفیر اور سفر نامہ نگار کو تو نقش نہ ہوتی کہ ان برآمدوں کی لمبائی کا ذکر کر دیتا کہ مجھ ایسی کئی عورتوں کا بھلا ہو جاتا۔ وہ بچوں کے ساتھ کندھوں پر بیسیوں پونڈ وزنی ٹھیلے لادنے کی حماقت تو نہ کرتیں۔

ارے اتنی بھیڑ

یہ امر بھی لندن آنے کے بعد منکشف ہوا کہ جس شعبے کو ہمارے ماں ایک آدمی چلاتا ہے، ایتھر ہوائی اڈے پر اسے تین ہزار آدمی دیکھتے ہیں۔ اب ہماری جہاز پریشانی کا اندازہ کریں۔ بڑا تو ہمیں ہزار بار بنایا گیا تھا لیکن کتنا بڑا؟ دو گنا؟ دس گنا؟ سو گنا؟ جس ہوائی اڈے سے ہماری اڑان ہوئی وہاں دن میں تین جہاز اتر جاتے تو خبر اخبار کی نہ بنت بنتی تھی۔ یہاں ہر تین منٹ بعد ایک جہاز اتر رہا تھا۔ تین سو سات سو ساٹھ ہر تین منٹ

بعد ان ناقابل ذکر برآمدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ مسافر بھی ہر رنگ، نسل، عمر اور جنس کا۔ پھر خدا جانے کیا تاثیر تھی اس ملک کی ہوا میں کہ سب خاموش تھے۔ منہ بند، چپ چاپ، گونگے! اپنے آپ میں گن، سر جھکائے یا اٹھائے منزل کی طرف رواں تھے۔ کوٹ پتلون، شلوار قمیص، چنچے، ساڑھیاں، چلبا، بے سکرٹ، سائے حرکت میں مگر بے آواز!

ویزد ہال آتے آتے ہم نڈھال ہو گئے۔ دل دہلانے کو لوگوں کی بل کھاتی ہوئی میلوں میں تقاریب

سامنے تھیں۔ خیال آیا کہ رات ہمیں بسر ہوگی۔ انتظار میں کھڑے ادھر ادھر نگاہ ڈال۔ ہال کی وسعت چار پانچ فٹ ہال میدانوں کے برابر تو ہوگی۔ سر پر چکا چونڈ روشنیاں اور پاؤں کے نیچے قالین فرش تھے۔ اللہ چاہتا تو دنیا کے سارے عجائبات کھڑے کھڑے وہیں دکھا دیتا۔ اس کے لیے سب ممکن ہے، ہال کی تو اوقات ہی کیا! اختتام قطار پر ہمیں امیگزیشن انسر کرسی میز لگائے بیٹھے تھے۔ اپنی باری پر سامنے جا کھڑے ہوئے۔ پاکستانی پاسپورٹ پیش کیا۔ تسلی کے بعد دو منٹ میں آگے بڑھنے کا عندیہ مل گیا۔

اگلا مرحلہ سامان کی وصولی تھا۔ ہال کی لمبائی چوڑائی اور روشنیوں کی بہتات کے باوجود ہوش و حواس قائم رہے۔ سامان کے لیے ٹرائی کا ہونا ہمارے ظلم میں اضافہ تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹرائی سنبھالی۔ شکر ہے ہدایات اتنی پار



کھی ہوئی تھیں کہ اندھوں کے سوا سب پڑھ لیں۔ یہ بھی شکر ہے کہ انگریزی پر دھن آتی تھی۔ اتنی ساری نئی چیزیں ایک ساتھ دیکھنا آسان نہیں، دماغ کچھ بے قابو سا ہو رہا تھا۔ بچے الگ ساتھ چپک رہے تھے۔ رہی سہی کسر جس نے پوری کر دی۔ دوسرا صندوق نظر ہی نہ آ کر دیا، وہ پیرس رو گیا تھا یا میری طرح کا کوئی بدحواس اٹھا کر چلنا بنا۔ بہر حال صندوق غائب تھا۔ ابھی تلاش جاری تھی کہ ایک پورٹرنے قریب آ کر پوچھا ”مسز غلوی ہوں؟“ حیرت سے ہاں کہا۔ اس نے بتایا کہ

تمہارے شوہر پریشان ہیں کہ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟ چتا سنتے ہی وہ دفتر شکایات لے گیا۔ یوں ہوئی اڑے سے گھر نکلتی ہوئی۔

سورج چمک رہا ہے

انتہاؤں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اصلی صدمہ تو باہر آ کر ہوا۔ لندن گرمی سے دہک رہا تھا۔ لندن کو لپیٹ کر رکھنے اور ہزاروں انسانے جنم دینے والی وحشت ہمارے آمد پر چل بھن کر بھاپ ہو گئی تھی۔ چلچلاتی دھوپ بدن جھلسا رہی تھی۔ لے لو لندن کے مزے اور منالو خوشیاں۔۔۔۔۔ لندن کو تو برصغیر کی دھوپ نے لپیٹ رکھا تھا۔

لندن تاکتے جھانکتے مجھے وہ گانا سنانی ہی نہ دیا جو میرے شوہر پورے زور شور سے بجا رہے تھے۔ اس کی تلاش میں انھوں نے شہر کنگھال ڈالا تھا۔ آخر توجہ ڈالائی تو اُسے سنا۔ گانے کے بول تھے:

”بہار و بھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔۔۔۔۔“ خیال اچھا تھا مگر اگست کے گرم مہینے میں بھول کہاں؟ یہاں تو آگ برس رہی تھی۔

انگریز مرد وزن کو آتے ہی نیم برہنہ دیکھنے کا موقع ملا۔ کچھ لوگ اس موقع کو ”سنہرا“ کہہ رہے تھے۔ اس میں کیا چیز سنہری تھی بالوں کے سوا؟ پوری قوم گلیوں، سڑکوں اور پیادہ راہوں پر لپٹی گرما گرم دھوپ کے مزے لے رہی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں لینے کے پیچھے لٹسہ یہ بنایا گیا کہ موسم کا یہاں اعتبار نہیں، گھڑی میں نولہ اور گھڑی میں ماشہ ہے۔ ہو سکتا ہے، گھر جاتے جاتے سورج بادلوں میں چھپ جائے، بلکہ ہو سکتا ہے اتنی دیر میں چھما جیم مینہ برس پڑے۔ چنانچہ جلدی سے جہاں جگہ لے،

دھوپ میں بے لباس ہوا اور وقت سے فائدہ اٹھا کر دھوپ تاپ لو۔ شاید چمکتے سورج میں گھاس اکٹھنی کرنے کا محاورہ اسی ملک میں بنا۔

گر یوی سے کری تک

گھر یعنی اسی فلیٹ میں پہنچے جس کا ایک کمرہ دفتر تھا۔ نہا دھو کر طبیعت بحال ہوئی۔ مسند وقت گم ہو جانے کی یاداش میں شلواری ٹیبل سے عمر دی شامل تھی۔ میاں کا سلپنگ سوٹ پہن کر غسل خانے سے نکلی، تو لندن کی سنی سانی مہمان نوازی کا پہلا خوشگوار تجربہ ہوا۔ کھانے کی میز پر ٹکلف پاکستانی کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ میرے رشتے دار احمد رشید جو گزشتہ دس برس سے لندن میں مقیم اور بقول شخصے دہلی کھانا پکانے کے ماہر بن چکے تھے، فوراً آلو قیمہ اور مرغ کا سالن اپنے ہاتھ سے پکا کر لائے۔

دسترخوان کا جائزہ لیا، کھانوں کی شکل کچھ کچھ پہچان میں آ رہی تھی، لیکن خوشبو اینٹیں محسوس ہوئی۔ پوچھنے پر رشید بھائی نے مدراس کری، کشمیر کری اور ونڈ الو جیسے نامانوس نام دھرائے۔ ہماری کم علمی پر ”کری“ کی تعریف بیان ہوئی۔ پھر سالن کے بجائے کری بنانے کا تیر بہدف نسخہ بوتلوں کی شکل میں ہاتھ میں تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ لفظ ”گر یوی“ انگریز ہندوستان ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ ”کسی کھانا یہاں کری کہلاتا ہے۔“

کھانے کے بعد پتا چلا کہ یہ کھانا کم اور کری زیادہ ہے۔ اور اتنی زیادہ کہ مرغ، قیمہ اور گوشت سب اس میں غرق ہو کر اپنی خودی کھو چکے۔ نہ مرغ مرغ رہا، نہ گوشت، گوشت ہے۔ خوشبو نامانوس اور ذائقہ بے گانہ۔ مستقبل میں ہمارے کھانوں کا ذائقہ ایسا ہوگا؟ یہ ذوق

دہن پر کاری ضرب تھی۔ لندن آنے کی خوشی ماند سی پڑ گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ نہ مجھے کھانا پکانا آتا تھا نہ میں پکانے کی شوقین تھی۔ مگر کری کا ذائقہ مستقبل کے دودھ میں مینگنیں ڈال رہا تھا۔

ایک ہی دن میں ناشتے سے رات کے کھانے تک اٹھنے کھانا طبیعت اوب گئی، تو اعلان کرنا پڑا۔ ”کھانا خود بناؤں گی۔“

میری ”مصاحبتیں“ جانتے کے باعث میرے شوہر ڈر گئے۔ پوچھا ”تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟“

قبولنا پڑا کہ اس میدان میں طفل کلب ہوں۔ کھانے کا چسکا ایتہ ہے، شاید اس سے کچھ مدد ملے۔

اختتام ہفتہ وال سبزی اور ان کے لوازمات خریدنے قریب کی ایک دکان پر پہنچے، جس پر دس بنگالی کام کرتے تھے۔ دکان کیا تھی عمر و عیار کی زنجیل تھی جس میں برصغیر کی ہر سبزی، کھیل، پان، وال اور مسالوں کے ساتھ حلال گوشت اور مرغیاں بھی بک رہی تھیں۔

قیمتیں ہیں ہوش ربا

دھنیے کی گٹھی اٹھاتے ہوئے اس کی قیمت پر نظر پڑی۔ وہ ہاتھ سے چھتے چھتے پگی۔ پاکستان میں اس قیمت سے ایک پختے کی سبزی آ سکتی تھی۔ ہرا دنیا اور ہری مرغیں سبزی کے ساتھ منت تھما دی جاتیں۔ قیمت تو

سبزی کی بھی سونے کے بھاؤ تھی، لیکن دھنیے کو کیوں آگ لگ گئی یہاں آن کر؟ یہاں سے شکایت کی تو بولے ”جب تک پونڈوں کو روپے میں تبدیل کرتی رہو گی جانن اسی عذاب میں رہے گی۔ آج سے روپیہ بھول جاؤ اور یہاں کی کرنسی کو قبول کر لو۔“

بہگاری وال میں دھنیے کی سونہری سونہری خوشبو نے وطن، میکا، سسرال اور بادریجی سب یاد دلادیے۔ خوشبو کے چکر میں نمک مرچ کا پتا ہی نہ چلا۔ دھنیے کی قیمت نے جو گھاؤ لگائے تھے، خوشبو نے بھر دیے۔ کھانے کے مسائل سے پہلے مجھے جس مسئلے کو حل کرنا پڑا وہ پہنچنے کو کپڑے تھے۔ پناں چ لندن اترنے کے اگلے ہی روز سفری کپڑے دھو، پین کر آکسفورڈ ڈسٹریٹ کا چکر لگانے کو تیار ہو گئی۔ یہ چکر



مجھ پر فرض تھا۔ میں مستقل ایک جوڑے میں رہ سکتی تھی نہ میاں کے سلپنگ سوٹ میں۔ دوسرے آکسفورڈ اسٹریٹ کی شہرت مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں جانے کا شوق لندن کے شوق سے دو قدم آگے تھا۔ اس بازار کی دکانوں کے شان و شوکت کے چرچے سن سن کر کان پک چکے تھے۔ وقت آ گیا تھا کہ یورپ کی طویل ترین بائی اسٹریٹ میں جا کر یہ نفس تیس خریداری کی جائے۔ پتا چلے کہ دنیا کے سب سے بڑے اسٹور مارکس ایڈ پسنر کا طول و عرض کیا ہے!

لندن کے ہوائی لڈے اور اس کی لہائی چوڑائی سے طبیعت میں جو گھبراہٹ اور خفقان پیدا ہوا، اس کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا تھا کہ آکسفورڈ اسٹریٹ کا ہجوم اور دکانیں سامنے آگئیں۔ اس کی تاریخ اور جغرافیہ بھول کر ہوائی لڈے کی طرح دائیں بائیں دیکھتے ہوئے طلسم ہوش ربا میں داخل ہوئی۔

ایک اسٹور میں

بڑی مشکل سے سامنے لٹکے کپڑوں پر نگاہ کی، تو بیٹنگروں کی تعداد نے پریشان کر دیا۔ اپنے تو پورے ملک میں اتنے بیٹنگر نہ ہوں گے جتنے دکان کے اس حصے میں تھے۔ بیٹنگروں پر نئے کپڑے اس کے علاوہ تھے۔ جان بڑی مشکل میں تھی، کیا دیکھیں کیا نہ دیکھیں، کہاں دیکھیں کہاں آنکھ موند لیں۔ ویسے تو آنکھوں کے ساتھ منہ بھی کھلا تھا، اسے بند کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ قیمتیں پڑھ کر ہوش الگ اڑ گئے۔ اٹنی سیدھی خریداری ہوئی۔ آخر کوٹ پتلون میں ملیں، لندن کے نیالے اور بے رنگ جم فنیئر میں ایک اور انسان کا اضافہ ہو گیا۔

تنبہائی کا عذاب

لندن میں رہنے بسنے کے اپنے انداز و اطوار ہیں۔ پہنچتے ہی ان پر قابو پانے کی تک وود شروع ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ کھانے پکانے سے کہیں زیادہ اہم مسائل بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ ان میں سردست بچوں کا اسکول میں داخلہ تھا۔ پانچ سال کی عمر کا ہر بچہ اسکول میں ہونا چاہیے۔ پہلے دن انہیں اسکول چھوڑ کر آئی تو میاں دفتر جا چکے تھے۔ خاموش گھر میں رہنا دل دہلانے والا تجربہ تھا۔ سمندر کی تیز اندلی لہروں کی طرح تنبہائی سر سے پاؤں تک وجود کو بھگوتی گزر گئی۔ شاید ذیل میں قید تنبہائی ایسی

ہوتی ہو۔ کوئی آواز، آہٹ اور سرسراہٹ نہ تھی۔

وہ آوازیں غائب ہوئیں جن کی میں عادی تھی۔ گم ہوئی بچوں کو پکارتی ماؤں کی پکار اور گلی میں کھیلنے بچوں کی چپکارا یہاں تو چپکار کے ساتھ بچے بھی غائب تھے۔ پوچھنا پڑا کہ کہاں ہیں اس قوم کے بچے؟ جواب ملا، اسکول، کھیل کے میدان میں یا ٹیلی ویژن کے سامنے۔ ان کے گلی کوچوں میں کھیلنے کے دن ہوا ہو چکے۔ اس کے علاوہ بھی ہر ہانسی پکارتی آواز غائب تھی۔ جیتل، تانبہ، قالی کرنے، درزی اخبار خریدنے اور سہزی ترکاری بیچنے والے کی آوازیں انسانہ ہوئیں۔ ایشیا کے بارہائی شہروں کا بے ہنگام بکھرا بکھرا شور داستان پارینہ ہوا۔ اب تو دیار مغرب کی سنی سنائی عتادا آوازیں تھیں۔ یہ ہوتی ہے بے وطنی کہ آوازیں تک اجنبی ہو جاتی ہیں۔

پرندوں کی چوہبہاہٹ تک سنائی نہ دیتی۔ ویسے بھی ہمارے علاقے میں درخت بہت کم تھے۔ پرندے بچارے کیا فلیٹ کی گھڑکیوں سے لنگ کر چمکتے؟ فلیٹ کا ماحول بے گانہ تھا۔ چھتیں نیچی، دیواریں پھولدار اور پاؤں تلے قالین، سب غیر تھے۔ گھڑکی سے باہر دیکھنے کو کچھ نہ تھا، تھا تو دلچسپی سے خالی۔ سرخ آڑی ترچھی چھتوں کے بیچ بٹھا لگتے ہوئے دھندلے سرخی آسمان کو قابل دید کہتا عام انسان کے بس کی بات نہیں اور ہر کوئی پکا سونبیں ہوتا۔

”رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔“ اچھا شعر ہے۔ لیکن بس پالا پڑا تو پتا چلا کہ کیسا ہوتا ہے ایسی جگہ جا کر رہنا جہاں کوئی نہ ہو، نہ واقف، نہ ہمد! ہو سکتا ہے کسی خاص کیفیت میں یہ تنبہائی قبول ہو سکے جیسے محبت میں جتلا ہو کر خدا کی بندگی میں دل انک جائے۔ ہماری

تنبہائی تو بہن بھائی مہمان تھی، اس کا کیا کرتے سوائے عینہ کو بی کے؟

بچپن اور جوانی بھرے گھر میں گزری تھی۔ پچھا، تاپا، خالہ پھوپھوں کے خاندان آتے جاتے رہتے۔ ویسی ہی لہی چوڑی سسرال ملی۔ شوہر دریا دل، ہجوم دوستان میں گھرے ہوئے۔ گھر کے دروازے کھلے عزیز واقارب، دوست احباب، ہمسائے اور محلے دار آتے جاتے۔ کوئی گھومنے پھرتے محلے کی نئی لہی کا قصہ سنا جاتا۔ رات کا

اختتام کسی شادی، کسی شینٹ پر ہوتا۔ عادت یہ تھی کہ کوئی ہمیں ملے آئے یا ہم کسی کو ملنے جائیں تو باتیں ہوں۔ چٹکے اور ہنسائے سنے جائیں۔ کہانیاں، قصیدے دہرائے جائیں۔ خاندانی جھگڑوں کا ذکر ہو۔ حالات حاضرہ اور سیاست پر تبصرہ ہو اور

کچھ نہ ہو تو دو تین خواتین مل کر دوپٹوں اور شلواریوں کے رنگ ملانے چل پڑیں۔ بس کوئی لمحہ تنبہائی کا نہ ملے، ہر وقت دوسراہٹ کی ضرورت، ہر وقت بولنے کی عادت۔

یہ عادت بھی عجیب چیز ہے، ایک دفعہ چمٹ جائے تو مشکل سے چھوٹی ہے، خاص طور پر بری عادت۔ چھٹی بھی اس طرح ہے کہ پچھتا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پان سگریٹ کی عادت کو لے لیں، چھٹائے نہیں چھوٹی۔ ایسا لگتا ہے، لوگوں سے ملنے جلنے اور گپ شپ لگانے کے

ڈانڈے کہیں نہ کہیں بڑی عادتوں سے ملتے ہیں۔ جیسی تو یہ بھلانے نہیں بھول رہی تھیں۔ رو رو کر یاد آتیں۔

زبان یار من تر کی

ہمیں بلانے والے لندن میں کم تھے۔ جو تھے وہ اللہ میاں کے پچھواڑے رہتے۔ کوئی دس میل دور جنوب میں، کوئی سات میل شمال میں۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے ملنے جانا ممکن ہی نہ تھا۔ دعائیں مانگتے کہ کوئی آجائے اور کچھ نہیں تو دروازے کی گھنٹی بج اٹھے۔ یہاں تو دودھ والا بھی بغیر

دروازہ کھٹکھٹائے، چپکے سے دودھ کی بوتلیں رکھ کر کھسک جاتا ورنہ اسی کورہک لیتے۔ اس کے بیوی بچوں کی خیر خیریت پوچھتے۔ ڈاکیے کا حال اس سے بھی برا تھا، خط وود ٹھلی منزل پر بنے لیٹر بکس میں ڈال کر چلتا جتا۔ شکل سے بھی آشنائی نہ تھی۔ دودھ والا مہینے



کے بعد کم از کم مہینے تو لینے آ جاتا۔ رو گئے ہمسائے تو وہ اکثر عرب تھے۔ گونگوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے، عربی لہجے میں گھونٹ کر التیام تلیم کہہ لیتے اور بات فٹم۔ زبان یار من تر کی ہو تو کوئی بات کیسے کرے؟ ایک روز بڑے بیٹے، جاوید کو بخار آ گیا۔ ڈاکٹر نے ہر دو گھنٹے بعد دو گولی اسپرو کھانے کا مشورہ دیا۔ ساتھ میں یہ بھی کہا اگر کل تک بخار نہ اترا تو فون کر دیجیے گا۔ شام سے پہلے ہی حالت سراسی ہوگئی۔ ڈاکٹر کو پھر فون کیا، وہ

معاشرے میں اوجہ کے سچ کی بہت
ہمارے اہمیت ہو چکی۔ نیز ہم خود کو تکلیف
سے نہیں گزارتے کہ پورا سچ معلوم کر
سکیں۔ مثال کے طور پر جو کسی امریکی دیورنی میڈیا نے
چھپلی کے فوائد بتانا شروع کیے، ہم نے بھی دکانوں کا
روح کر لیا۔ دل کے مریضوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ چھپلی

دل کے لیے بہترین غذا ہے۔ اب بھلا کون اسے دماغ
کو غلط کرتا پھرے کہ سائنس دانوں نے جس چھپلی کی
تعریف کی ہے کیا یہ وہی ہے؟ اور جس طریقے سے
پکانے کا کہا ہے، کیا یہ اسی طرح پکانی گئی؟
چھپلی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اومیگا ۳ کا ذکر

ذہن میں مچلتا اہم سوال

چھپلی کون سی بہتر ہے؟

غذا سے وابستہ معاشرے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کی حقیقت افشا ہوگی

ڈاکٹر سلطان محمود



اردو ڈائجسٹ 201
جنوری 2015ء

گی؟ چلو ہم نوپے کی بیماری میں گم تھے، باقی لوگوں کو کیا
ہوا، دیار غیر کی عیدیں اس طرح ہوتی ہیں؟ یا یہ غیر اسلامی
ملک میں رہنے کا شائبہ ہے۔ اپنے کھو جانے کا خوف
ہوا۔ اپنی پہچان منٹ جانے کا ڈر لگا۔ پھر سوال اٹھا، ہم
ہیں کون؟ اس زمین میں ہمارا کیا مقام ہے؟ کیا
انفرادیت اور پہچان ہے؟

ابھی تک زندگی پر تنقیدی نگاہ ہم نے ڈالی ہی نہ تھی۔
اب خیال آیا، یہ عیدیں ہم کیوں مناتے ہیں؟ حقیقتے اور
آئین کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ صرف
ہماری تہذیب و ثقافت ہے اور بس؟ تو پھر یہ دل کیوں
ڈوب رہا ہے؟ شعور کس چیز کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا
ہے؟ اس طرح کے بے شمار فلسفیانہ خیالات دماغ میں آ
رہے تھے۔ ابھی تک خیال تھا کہ ایسی باتیں انسانی
کرداروں کے لیے گھڑی جاتی ہیں، زندہ انسانوں کا ان
سے کیا تعلق؟ اب یہ بھی ایک حقیقت ہماری نیندیں
لڑانے کو ہمارے سامنے کھڑی تھیں۔ فیصلہ کل پر ناں کر
ہم پھر بستر پر دراز ہو گئے۔ عید تو گزری چکی تھی!

بٹنے بعد پاکستان سے خدا آیا: "اے ہے آپ نے تو
عید پر کارڈ تک نہ ڈالا، ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔ لندن کے
عیش میں گم ہی ہو گئیں، ایسی بھی کیا بے اعتنائی؟ امید
ہے عید اچھی گزری ہوگی۔ ہم نے تو آپ کے بغیر تنہا تنہا،
پوری عید گزار لی۔"

انہیں کیا معلوم لندن میں ایک خاندان کے لو افراد،
مع ڈیڑھ سو رشتے داروں اور پارہ کروڑ مسلمانوں کے عید
قربان تنہا گزار رہے تھے۔ اس بے لطف آپ جی کا اگلا
حصہ شمارہ فروری میں ملاحظہ فرمائیے۔



آدھے گھنٹے میں پہنچ گئے۔ بیٹے کو دیکھتے ہی ایسبولینس کو
فون کر دیا۔ دس منٹ میں پول پاں کرتی ایسبولینس آگئی
اور بیٹا ہسپتال پہنچ گیا۔ اسے گل پھڑے ہو گئے تھے۔
دنیا بھول کر پورا ہفتہ ہسپتال کے چکر لگتے رہے۔
ہسپتال لندن کے دوسرے سرے پر تھا۔ ہم یوسٹن میں
اور ہسپتال فونینگ میں تھا۔ ریل سے جانے میں
پینتالیس منٹ لگتے۔ دوسرے بچوں کو اسکول سے لینا،
چھوڑنا، کھانا پکانا اور بازاروں کے چکر بھی ساتھ تھے۔
مصدقیت نے چکر کر رکھ دیا۔ جس دن بچہ گھر آیا، تنہا ہارا
خاندان سرشام بستر میں گھس گیا اور چند منٹوں میں
نیند کی آغوش میں جا پڑا۔

دیار غیر کی عید

مسلسل بچتے فون کی کھنٹی نے نیند سے بیدار کیا۔
بڑی مشکل سے بیلو کی آواز نکلی۔ ادھر سے آواز آئی "عید
مبارک۔"

ادھر سے بھی "عید مبارک" کہا گیا لیکن نیند اور
حیرت میں ڈوبا ہوا پوچھا "کون سی عید؟"

"بھئی آج عید تریبان تھی، آپ کو نہیں پتا؟"
ہمیں بالکل پتا نہیں چلا۔ بیٹا بیمار تھا اسی کے چکر
میں رہے۔ بات سچی تھی، بہانہ نہ تھا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی،
ساڑھے دس بجے تھے۔ سوئے ہوئے گھنٹہ بھرتی ہوا ہو
گا۔ ان حضرات کا شکر یہ ادا کیا اور حال احوال پوچھ کر فون
بند کر دیا۔ طبیعت متدردی ہو گئی۔

حد ہو گئی، ہمارا اتنا بڑا تہوار گزر گیا اور پتا ہی نہیں
چلا۔ یہاں عیدیں اس طرح ہوتی ہیں؟ نہ بکرے بھڑیں
آئیں، نہ گائیوں میں حصے پڑے، نہ کوئی بچت ہوئی نہ
مبادتہ۔ کیا ہماری عیدیں اس طرح و بے پاؤں گزریں

اردو ڈائجسٹ 200
جنوری 2015ء

ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس طرز کی چکنائی دل کی شریانوں میں آٹھڑے نہیں پنے دیتی اور خون پتلا رکھتی ہے۔ پہلے سے بے لوتھڑے یا تھکے نرم کر کے توڑ دینی ہے۔ ہر مہینے محض دو بار پھلنی کھانے سے اچانک ہارٹ فیل ہونے کے امکانات ۵۰ فیصد کم ہو جاتے ہیں۔ دل کے علاوہ اومیگا تھری، دماغ، آنکھوں، جلد اور معدے و آنتوں کے لیے بھی نعمت ہے۔ یہ چکنائی خون میں کولیسٹرول کم کرتی، ذیابیطس قسم ۲ کو روکتی اور زندگی کا صحت مند دورانیہ لمبا کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام باتیں درست ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے غور کیا، ذکر تو پھلنی کا ہو رہا ہوتا ہے مگر ترغیب اومیگا تھری ۵۰۰ ملی گرام روزانہ لینے کی دلی جارہی ہے؟ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ چکنائی صرف سائمن، کاڈ، سارڈین جیسی سمندری مچھلیوں کی چربی میں ملتی ہے۔ اب جو نہیں ہم ان خصوصی مچھلیوں کی طرف نگاہ دوڑائیں تو پتا چلتا ہے، یہ تو پاکستان میں دستیاب ہی نہیں۔ اب کیا کریں؟ پس وہی کریں جو مغربی ملٹی نیشنل کمپنیاں چاہتی ہیں یعنی کے ان کے بنائے ہوئے فوڈ سٹیٹ منٹ استعمال کریں جن میں مندرجہ بالا مچھلیوں کا تیل بھرا ہے۔ کھودا پہاڑ اٹکا چوبہ۔ صحت کی خوبصورت داستان کا انجام دکانداری پر ہوتا ہے۔

اور ہم ہیں کہ بازار میں گھسیا ترین گھی یا استعمال شدہ تیل میں تلی گئی نہ تو سمندری نہ دریائی بلکہ صرف فاری مچھلیاں کھا کر جیب ہلکی کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں اومیگا ۳ چکنائی حاصل ہوگئی۔

قارئین کرام ذہن میں رکھیے، جتنے مہرے سمندر کی مچھلی ہو، اتنی ہی اس میں چربی زیادہ ملے گی۔ یہی چربی اومیگا تھری کی حامل ہے۔ سمندر کی بالائی اور

درمیانی سطح میں پانی جاتے والی مچھلیوں میں چربی کم ہوتی ہے۔ لہذا اومیگا تھری بھی کم! نیز ان میں پارہ (مرکری) اور سیسہ (لیڈ) بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لہذا بیماریاں بھی زیادہ۔ اگر سمندری مچھلی نہیں مل رہی، تو دریائی ہی سہی، یہ سب سے بہترین ہے۔ تازہ پانی کے باعث اس میں آلائش بھی کم ہوتی ہے اور غذائیت سمندری مچھلی جیسی۔ صرف اومیگا تھری نہیں ہوتا مگر باقی خوبیاں موجود ہیں مثلاً اعلیٰ درجہ کی پروٹین! معیار کے لحاظ سے سب سے کم تر فاری مچھلی ہے۔

کیا اچار مفید ہے؟

برصغیر پاک و ہند کے علاوہ دنیا بھر میں صدیوں سے اچار دسترخوان کی ذمیت بن رہا ہے۔ اچار بنانے کے کئی طریقوں میں زیادہ مستعمل تیل میں کچی سبزیوں کا ڈالنا، پانی میں مسالہ جات، لاکر سبزیوں کو پھل مانا یا سرکہ کے اندر پھول گونجی، پیاز یا لہسن وغیرہ کا اچار بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ تینوں طرح کے اچار میں ہم جو بھی سبزی و پھل، ڈالیس، ان کے غذائی اجزا کسی حد تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کا انحصار تین باتوں پر ہوتا ہے: اول اچار ڈالنے کے لیے کس طرح کا مائع (تیل، پانی، سرکہ) استعمال کیا گیا۔ دوم اس میں سبزیوں وغیرہ کتنے عرصے تک ڈوبی رہیں اور سوم اچار میں کھٹاس ڈالی گئی یا مٹھاس؟

جہاں تک مٹھاس کی قسم کا تعلق ہے، تو پانی میں سبزیوں اور پھلوں کے وٹامن سی اور بی اس میں تحلیل جاتے ہیں۔ تیل میں سبزیوں سے وٹامن اے، ڈی، ای اور کے نکل کر اس میں جذب ہوتے ہیں۔ سرکہ میں موجود تیزاب سبزیوں اور پھلوں میں موجود پروٹین اور معدنیات کی توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ لہذا اچار کی مدت

جتنی زیادہ ہو، تمام غذائی اجزا کا نقصان بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

بالفاظ دیگر کچی سبزیوں اور پھلوں میں وٹامن، معدنیات اور لحمیات کی مقدار کسی صورت اچار میں برقرار نہیں رہ سکتی۔ مندر بالا غذائی اجزا کے علاوہ حرارے (توانائی) بھی خاصی مقدار میں ضائع ہوتے ہیں۔ پس ہم اچار کی شکل میں جو کچھ کھا رہے ہیں، وہ صرف ذائقہ دینا ہے غذائیت نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مسالہ جات کے زائد استعمال سے بلڈ پریشر زیادہ ہو جائے۔ یا پھر بیٹھے اچار (مثلاً پھلوں وغیرہ) سے ذیابیطس چھٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔

اچار کا ایک فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں پھل و سبزیوں چھلکوں سمیت ڈالی جاتی ہیں۔ لہذا معدنیات و وٹامن کا خزانہ عموماً کچی سبزیوں سے زیادہ ہوتا ہے بشرطیکہ اچار زیادہ پرانا نہ ہو۔ چونکہ سبزیوں، پھلوں پر سپرے کا اثر بھی چھلکے پر زیادہ ہوتا ہے لہذا اچار کے مانتات وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اثر زائل کر دینے ہیں۔ ذہن میں رکھیے کہ مرے اور چٹنیاں وغیرہ بھی اچار ہی کا حصہ ہیں۔

کیا مٹھی کی ہنڈیا پریشنگلر سے بہتر ہے؟

غذا کے اندر غذائیت (Nutrition) شکل پر ڈیٹن، چکنائی، نشاستہ، وٹامن، معدنیات اور پانی موجود ہوتی ہے۔ کھانا پکانے کے دوران یہ غذائیت ضائع ہونے کا انحصار ہتھے عوامل پر ہے: بلند درجہ حرارت، طویل عرصے تک حرارت دینا، روشنی، ہوا، پانی میں بھگوننا اور کھیت یا میں پکنے کے دوران کا وقت۔ بعض غذاؤں پر سارے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔

پریشنگلر استعمال کرنے کا مقصد وقت بچانا ہے۔ اس لیے بلند درجہ حرارت میں کھانا پکایا جاتا ہے۔ مٹی کی ہنڈیا کے پیچھے مقصد کھانے کا ذائقہ بہتر بنانا ہے۔ لہذا کم درجہ حرارت پر دیر تک کھانا پکایا جاتا ہے۔ لیکن سوال اگر غذائیت بچانا ہے، تو دونوں طریقے غلط ہیں کیونکہ تیز درجہ حرارت اور براہ راست غذا کا پریشنگلر کی وحالتی دیوار سے اتصال غذائی اجزا کی تباہی کا باعث بنتا ہے جن میں پروٹین خصوصاً لائسین (Lysine) شامل ہے۔ کم درجہ حرارت مگر مسلسل ملنے سے بھی غذائی اجزا کا اسی طرح نقصان ہوتا ہے جیسا پریشنگلر میں۔ ہاں ہنڈیا سے ذائقے میں انفرادیت ملتی ہے جو پریشنگلر سے لینی ذرا مشکل ہے۔

قارئین کو شاید عجیب لگے مگر حقیقت یہ ہے، اگر سبز کو ڈیڑھ گھنٹے تک ۶۶ ڈگری سینٹی گریڈ تک پکایا جائے، تو ۲۰ فیصد لائسین ضائع ہوتی ہے۔ مگر اسی درجہ حرارت پر ڈھائی گھنٹے پکانے سے چالیس فیصد ضائع ہو جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے، لائسین جیسے امانو ایسڈ اور دیگر وٹامن طویل عرصہ کم درجہ حرارت پر پکانے سے تقریباً تمام ضائع ہو سکتے ہیں۔

ہنڈیا پر آہستہ کھانا پکنے کا تیب ہی فائدہ ہے کہ اس پر ڈھکن رکھا جائے۔ دراصل کئی غذائی اجزا کم درجہ حرارت پر غذا سے جدا تو ہو جاتے ہیں مگر ڈھکن موجود ہونے کے باعث شور بے (یا پانی) میں ہی موجود رہتے ہیں۔ پس غذائیت کے حوالے سے دیکھا جائے، تو ہنڈیا اور گلر میں خاص فرق نہیں۔ ہاں ذائقے کے لحاظ سے ہنڈیا تدرے بہتر ہے۔ لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جو ہنڈیا کے ذائقے سے واقف ہوں!



روشنیوں کے جلو میں بلند ہوتی

اندرھیرے کی لکیر

ایک لاپچی و خود غرض نوجوان کی کتھا اس نے دنیا پانے کے لیے کسی کا معصوم دل توڑ دیا

سلطان جمیل نسیم

اجازت لینے آگے بڑھا، تو اس نے میرا ہاتھ میں دبا کر مجھے ایک لفظ کہنے کا موقع دیے بغیر اپنے قریب روکا اور دوسرے مہمانوں سے مصافحے کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میری زندگی میں اتنی کمنل اور ایسی حسین شام پہلی مرتبہ آئی تھی۔ حسن اور زندگی، رنگ اور نور، نغمہ اور آہنگ، ان سب کا امتزاج تھی وہ شام! گلرنگ و گلبہار چہرے،



دلوں کو شادابی اور تازگی جس سے میسر ہو رہا تھا، وہ شام کیا تھی یوں سمجھ لیجئے کہ ایک مربع غزل تھی۔ ایک جلتی اور پیر کی شام ایسی تابندگی اور صباحت کی ردا اڑھا دینے کا سہرا میرے دوست کے سر تھا۔

لوگ ایک ایک کر کے چاتے رہے۔ رنگ بکھرتے مجھے، مسکرائیں کم ہوتی گئیں۔ رات کے سائے پھیلتے گئے۔ روشنی سنثتی رہی۔ سکوت ترنم پر حاوی ہوتا رہا۔ میں گھبرا گیا۔ میں اس خوبصورت شام کا ایسا انجام دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنے دوست سے کہا ”میرے پاس وہ لفظ نہیں جن سے میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ تم نے میرے تصور کی ایک جیتی جاگتی تصویر مجھے دکھا دی۔ میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں کہ تم ترقی کی اور منزلیں طے کرو تاکہ میں کچھ اور ان دیکھی حقیقتوں سے آشنا

والی... خود کشی بھی تو آج کل فیشن میں داخل ہو گئی ہے

”آں...“ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلے رہ گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا ”ہاں میں۔“ میں سنبھل کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ چند لمحوں سے ملتا رہا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بینک نیچر صاحب۔ اب آپ اپنی کہانی سنا دیجیے۔“

”مجھ پر طنز نہ کرو۔“ اس نے بہت ہی گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس ملازمت کی خاطر میں نے اپنی زندگی کی بھرپور مسرتیں اور دائمی خوشیاں ترک کی ہیں۔“ ”یوں کہو کہ خوشیوں کو تم نے اپنی زندگی کے لہجے میں سے ڈھپٹ کر دیا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اگر تم اسی قسم کی فضول گفتگو کرتے کے موڈ میں ہوتو جہنم میں جاؤ۔ میں کچھ نہیں سنا تا۔“ اس کو یوں ناراض کر دینے سے مجھے کچھ خوشی سی ہوئی۔ لیکن میں شہلا کی خود کشی کا پس منظر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کو متایا اور کہانی سنانے پر رضامند کر لیا۔

”وہ بولنے لگا ”تم جانتے ہو کہ میں نے تنگ مزاج اور زود حس ہونے کے باعث والد کی ذرا سی سرزنش پر ایم۔ اے کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ پھر ملازمت ڈھونڈنا رہا۔ آخر مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ شروع میں تو بینک والوں نے مجھے چھوٹے قصبوں میں بھیجا جہاں ان کی شاخیں تھیں۔ ان چھوٹی جگہوں میں نہ تو شہر کی سی سہولتیں تھیں اور نہ دیہات کی سی خوبیاں۔ دو چار ہزار کی آبادی میں مطلب کے آڑی تلاش کرنے کے باوجود نہ

مگر میرے دوست نے مجھے آگے کچھ کہنے سے روک دیا، بولا ”لفظوں سے نہ کھیلو۔ تم دوسرے لوگوں سے مختلف ہو۔ میرے درد کو سمجھو۔“ اس نے جس طرح یہ جملہ نظیر ٹھہر کر ادا کیا، میں اس سے متاثر ہونے کے بجائے ہنس دیا۔

”ہنسومت، میں تمہیں ابھی اپنی کہانی سناؤں گا، تو پھر تم مسکرا بھی نہ سکو گے۔“

اس شام کی گدگداہٹ سے ابھی تک میرے ہونٹوں پر ہنس کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں فی الحال کوئی ایسی بات نہیں سنا چاہتا تھا جسے سن کر مسکرا بھی نہ سکوں۔ چنانچہ دوست کے اس جملے کو بھی تسنیر کے انداز میں اڑا دیا۔ کہا ”تم ایک بینک نیچر ہو۔ اگر کوئی فراڈ وغیرہ ہو گیا ہے تو خود ہی ایک جاسوسی ناول لکھ ڈالو، تمہارے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔“

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ آخری مہمان کو بھی رخصت کرنے کے بعد وہ مجھے سچے سچائے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھ گیا۔ اور بولا ”تم شہلا کو جانتے ہو؟“

”شہلا۔“

”ہاں۔ وہی جو۔۔۔۔۔“

”سمجھ گیا۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔ سینٹہ فرقان علی کی بیٹی جو کالج میں اپنی جہاز جیسی بڑی کار لیے آیا کرتی تھی۔ اس سے تمہارا ماہا کا چھکا رومان بھی چل رہا تھا۔“

”ہاں وہی۔“

”کیا ہوا اس کو۔“

”اس نے خود کشی کی کوشش کی تھی مگر بچ گئی۔“

”بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ ہر نیا فیشن اپنانے

ملتے۔ چھوٹے چھوٹے دکانداروں کے ساتھ واسطہ پڑنا۔
 ”تم شہلا کی خودکشی سے متعلق بتاؤ۔“
 اس نے مجھے جھڑک دیا۔ ”خاموشی کے ساتھ جو کچھ
 میں کہتا ہوں، سنتے رہو۔“

میں پیپ ہو گیا۔ وہ کہنے لگا ”صبح سے شام تک میں
 بینک میں رہتا۔ شام کو تفریح کے لیے جانے کے بجائے
 تنگ بازاروں میں گھومتا۔ دکانداروں سے ملتا اور انہیں
 بینکاری کے متعلق بتاتا۔ رات کو کچھ دیر کتاب کے اوراق
 پر نظریں گھمانے کے بعد سو جاتا۔ اتوار کو قریب کے
 دیہات میں جاتا، وہاں کے زمینداروں سے ملتا اور زمین
 میں گڑی دولت بینک میں جمع کرنے کا مشورہ دیتا۔ یہ تمام

تہہ لیلیاں مجھ میں بڑے غیر محسوس
 طریقے سے پیدا ہوتی رہیں۔

”شروع میں تو میں چھوٹے
 قصوں میں جانے کے خیال سے
 بدکتا تھا۔ تبادلے کے لیے
 کوششیں کرتا مگر پھر کسی جہاں

دیدہ پاس کے سمجھانے سے مان بھی جاتا۔ اس ملازمت
 نے مجھ سے میرا پندار، میری خودسری اور انا چھین لی اور
 اس طرح کہ مجھے محسوس بھی نہیں ہوا۔ میں چھوٹے
 چھوٹے دکانداروں سے باتیں، اکاؤنٹ کھلوانے کے
 لیے ان کی خوشامد کرنے اور چالوسی برتنے میں کوئی عار
 شرم اور کسی قسم کی چنگاپاہٹ محسوس نہ کرتا۔ بس ایک دھن
 تھی، لیکن تھی کہ میں جہاں جاؤں، میرا بینک کامیاب
 رہے۔ لوگوں کو بینک کی اتادیت معلوم ہو سکے۔

”رفتہ رفتہ مجھے اپنی ہر چھوٹی بڑی کامیابی پر یہ محسوس
 ہونے لگا جیسے بینک کی ملازمت ہی میرا نصب العین تھی۔
 جیسے میں پیدا ہی اس کے لیے ہوا تھا۔ پانچ چھ برس تک

میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی جگہوں پر رہا۔ اس کے بعد مجھے
 اپنے شہر میں تبدیل کر دیا گیا۔“

جب وہ کہتے کہتے ذرا رکا تو میں نے آہستہ سے کہا۔
 ”ان باتوں کا تعلق شہلا کی خودکشی سے کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تفصیل میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم
 جب کہانی لکھتے بیٹھو تو نفسیاتی نقطہ نظر سے کوئی بات
 سمجھنے میں لگھن سے دو چار نہ ہو۔ ہاں تو میرا تبادلہ
 اپنے شہر میں ہو گیا۔ اب بینک کی طرف سے مجھے
 یہاں زیادہ سہولتیں بلکہ آسائشیں میسر ہوئیں۔ میں
 بینک کا ڈپازٹ بڑھانے کی طرف توجہ سے لگ گیا۔
 جب مجھے معلوم ہوا کہ سینئر فرائڈز علی ایک نئی مل قائم کر

رہے ہیں، تو بہ حیثیت بینکر ان
 سے ملا۔ وہیں شہلا سے عرصے
 بعد ملاقات ہوئی۔ وہ بالکل ویسی
 ہی تھی، وہی لیلیاں شب کو نکلت
 دیتے ہوئے گیسو ستاروں کی سی
 چمک لیے ہوئے آنکھیں اور

پیشانی پر اترا ہوا چاند۔ میں طویل عرصے بعد ملا تھا۔
 بہت کچھ بدل گیا تھا مگر وہ وہی تھی اور اسے یاد بھی
 سب کچھ تھا۔ میں جب اس سے ملا تو میں نے بڑے
 اجنبی انداز میں اس سے پوچھا:

”آپ..... آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں؟“
 اس نے پرانے انداز میں سر جھٹک کر بالوں کو ایک
 طرف کیا۔ اسی دُغریب اور سن موہ لینے والے طریقے
 سے ہونٹوں کے گوشوں میں مسکرائی اور اپنائیت سے
 بھرپور لہجے میں کہا ”تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔
 آج ملے ہو تو غیروں کی طرح مخاطب ہو رہے ہو۔“
 میں نے جو جواب دیا، اس سے میں خود بھی مطمئن

نہیں تھا، مگر شہلا مجھ سے مل کر ہی خوش ہو گئی۔ اس نے
 بیٹے دنوں کی راکھ کرید کر پرانی یادوں کے انگاروں کو اپنے
 التفات سے ہوا دی۔ پھر یوں سمجھ لو ان انگاروں میں میری
 شخصیت کا وہ خول بدل گیا جو میں نے پانچ چھ سال کے
 عرصے میں اپنی زلت پر منقذہ لیا تھا۔ اب میں وہاں جاتا
 تو صرف شہلا سے ملنے کے لیے! فون کرتا تو صرف شہلا
 کو! سارا دن سوچتا اور میری سوچ کا محور ہوتی تھی شہلا۔
 میں راتوں کو عجیب سے سہانے سہانے خواب دیکھتا اور ان
 خوابوں کا مرکز ہوتی تھی شہلا۔

محبت کی یہ دھوپ اتنی پھیلی کہ مجھے اپنے فرائض کا
 سایہ تو درکنار خود اپنا نظر آنا مشکل ہو گیا۔ شہلا.....
 شہلا..... ہر وقت..... ہر لمحہ اس کا خیال رہتا۔ اس کی آواز
 کا چادر مجھ پر چھایا رہتا۔ آخر ایک دن میں نے طے کر لیا
 کہ اب شادی کر لینی چاہیے۔ شہلا نے مجھے مشورہ دیا ”تم
 ڈیڈی سے بات کر لو۔“

میں سینئر فرائڈز علی سے ملا۔ بڑی خندہ پیشانی سے
 پیش آئے۔ میں نے دے لفظوں میں اپنی تمنا کا اظہار
 کیا۔ بولے ”تم کرتے کیا ہو۔“

”جی بینک منیجر ہوں۔“
 ”کون سے بینک میں؟“
 میں نے بینک کا نام بتا دیا
 پھر پوچھا ”کیا تنخواہ ہے؟“
 ”جی پچاس ہزار روپے۔“
 ”گاڑی تمہاری ہے؟“
 ”جی نہیں، بینک کی ہے۔“
 ”رہتے کہاں ہو؟“
 میں نے علاقے کا نام بتا دیا۔
 پھر کہنے لگے ”بلکہ تمہارا ہے؟“

”جی نہیں، بینک نے کرائے پر لے کے دیا ہے۔“
 انہوں نے پھر بہت ہی شفقت آمیز انداز میں
 پوچھا ”تمہارا بینک بیلنس کتنا ہے؟“
 میں نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ انہوں نے
 آہستہ سے ہوں ”ہوں“ کہا جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں
 اور پھر مجھ سے کہا۔ ”بس اس معاملے میں شہلا سے بات
 کیے بغیر تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“

پہلے میں نے سوچا کہ انہیں اس حقیقت سے بھی
 روشناس کرادوں کہ شہلا ہی کے ایما سے میں یہاں آیا
 ہوں۔ ہم دونوں میں وہی رشتہ ہے جو بچوں اور ڈالی،
 دریا اور کنارے، بادل اور ہوا میں ہوتا ہے۔ ہم دونوں
 آپس میں دلوں، دماغوں، آنکھوں اور زبان کا تبادلہ کر
 چکے۔ جو کچھ انہیں شہلا سے معلوم کرنا ہے وہ مجھ سے
 پوچھ لیں۔ جو کچھ وہ میرے متعلق جانتا چاہتے ہیں شہلا
 سے دریافت کریں۔ مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اچھا
 ہے، سینئر صاحب یوں بھی اپنا اطمینان کر لیں۔ دوسرے
 دن شہلا نے مجھے فون کیا اور فوراً ملنے کو کہا۔ جب میں
 اس سے ملا تو اس نے کہا:

”میں رات بھر ڈیڈی سے الجھتی رہی ہوں۔“
 ”کیوں؟“
 ”وہ اس شادی کے مخالف ہیں۔ کہتے ہیں کہ
 تمہارے پاس نہ اپنا بلکہ ہے نہ سوا اور نہ دولت۔“
 ”وہ سچ کہتے ہیں۔“
 ”مگر تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جو میں چاہتی
 ہوں۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر انہوں نے
 اپنی ضد کو میری راہ کی رکاوٹ بنایا تو میں خودکشی کر لوں
 گی.....“
 ”بے خوف نہ ہو۔ جذبات سب کچھ نہیں ہوتے۔“

Urdu Digest.pk



Give a missed call on
0300-4005579
To order your copy

Available on



Stay connected with us www.urdudigest.pk



MOST SHARED ON FACEBOOK

Jo Shukhs jitna achu hotu hai	1306
Nice quote	786
Shareef insan ki tareef	776
Rishto ki rasi	718
Jo Shukhs dunia ko	693



MOST LIKED ON FACEBOOK

Jo Shukhs jitna achu hotu hai	3622
Binur ki ayindat	2587
Agar tum Allah sy duro gy	2266
Dest hazar b km hen	2233
Jo apni tareef krta ha	2014

4,85,582 LIKES ON FACEBOOK

facebook.com/urdudigest.pk
edigest.urdudigest.pk
www.urdudigest.pk



MOST READ ONLINE STORIES

high-blood-pressure-2	1758
bacha-jis-naamny-say-inkar	1702
zinda-naa-ki-kaber	1667
interview-gen-ahsan-ul-haq	1626
bahu-ho-to-afis	1322



READ IN 104 COUNTRIES

Device Category
Desktop 46% Mobile 40%
Tablet 14%



TOP 10 COUNTRIES

1-Pakistan	6-United States
2-India	7-Ireland
3-Saudi Arabia	8-Canada
4-United Kingdom	9-Spain
5-U.A.E	10-Indonesia

**Join Us and Read More Funny
and Interesting Stories, Poetry,
Quotations etc.**

جنوری 2015ء

اردو ڈائجسٹ

جنوری 2015ء

اردو ڈائجسٹ 208

یوں میں نے شہلا کے دل و دماغ میں اٹھنے والے طوفان کا رخ پلٹ دیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنی ضد کو ایسی آندھی بنا دے جس کے سامنے اس کے ڈیڑھی کی ہٹ دھرمی کا دیا گل ہو جائے۔ پھر ہم دونوں جو زندگی گزاریں گے اس پر پریشانیوں اور پشیمانیوں کا سایہ تک نہیں ہوگا۔ شہلا میری بات مان گئی۔

اس رات اپنے دل میں عجیب سے دوسے لیے، دماغ میں طرح طرح کے خیالات بسائے دیر تک زرد چاندنی اور ستاروں کی سرینیس روشنی میں جاگتا رہا۔ زندگی کے وہ لمحے میری نظروں کے سامنے آتے رہے جو میرے لیے ان دیکھے تھے۔ کبھی میں سوچتا، شہلا میرے لیے نہیں اپنے اسی گزن کے لیے موتوں ہے جس کا باپ گمراہوں روپے کی جاندار چھوڑ گیا ہے۔

کبھی خیال آتا کہ میں بھی کتنا مادہ پرست اور انسانی عظمتوں سے کتنا منحرف ہو گیا ہوں۔ ہر بات کو دولت کے پیمانے پر ناپ رہا ہوں۔ دلوں اور محبتوں کی قیمت میری نظر میں اپنی وقعت کیوں کھو چکی؟ محبت، انسان اور دل اس وقت بھی تھے جب دولت نہیں تھی۔ دل محبت اور انسان اس وقت تک رہیں گے جب دولت نہیں ہوگی پھر میں یہ کیسی کشمکش میں مبتلا ہوں؟ ذرا سی رکاوٹوں، اندیشوں اور پریشانیوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں... کیوں؟

سوالوں کے کھنڈر تھے... اور میرا دل تھا۔ اندیشوں کی پابند تھی... اور میرا دماغ تھا۔ دوسروں کی دلیل تھی... اور میرا وجود تھا۔ صبح ہوئی مگر رات کا آسیب میرے وجود کو چھوڑ گیا۔ میں بڑے بوجھل قدموں سے ٹیلی فون کے قریب آیا۔ جب میں نے فون کیا تو معلوم ہوا شہلا نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اس عالم میں اسے

زندگی بڑی شے ہے۔ تمہارے ڈیڑھی نے اس دنیا کے بہت سارے رنگ دیکھے ہیں۔ انہیں جو رنگ پسند ہے اسی میں وہ تمہیں بھی رنگا دیکھنا چاہتے ہیں اور...“

شہلا نے میری بات کاٹ کر کہا ”تم مجھے شہینہ مست کرو۔ ڈیڑھی کو زندگی کا جو رنگ پسند ہے، ضروری نہیں کہ وہ میری آنکھیں بھی قبول کر لیں۔“

اور پھر میں اور شہلا تمام دن دنیاہ رنگوں، آنکھوں اور دلوں کی باتیں کرتے رہے۔ مگر وہ شام ایک مجلس عاشق کی طرح بڑی اداس تھی۔ اس شام کی اداسی ہمارے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس کی اداسی کا سانس لینا ایک حصہ بن گئے۔ شہلا نے تجویز پیش کی۔ ”کیوں نہ ہم کورٹ میرج کر لیں۔“

شہلا سے یہ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اب تک خود کو فریب دیتا رہا ہوں۔ یہ احساس اس لیے پیدا ہوا کہ جب کورٹ میرج کی بات سنی تو میں نے شہلا کے انداز فکر سے الگ ہٹ کر سوچا اور بہت سارے گوشوں کی طرف دیکھا۔

مگر شہلا کے دماغ میں تو جذبات کا چاند جگمگا رہا تھا۔ وہ تمام رکاوٹیں، سارے رشتے اور بندھن توڑ کر میری بن جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا، دلاس دیا، اپنی محبت کا بیٹھن دلا یا مگر وہ اپنی بات پر لڑی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا ”تم گھبراتے کیوں ہو؟“

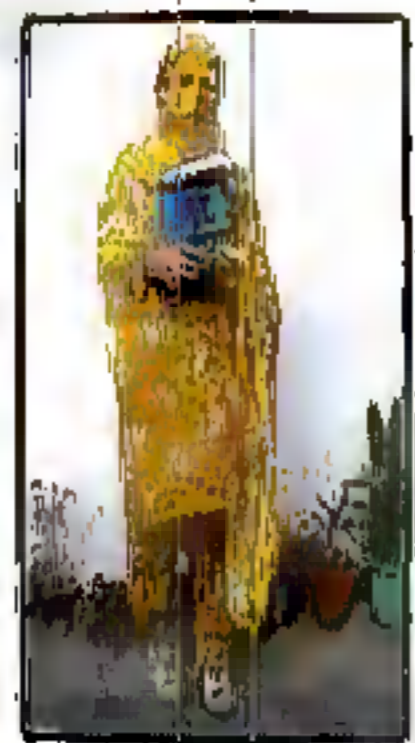
”سنو شہلا میں گھبراتا نہیں... بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ اگر ہم نے وقت اور حالات کی مخالفت کر کے اپنی سن مانی کر ڈالی تو کہیں یہ ہمارے مخالف نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو حالات ہمیں روند ڈالیں گے اور وقت ہمیں گرد کے مانند اڑا دے گا۔“ لیکن وہ بضد تھی۔ پھر میں نے کہا ”جیسی ضد تم مجھ سے کر رہی ہو، اسی طرح اپنی بات ڈیڑھی سے کیوں نہیں منواتی؟“



آپ کے تعاون نے یہ دلی ہے ان کی زندگیاں



مہاراشٹر، انڈیا کی ایک خاتون کی تصویر



انڈیا کی ایک خاتون کی تصویر



انڈیا کی ایک خاتون کی تصویر



انڈیا کی ایک خاتون کی تصویر



انڈیا کی ایک خاتون کی تصویر



انڈیا کی ایک خاتون کی تصویر

0240 0100882859 اکاؤنٹ نمبر
 0110 002 000424 0003 اکاؤنٹ نمبر
 0247 002 000827 0003 اکاؤنٹ نمبر

042-37552576 فون: 042-37622741-42 فون: 0321-8461122، 0333-8461122، 0345-8481122
 info@kf.com.pk فیکس: 0321-8461122

USA Address: 'Karwan-e-ilm Foundation' 19-West 34th Street 1024, New York, NY 1001.
 Pk (+212) 268-3500/3501, Fax (+212) 268-3502

اردو ڈائجسٹ
 جولائی 2015ء

کاروانِ علم فاؤنڈیشن
 2004ء



ملک و قوم کی خدمت کے دس سال

الحمد للہ

4,359

کم وسیلہ مگر باصلاحیت طلبا و طالبات کو

ساڑھے آٹھ کروڑ روپے

سے زائد کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں۔

اب یہ طلبا و طالبات برسر روزگار ہو کر اپنے خاندانوں کو غربت اور جہالت سے نکال رہے ہیں۔

682

مزید کم وسیلہ باصلاحیت طلبا و طالبات کی اور خوشحال خاندانوں کے لئے محدود ذمہ داریوں میں زبردستی

14	ایس اے	10	ایس اے	120	ایس اے	31	ایس اے	184	ایس اے
03	ایس اے	03	ایس اے	07	ایس اے	08	ایس اے	09	ایس اے
12	ایس اے	02	ایس اے	06	ایس اے	01	ایس اے	14	ایس اے
03	ایس اے	04	ایس اے	03	ایس اے	07	ایس اے	05	ایس اے
04	ایس اے	02	ایس اے	03	ایس اے	107	ایس اے	09	ایس اے
11	ایس اے	25	ایس اے	01	ایس اے	05	ایس اے	14	ایس اے

اردو ڈائجسٹ
 جولائی 2015ء

اردو ڈائجسٹ



اکاؤنٹ چلا گیا تو سینہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”رات کو شہلا نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ میں نے اس کو ایسی بہت سی باتیں سمجھائیں جو تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں لڑکیوں کو زیادہ آزادی دینے کے خلاف ہوں۔ میں تمہارا یہاں سے کہیں اور تبادلہ بھی کرا سکتا ہوں، مگر فی الحال میں نے شہلا کو لاہور بھیج دیا ہے۔ ہاں! تو تم کیا کہہ رہے تھے؟“

میں نے ذرا متنبہل کر کہا ”میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ اپنی مل کا اکاؤنٹ میں دے دیں تو.....“

سینہ جی نے یہ سناؤ چکانے کے انداز میں کہا ”وہ تو ٹھیک ہے مگر شہلا کا کیا ہوگا؟ کیا تم اس کو یہ لکھ کر بھیج سکتے ہو کہ تم نے اس سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرنے کی اب ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اگر تم ایسا کر سکو تو..... تو ممکن ہے میرا تمام اکاؤنٹ تمہارے ہی بینک میں آجائے اور تمہیں ترقی کے امکانات نظر آئیں۔ ورنہ سوچ لو کہ میرا نام فرقان علی ہے اور میں شہلا کا باپ ہوں۔“

چتنی دیر میں سورج کی شعاعیں زمین کے رخسار کا بوسہ لہتی ہیں، اتنی دیر میں، میں نے فیصلہ کر لیا اور سینہ صاحب سے کہا ”مجھے منظور ہے۔“

اس کے بعد مجھ پہ کیا گزر گئی یہ تم لکھو گے۔ مجھے ابھی..... آج ہی معلوم ہوا ہے کہ شہلا نے میرا خط پڑھنے کے بعد دوبارہ خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اپنی ترقی کی خوشی میں یہ جشن منایا۔ بتاؤ کیا تم نے اس گفتگوائی فضا میں کوئی سسکی سنی؟ روشنیوں میں اندھیرے کی لکیر دکھی.....؟ بتاؤ..... خدا کے لیے کچھ تو کہو۔“

کاغذ اپنا سینہ کھولے قلم کی برجھی کھانے کو تیار ہے۔ اور میں بڑی دیر سے قلم ہاتھ میں لیے اس فکر میں ہوں کہ اس کہانی کو کیسے شروع کروں اور کہاں ختم؟

لاہور بھیج دیا گیا۔ میں نے شبلی فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔ میں نے چونکا اٹھایا تو سینہ فرقان علی کی آواز آئی ”کیا تم ابھی آسکتے ہو؟“

ان کے پاس پہنچا تو وہ بڑے مصروف تھے۔ ایک ٹی اور بڑی مل کا منصوبہ اپنے آخری مرحلے سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا ”میں ذرا کام سے فارغ ہوں اور پھر تم سے بات کرتا ہوں۔“

وہ خاصی دیر مشغول رہے۔ میں کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔ پھر انہوں نے گھنٹی بجائی۔ چہرہ ہی آیا تو حکم دیا ”اکاؤنٹ کو بلاؤ۔“

اکاؤنٹ آیا تو سینہ صاحب نے پوچھا ”آپ نے روپیہ ٹرانسفر کر لیا؟“

”جی، ابھی تک تو بینک میں اکاؤنٹ ہی نہیں کھلا۔“

”تو یہ کام آج بلکہ ابھی کر ڈالیے اور پھر لاہور فون کیجیے۔ فی الحال کتنے روپوں کی ضرورت ہوگی؟“

”جی ضرورت تو مسلسل ہی پڑتی رہے گی۔ پچاس پچاس لاکھ کر کے منگالیں گے۔“

سینہ جی نے ہنسی بھرا کر کہا ”نہیں نہیں، سب روپیہ ایک ساتھ منگا لیجیے اور چتنی بھی ضرورت ہو.....“

میں یہ باتیں سن کر ایسے چونکا جیسے اب تک خواب کی دنیا میں تھا۔ میں نے کرسی پر پہلو بدلا، ٹائی کی گرد درست کی اور بولا ”معاف کیجیے گا۔ میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔“

سینہ جی اور اکاؤنٹ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ”بیکاری سے متعلق آپ کے تمام کاموں کے لیے میں اپنی اور اپنے بینک کی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔“

سینہ جی نے کھنگار کر گھا صاف کیا اور اکاؤنٹ سے کہا ”میں اس سلسلے میں آپ سے تھوڑی دیر بعد گفتگو کروں گا۔ ابھی ذرا ان سے بات کر لوں۔“

قشری جوہر جوشاندہ

ہر موسم کا بہترین ساتھ
فلو، نزلہ، یا زکام، پہنچائے فوری آرام!



فلو، نزلہ اور زکام سے بچاؤ کے لیے
دن میں 3 مرتبہ باقاعدگی سے استعمال کریں۔

- 114 کوالٹی ٹیسٹ
- ٹائم میگزین کے مطابق بیسٹ آف ایشیا
- ہر موسم میں فلو، نزلہ، زکام سے بچاؤ کے لیے بہترین
- پاکستان میں فروخت ہونے والے جوہر جوشاندہ کے
- 100 ڈیوں میں سے 88 قشری جوہر جوشاندہ کے
- ہوتے ہیں۔

Declared
'The Best of Asia'
by TIME Magazine



لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلا بیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ”لکھنا ایسا فن ہے جن کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، پوجتے ہیں۔“

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔
 عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔
 آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولوا کا یہ قول بھی مد نظر رکھیے:
 ”ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔“

ادارہ اُردو ڈائجسٹ

اُردو ڈائجسٹ 02 جنوری 2015ء

سیاحت پاکستان

گورے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ مرگ انبوہ کے اس جشن میں عالم بالا سدھارنے والے انگریزوں کی آن گت قبریں آج بھی نندکوٹ میں موجود ہیں۔

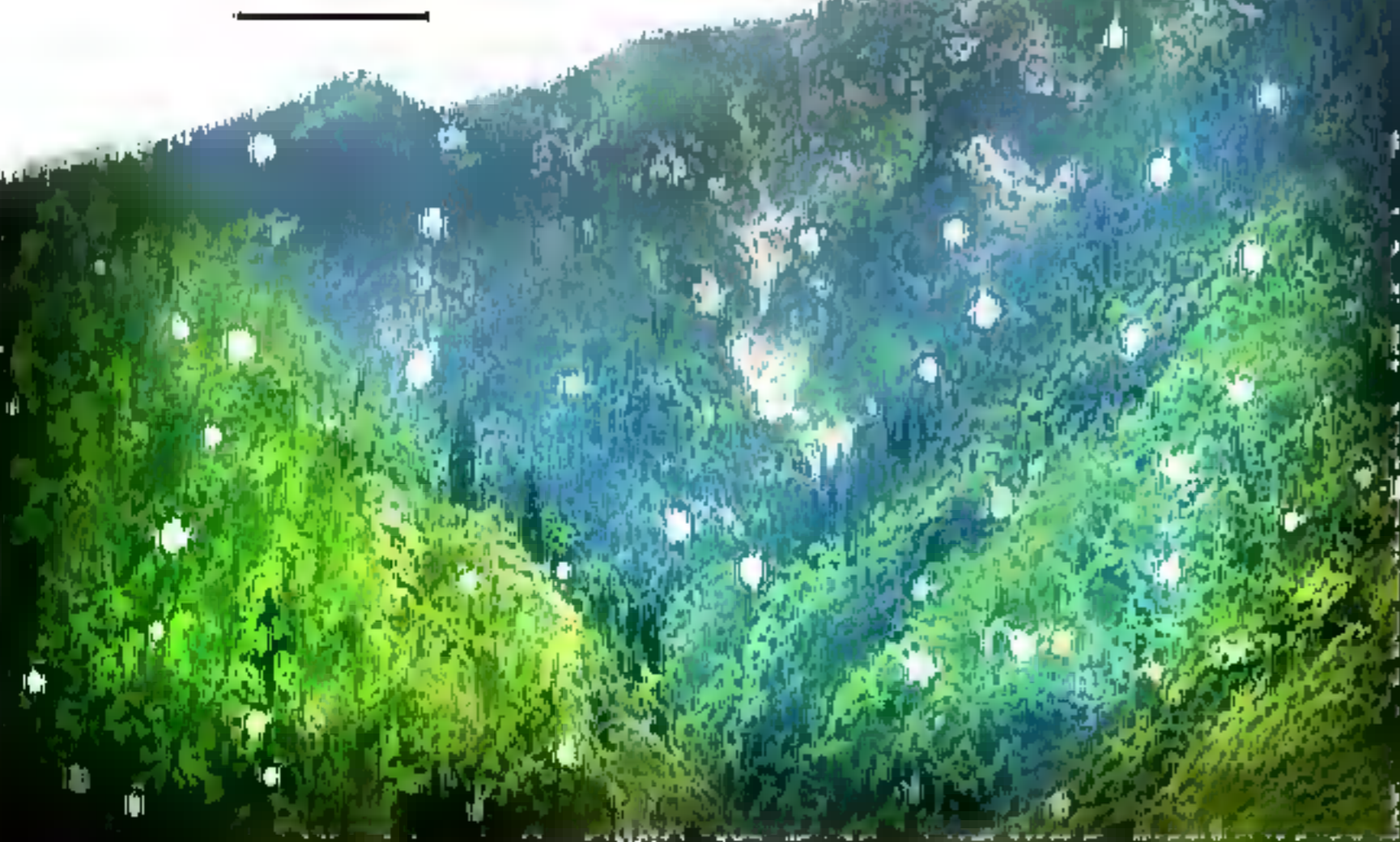
بالآخر انگریزوں کو وہاں سے کھپ اٹھانا پڑا۔ اسی پہاڑ سے کچھ آگے جا کر انہوں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں

برف سے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر

اے ملکہ کوہِ سارِ مری!

وطن عزیز کے ان سیاحتی مقامات کی سیاحت جن کے فطری حسن کو برف چارچاند لگا رہتی ہے

محمد داؤد طاہر



اُردو ڈائجسٹ 211 جنوری 2015ء

پہاڑوں میں واقع پاکستان کا سب سے مشہور پہاڑی سیاحتی مقام مری، سطح سمندر سے سات ہزار پانچ سو سترہ فٹ بلند ہے۔ کتاب ”پٹھو بار“ کے مصنف عزیز ملک کے الفاظ میں ”۱۸۵۱ء میں کوہ مری ناردرن کمانڈ کی برطانوی افواج کا گرماں مستقر قرار پایا۔ مگر ابتدا میں یہ ٹھکانہ تریٹ سے کچھ اوپر نندکوٹ میں بنا تھا۔ سنتے ہیں، وہاں لوگوں نے انگریز فوجیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔“

نندکوٹ میں ان دنوں ایک سائیکس صدیقی رہتا تھا۔ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ طبیعت کا جاناں مجذوب تھا۔ اس نے ایک انگریز افسر سے کہا ”صاحب بہادر! تم لوگ یہاں سے بوریہ بستر باندھ کر کہیں اور ٹھکانہ کرو ورنہ انجام ٹھیک نہیں ہوگا۔“

اس بات کو مجذوب کی بڑ سمجھا گیا۔ چند ہی روز بعد کیمپ میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور ساتھ ہی بے شمار سانپ بھی رینگنے لگے جن کے ڈسنے سے لاتعداد

آج مری کی سبز پوش ہستی آباد ہے۔ اس زمانے میں وہاں کا گھنیرا جنگل میاڑی دالوں کی ملکیت تھا۔ انگریزوں نے ان سے ساٹھ روپے سالانہ پٹے پر چند کنال زمین خریدی، رفتہ رفتہ قدم جمائے اور پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ درخت کتنے، جنگل بے اور آبادی بڑھتی چلی گئی۔

ضلع راولپنڈی کے گزٹینر ۹۳-۱۸۹۳ء کے مطابق جب دہلی میں جنگ آزادی لڑی گئی تو نواحی پہاڑیوں میں آباد ڈھونڈ قبائل مقامی لوگوں کی اعانت سے مری پر حملہ آور ہوئے۔ تاہم ان کے ارادوں کا قبل از وقت علم ہو جانے سے برطانوی حکمرانوں نے ان پر ہتھیار ڈال دیا۔ اسی واقعے کو عزیز ملک نے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھا:

”مری میں متین یونٹوں میں شاید ہی کوئی دہلی سپاہی ہو، اس لیے وہاں حفاظتی انتظامات کی ضرورت نہ تھی۔ مگر کوسا مری کی زخم خوردہ سول آبادی نے ہتھیار اٹھالیے۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات مری کی سرسبز وادی آزادی کے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ کئی طاق گاؤں کی ایک بڑھیا نے جس کا نام ستا تھا، کسی انگریز افسر کو بروقت خبر کر دی کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے۔ اس لیے فوری طور پر کچھ انتظامات کر لیے گئے۔

ہزارہ کے قبیلہ کراچل نے تین سو مجاہدوں کا دستہ مسلح کیا اور مری کی طرف آ گئے۔ دفتر خزانہ لونا اور گھنیرا بیاد کے جنگلے کو آگ لگا دی۔ لیکن جوڑی مال روڈ کی طرف آئے، گھات میں ڈینھے انگریز فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ بہت سے مجاہد شہید ہوئے۔ ان کے قائد رست خان اور اس کے چند سرکردہ ساتھی گرفتار ہوئے اور ان پر مقدمہ چلا۔ پھر ایک صبح ان سب کو توپ دم کر دیا گیا۔“

۱۸۶۱ء میں مری میں پہلی سڑک بنی جو پنڈی پوائنٹ اور کشمیر پوائنٹ کو ملاتی تھی۔ یہ سڑک کچی تھی جس پر تانگے

اور کیے چلا کرتے۔ یوں مری میں تعینات برطانوی فوجیوں اور ان کے اہل خاندان کو دوسری جگہ جانے میں سہولت حاصل ہو گئی۔

اس سڑک کی تعمیر کے دس سال بعد مری میں میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اسی دور میں وہاں مختلف تعلیمی ادارے، سرکاری دفاتر اور چرچ قائم ہوئے۔ ڈاک خانہ، عدالتیں، تار گھر، قحانہ، بازار، الائنس بینک آف شملہ کی ایک شاخ..... یہ سب کچھ وہاں اولین برسوں ہی میں بن گیا۔

۱۸۹۳-۹۴ء میں مری کی آبادی ایک ہزار سات سو اسی نفوس پر مشتمل تھی۔ آج بھی اس کی مستقل آبادی بہت زیادہ نہیں تاہم موسم گرما شروع ہوتے ہی ملک بھر سے لوگوں کی آمد شروع ہو، تو بہت بڑھ جاتی ہے۔ موسم سرما میں پھر سکڑ کر میں پچیس ہزار رہ جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس دوران مری کے رقبے میں قابل ذکر توسیع نہیں ہوئی بلکہ آبادی رہائشی علاقوں ہی میں گنجان ہوتی چلی گئی۔

مری آنے والے سیاحوں میں ملک کے تمام صوبوں اور علاقوں کی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ سندھی، بلوچی، پنجاب اور پنجابی مردہ عورتیں، بچے اور بوڑھے سبھی اپنے اپنے رنگ میں اس کا فرادا موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چودہ اگست کو مری کی رونقیں عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ اس روز مری کے تمام ہوٹل مکمل طور پر بک ہوتے ہیں۔ کئی سیاح منہ مانگا کرایہ دینے کو تیار رہتے ہیں پھر بھی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کئی لوگ یہ رات اپنی اپنی گاڑیوں میں سو کر گزارتے ہیں۔

اس روز مری جانے والے تمام راستوں پر ٹریفک کا بے انتظام جھوم ہوتا ہے۔ پارکنگ کے لیے جگہ نہیں ملتی اور

رہنما اور جنرل اسٹور اشیائے ضرورت کی قیمتیں بہت بڑھا دیتے ہیں۔ تاہم سیاحوں کی تعداد میں کمی کے ساتھ نرخوں میں قدرے اعتدال آ جاتا ہے۔

برف باری ہوتے ہی مری کی زندگی میں پھر جولانی آتی ہے۔ قدرت کے اس انمول کرشمے سے لطف اندوز ہونے کے خواہشمند اواخر دسمبر یا جنوری کے شروع ہی میں مری ڈیرا ڈالتے ہیں۔ جوں ہی برف باری کا سلسلہ شروع ہوا، وہ ”میدان عمل“ میں اتر آتے ہیں۔ برف کے ساتھ کھیلا بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی دلچسپ

نثر ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے مری کی سڑکوں پر ہر عمر کے مرد و زن ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکتے نظر آتے ہیں۔

دس صدی پہلے تک جاگیرداروں، خواتین اور بڑے صنعتکاروں اور سرمایہ داروں نے مری میں اپنے عمل نما جنگل بنا رکھے تھے۔ یہ لوگ گرمیوں کا موسم لہل خانہ کے ساتھ مری میں گزارتے۔ اب وسائل کی فراوانی

اور ذرائع ریل و سائل میں سہولت نے ان لوگوں کو مری سے دور کر دیا ہے۔ امرا و رؤسا تو سیر و تفریح کرنے یوہ پ اور امریکا چلے جاتے ہیں۔ البتہ متوسط طبقہ کے لوگ مری کے دامن میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ جو لوگ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہیں، صبح مری جا کر شام تک گھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کی جیب مری میں قیام کے لیے اخراجات کی قسط نہیں ہو پاتی۔ لہذا وہ چند گھنٹے وہاں گزار کر دل کی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔

مری میں ونائی اور پنجاب حکومت کے تقریباً ہر محکمے

کے ریٹ ہاؤس موجود ہیں۔ موسم گرما میں وہ اعلیٰ سرکاری دکام اور ان کے عزیز واقارب سے بھرے رہتے ہیں۔ عوام الناس ہٹلوں اور مسافر خانوں کا رخ کرتے اور مول تول کے بعد کوئی نہ کوئی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مری کی رونق سے محفوظ ہونے والوں کے لیے مال روڈ پر واقع ہوٹلوں سے بڑھ کر کوئی اور بہتر جگہ نہیں۔ کنٹونمنٹ بورڈ کا ملکیٹی ہوٹل مرحبا اس مقصد کے لیے موزوں ہے۔ کون کس کا کیا لگتا ہے اور کون کس امراء سے



سے مری آیا ہے، اس ہوٹل کی باگنی سے دیکھنے والی نگاہوں سے یہ بات ڈھکن چھپی نہیں رہتی۔ اپنی دھن میں گن سیاح، خریداری میں مصروف عورتیں، خواجہ فروش اور ان کی صدائیں، من پسند چیزوں کے لیے ضد کرتے بچے اور انھیں منانے ہوئے والدین، کافی، آڈوں کے چپس، آئس کریم اور کھانے پینے کی ایسی ہی چیزوں سے دل بہلاتے نوجوان اور بوڑھے دیکھ کر زندگی کی رنگارنگی کا احساس اور مگراہد جاتا ہے۔

پنڈی پوائنٹ کی بلند پہاڑیوں میں ٹی وی بوسٹر کے پہلو میں مریاں مای کسی بزرگ طاقتوں کی قبر ہے۔ بعض

لوگ کہتے ہیں یہاں حضرت مریم علیہ السلام مدفون ہیں اور یہ کہ ان ہی کے نام پر ہستی کا نام مری مشہور ہوا۔ پتہ زیادہ کا مشہور تفریحی مقام مری سے چھبیس کلومیٹر دور ہے۔ چوٹیاں تیری تریا سے ہیں سرگرم سخن پتہ زیادہ پاکستان کے سیاحتی مقامات میں قدرے نوجنم ہے لیکن فطری حسن و جمال کے ساتھ ساتھ یہاں سیاحوں کے آرام و آسائش کے لیے قریباً تمام ضروری سہولتیں موجود ہیں۔

اس مقام کو زیادہ شہرت لفٹ چیئرز اور کیبل کاروں



کے باعث ملی جو ایک غیر ملکی فرم کے تعاون سے نصب ہوئیں۔ یوں تو ایسا سفر ہر سیاح کے لیے سنسنی خیز ہوتا ہے، لیکن نو آموز سیاحوں اور بچوں کے لیے تو یہ تجربہ بالخصوص انوکھا ناقابل فراموش اور بیجان انگیز ہے۔

”ابو! ہم کتنی دیر لفٹ چیئر میں بیٹھے رہیں گے؟“ بیٹی نے مری سے روانہ ہوتے ہی مجھ سے پوچھا۔

”بیٹے! زیادہ عرصہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”ہوں سمجھ لو کہ لفٹ چیئر ایک ہزار تین سو میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ جبکہ کیبل کار مزید ایک ہزار آٹھ سو میٹر آگے جاتی ہے۔ یوں ہم محض طور پر تین کلومیٹر سے کچھ زیادہ فاصلہ

طے کر کے پہنچانے کے بلند ترین مقام پر جا پہنچتے ہیں۔“

”ان میں بیٹھ کر زیادہ خوف تو نہیں آتا؟“

”فکر نہ کرو! لفٹ چیئر اپنی خصوصیتوں جیسی رفتار سے مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔ اس سفر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لفٹ چیئر میں اتنا دھم سے بیٹھو، کسی قسم کی الجھل کو نہ کرو اور نیچے مناظر پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے علاقے کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سفر بہت محفوظ ہے اور شازئی کوئی حادثہ ہوا ہوگا۔ دعا کر کے بیٹھو گی تو ان شاء اللہ ہم ہر تکلیف سے محفوظ رہیں اور پھر عافیت واپس آجائیں گے۔“

پتہ زیادہ کی لفٹ چیئرز پر بیک وقت ایک سو چالیس افراد سفر کر سکتے ہیں۔ کیبل کاروں پر ایک وقت میں پچاسیانوے افراد بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ یوں ایک وقت میں دو سو چھتیس افراد بلند ہوں گے اس سفر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عام حالات میں تو شاہتین کو اپنی ہاری کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن موسم گرما میں لفٹ چیئر پر بیٹھنے کے خواہش مندوں کی لمبی قطار لگ جاتی ہے۔

پہلے کیمپ یعنی وہ جگہ جہاں سے لفٹ چیئرز کا سفر شروع ہوتا ہے، خوبصورت مقام ہے۔ وہاں کے سبزہ زار، مشروبات اور سنیکیس کی چھوٹی چھوٹی دکانیں، گھنے درخت اور ان کے درمیان جا بجا پڑی پتھریں بہت بھائی لگتی ہیں۔ لیکن جب لفٹ چیئر تیرے دھیرے دھیرے حرکت کرتے سیاحوں تک پہنچے تو بچے اور نا تجربے کار افراد ساری خوبصورتی بھول کر سوچنے لگتے ہیں کہ وہ ان پر کیوں کر بیٹھیں!

”ابو! آپ نے مجھے لفٹ چیئر پر خود بٹھانا ہے۔“ یعنی نے صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ نہ ہو میں مگر خود کو ڈھکی کر لوں۔“

”تم گھبراؤ نہ بیٹے!“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ”میرے ہوتے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں اس طرف کھڑا ہوتا ہوں، تم دوسری طرف کھڑی ہو جاؤ۔ جوں ہی لفٹ چیئر قریب آئے، آرام سے سوار ہو جانا۔“

ایک بار لفٹ چیئر پر بیٹھنے کے بعد سیاح باہموم سنبھل جاتے ہیں۔ وہ مخالف سمت سے واپس آنے والے سیاحوں کو ہاتھ بالا ہلا اور باہم مزاج پر ہی کر کے زیادہ پراختیاد نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کم از کم ہمیں کوئی چیخا چلانا ہوا سیاح نظر نہیں آیا۔

نولادہ تار پر دھمکی رفتار سے چلتی لفٹ چیئر سیاحوں کو بلندی پر لے جاتی ہے۔ لیکن نیچے نظر آنے والی گہری کھائیاں کمزور دل سیاحوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ ”اگر اس وقت بجلی بند ہو جائے تو کیا ہم یہیں لٹکتے رہ جائیں گے؟“ بیٹی نے سوال کیا۔

”بیٹے! ویسے تو انتظامیہ نے متبادل انتظام ضرور کر رکھا ہوگا لیکن دعا کرو، بجلی بند نہ ہو کیوں کہ ایسی بات ہمارے لیے وجہ پریشانی ضرور بن سکتی ہے۔“

بیس منٹ میں سیاح اس سفر کی پہلی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ لفٹ چیئر سے اترتے ہوئے بھی چابکدستی کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے۔ بصورت دیگر اترنے والے اوتدھے منہ گر بھی سکتے ہیں۔

لفٹ چیئر سیاحوں کو ڈائریکشن پر اتار دیا پس چلی جاتی ہے۔ ڈائریکشن سے اطراف کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ وہاں سے چارہاں اور اس کی پشت پر مسکادری پہاڑ نظر آتا ہے۔ اس سے ذرا آگے مری واقع ہے۔ جہاں نصب پاکستان ٹیلی ویژن کا بلند بالا ناورد کھائی دیتا ہے۔ موسم صاف ہو تو

اردو ڈائجسٹ 215 جنوری 2015ء

بہت دور برف پوش پہاڑ، گنگا کی چوٹی اور اس کے قریب آزاد کشمیر کے شہرہ باغ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

”ابو! کیا ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے؟“

”بیٹے! اب ہم کیبل کار میں بیٹھیں گے۔ چند ہی منٹ میں وہ ہمیں پتہ زیادہ کی چوٹی پر پہنچا دے گی۔“

اس جگہ سے راول تھیل اور اسلام آباد کی بعض عمارتیں مثلاً شہید ملت سیکرٹریٹ، یونی ایل بلڈنگ، سعودی پاک ٹاور، ایوان صدر اور پارلیمان باؤس، نمایاں نظر آتی ہیں۔ چوٹی سے ذوقی نظارہ کی تسکین کے بعد کیبل کار اور لفٹ چیئر کے ذریعے واپس نہیں کھپ آیا جاتا ہے۔ پتہ زیادہ میں کم خرچ اور گراں، دونوں اقسام کے ہوٹل موجود ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء داخل ہوتی ہیں۔ البتہ ایسی کوئی شے دستیاب نہیں جسے بطور سوغات ہمارا لے جایا جاسکے۔ ہاں! شاپنگ کا ارادہ ہو تو وہاں ہی پر مری رکنا پڑے گا۔

بقول شخص، پتہ زیادہ پاکستان کے تفریحی مقامات کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہاں مگر رات کو کبھی فراموش نہیں ہوتا اور اس کی یادیں دل کو ہمیشہ سرخوشی کے عیب احساس سے معمور رکھتی ہیں۔

جب ہم پتہ زیادہ سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تو بیٹی نے پوچھا ”پاکستان میں کسی اور جگہ بھی ایسی لفٹ چیئر ہے؟“

”بیٹے! جہاں تک میرا علم ہے سب سے پہلے لفٹ چیئر ایوبیہ میں لگائی گئی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں اب وہ قابل استعمال حالت میں ہیں یا نہیں۔ ویسے تو مری میں بھی ایسی ہی لفٹ چیئر موجود ہیں جو پنڈی پوائنٹ سے شروع ہو کر کائی نیچے تک چلی جاتی ہیں۔“

(مصنف کے سفر نامہ ”منزل نہ کر قبول“ سے ایک باب جو بعد شکر یہ لیا گیا)

اردو ڈائجسٹ 214 جنوری 2015ء

مجرم جو جرم کر کے بھی کہلایا

بے گناہ

اندھے قانون کے خود غرض ہاتھوں میں پھنس جانے والے ایک ستم رسیدہ غریب کا ماجرا

سیراب اسلم



روز پولیس چوکی کے انچارج نے ڈو کہہ مار کو اس مرغی چرانے کے الزام میں پکڑ لیا۔ پھر اس گدھے کا انتظار ہونے لگا جس پر ڈو کہہ مار کو پورے قصبے میں گھمایا جانا تھا۔ سروسٹ منہ کالا کرنے کے لیے توڑے کا انتظام ہی ہو سکا تھا یا پھر پانچ چھتروں کی سلامی جو ڈو کہہ مار کو دی جا چکی تھی.....!

انچارج چوکی ایک سخت سید بادشاہ تھے اور شکاری کتے پالنے کے بہت شوقین۔ تہویل ہو کر جس علاقے

میں جاتے تھے اس کے وصول کرتے اور یوں کتوں کی اپنی فوج میں اضافہ کرتے رہتے۔ اگرچہ ان کا چہیتا کتا صرف موتی ہی تھا۔

موتی کے اختیارات خود انچارج سے زیادہ تھے۔ انچارج صرف چوکی کی صدر کرسی پر بیٹھ کر تھانے داری کرتا تھا۔ مگر موتی اس میز پر بھی بیٹھ جاتا جو حکومت نے سید بادشاہ کو سرکاری کام کے لیے مہیا کی تھی۔ کسی ماتحت کی کیا مجال جو موتی کو ہنس کہہ کر میز سے نیچے اتارے؟

کتوں کی فوج ظفر موج کی رعایت سے چوکی انچارج کا نام کتوں والی سرکار پڑ چکا تھا۔ حیرانی کی بات یہ کہ انچارج کو اس نام پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ یہ نام سن کر وہ ایک طرح کی مسرت کا اظہار کیا کرتا۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دفعہ ۵۳ ضابطہ فوجداری کے تحت پکڑے جانے والے مشتبہ دن رات لن کتوں کی بنالین کی چاکری کیا کرتے۔ قصبے کے تمام قصابوں کا فرش تھا کہ علی الصباح تازہ گوشت انچارج کے کتوں کو ارسال کریں۔ شیر فروشوں پر لازم تھا کہ وہ دودھ میں ڈالے جانے والے پانی کے حساب سے خالص دودھ مہیا کریں۔ اسی طرح نان بانئ میدے میں ملاوٹ کے حساب سے نان حاضر کرتے۔ الہت پھل فروشوں کو آزادی تھی کہ وہ صرف تہوار کے موقع پر کتوں کے لیے تخفے لے آیا کریں۔ کتے پھلوں سے شوق نہ فرماتے مگر شاہ جی عقیدت مندوں کا دل توڑنے کے قائل نہیں تھے۔

کتے پالنا کتوں والی سرکار کا واحد شغل نہیں تھا۔ انھیں ایک شوق اور بھی لاحق تھا اور وہ یہ کہ ضرورت بے ضرورت لٹاؤٹ کس کر بیٹھ جانا اور مشتبہوں سے مالش کرانا..... مالش کرانے کے اوقات مقرر نہیں تھے۔ نصف

شب ہو یا دن اگر شاہ جی کو مالش یاد آگئی تو پھر سرکاری کام معطل اور مالش شروع ادنیٰ کی کوئی طاقت انھیں اس شغل سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ ساری بات شاہ جی کے موڈ کی تھی۔

جب ڈو کہہ مار کو پولیس چوکی لایا گیا تو شاہ جی ایک مخبر دوست کو اپنی تھانے داری کے کارنامے سنانے میں مصروف تھے۔ وہ فخر یہ کہہ رہے تھے کہ رینگر ہیں، کسی سفارش سے یا رشوت دے کر تھانے دار نہیں بنے۔ سپاہی سے ترقی کی اور اس اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ ان کی دھوم دھجاب بھر میں ہے۔ وہ ملزم کی چال دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ ملزم گنہ گار ہے یا بے گناہ..... مجرم کا چہرہ اندھیری رات میں بھی شناخت کر سکتے ہیں اور ہزاروں کے مجمع میں یہی آدمی کو یوں نکال باہر کرتے ہیں جیسے دودھ میں سے مکھی۔

شاہ جی جب جی بھر کر اپنے کارنامے سنا چکے تو حوالدار نے ڈو کہہ مار کو پیش کیا۔ بیٹھی بی بی بنے ہوئے ڈو نے شاہ جی کو سلام کیا۔ جواب میں انھوں نے فرمایا "اوائے کھوتے کے پتر! تجھے علم نہیں، اس علاقے کا انچارج کون ہے؟"

کتوں والی سرکار صاحب! "ڈو کہہ مار نے ادب سے جواب دیا۔

"اوائے جب تجھے اتنی خبر ہے تو مرثی چرانے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"معافی دے دیں سرکار، بندے بشر سے غلطی ہوئی جاتی ہے....."

جواب میں ڈو کہہ مار کی کمر پر زور دار دوہتر کی تان ٹوٹی اور آواز آئی "اوائے کھوتے کے پتر..... معافی؟ اوائے تجھے خبر نہیں کتوں والی سرکار نے معافی والا رجسٹر

”غ ل ل ل ل..... غلطی ہو گئی سرکار!“ دتو کہہ کر باہر آیا۔ شاید شاہ جی کو کچھ ترس آیا اور حکم صادر ہوا۔ ”معافی کی بات تو ہوگی۔ معافی کے وقت، پتہ پہلے تیری ”ٹرائی“ ہوگی..... تو نرا مرضی چور ہے یا تجھے کچھ اور نہیں آتا ہے؟“

یہ کہہ کر شاہ جی نے حوالدار کو ٹنگوٹ اور سرسوں کے تیل کی پیشکش لائے کہہ کر دیکھتے ہی دیکھتے ماش شروع ہو گئی۔ اس دوران موٹی میز پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ دتو کہہ کر نے اٹنے سیدھے ہاتھ چاٹنا شروع کیے۔ شاہ جی بد مزہ ہو گئے۔ دتو کہہ کر کی پشت پر ٹھنڈا رسید کرتے ہوئے فرمایا ”اوتے“

آدمی اپنی صحبت سے پیچھا جاتا ہے۔ تو گدھوں میں رہ کر گدھا بن چکا۔ دتو کہہ کر اوندھے منہ زمین پر گرا تو شاہ جی گرجے ”ڈراما نہ کر.....“

انھ اور مرغان جا ورنہ ابھی تیری کھال اوجھڑتا ہوں.....“

پھر ایک مشبے کو آواز دی ”اوتے غلام رسول! آ جا بھی، تیرے ہاتھوں میں بہت رس ہے۔ یہ کھوتے کا پتہ کیا جانے ماش کیا ہوتی ہے؟“

غلام رسول مشتبہ زحنگ سے ماش کرنے لگا، تو شاہ جی پھر موع میں آگئے اور اپنے مخبر دوست کو اپنی ٹھانے داری کے کارنامے سنانے لگے۔ وہ بات بات پر کہتے ”جو رہنکر ہوتا ہے نا جی، وہ رہنکر ہی ہے۔ یہ ڈائریکٹ ٹھانے دار کیا جانیں، ٹھانے دار کی کیا شے ہوتی ہے۔“ کبھی وہ ان سات ڈاکوؤں کا قصہ سنانے جنہیں تنہا شاہ جی نے

رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ کبھی ان چوروں کی کہانی جو سخت مار پڑنے پر بھی اپنا جرم قبول نہیں کرتے تھے۔ مگر شاہ جی کا پہلا چہستر پڑنے پر ہر شے برآمد کرنے پر راضی ہو جاتے۔ کبھی کہتے تھانیداری کرنا، جن بھوت نکالنے سے مشکل کام ہے۔ مگر تان دہیں اوتی ”جو رہنکر ہوتا ہے نا جی وہ رہنکر ہی ہے!“

ماش جاری رہی اور شاہ جی کا بار دھانڈ سے بھر پور ٹھانے داری کا پردہ گرام بھی اٹتے میں کار خاص نے حاضر آ کر بتایا کیا کہ گدھے کا انتظام ہو گیا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی شاہ جی کی توجہ دتو کہہ کر کی طرف پھر مبذول ہوئی جو کان پکڑنے کے بجائے زمین پر بیٹھا کان کھجا رہا تھا..... شاہ جی کا

ممکن ہے اچھے تھانیداروں کے مسکرانے پر محکمے نے پابندی لگا رکھی ہو؟ شاہ جی کو نہیں مسکرانا تھا سونہ مسکرانے ہنسنے کی تو بات ہی دور تھی۔

پارہ چڑھ گیا۔ مکوں، ٹھنڈوں اور گالیوں کی برسات شروع ہو گئی۔ دتو کہہ کر کی چیخوں سے پولیس چوکی لرزنے لگی۔ اب کی بار شاہ جی ایک اور اعلان

کر رہے تھے ”اوتے کھوتے کے پتہ..... تجھے خبر نہیں جہاں کتوں والی سرکار تعینات ہو وہاں ہوا بھی سلام کر کے گزرتی ہے.....!“

شاہ جی کا مخبر دوست بار بار کہتا ”بے شک..... بے شک!“

اور دتو کہہ کر پتہ رہا۔ اس کی جنہیں آسمان میں شکاف ڈالتی رہیں مگر کسی نے یہ نہ کہا، شاہ جی اسے معاف کر دو۔ ظاہر ہے یہ فقرے پولیس چوکیوں اور ٹھانوں میں نہیں کہے جاتے۔ سو ہر دھماکے کے انجام پر ایک ہی آواز سنائی دیتی:

”بے شک بے شک اور بھی“

جب شاہ جی نے دتو کہہ کر کو آخری ٹھنڈا مارا تو وہ زمین پر ہوں لڑھکا جیسے فٹ بال لڑھکتا ہے۔ سب ہنسنے لگے مگر شاہ جی کے چہرے پر مسکراہٹ تک نمودار نہیں ہوئی۔ ممکن ہے اچھے تھانیداروں کے مسکرانے پر محکمے نے پابندی لگا رکھی ہو؟ شاہ جی کو نہیں مسکرانا تھا سونہ مسکرانے ہنسنے کی تو بات ہی دور تھی۔

جب ”فٹ بال“ ساکن ہو گیا، تو شاہ جی نے دتو کہہ کر سے پوچھا ”اوتے اب بتا..... اس چوکی کا انچارج کون ہے؟“

”ک ک ک کتے شاہ سرکار.....“ وہ ہنکرایا۔

بھوکے شیر کی طرح شاہ جی اس کی طرف لپکے۔ ”اوتے کھوتے کے پتہ نام تو پورا لے۔“

دتو کہہ کر خطرہ بھانپ چکا تھا۔ اپنی بگلائی ہوئی زبان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”کتے شاہ جی..... سرکار!“

شاہ جی کے مخبر دوست نے لقمہ دیا ”اوتے کہہ کتوں والی سرکار“ لیکن اس بار گھبراہٹ میں دتو کہہ کر کے منہ سے نکلا ”شاہی کتوں والی سرکار!“

ایک بار پھر شاہ جی اور دتو کہہ کر میں فٹ بال میچ شروع ہو گیا اور پولیس چوکی کھیل کے میدان میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن یہ میچ یک طرفہ رہا۔ اسی اثنا میں کار خاص گدھا ہانک لایا۔ اب شاہ جی اپنی کرسی پر آن بیٹھے اور پھولا دم برابر کرنے لگے۔ موٹی میز سے نیچے اتر شاہ جی کے پاؤں چائے میں مسروف ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد شاہ جی نے کار خاص کو حکم دیا ”اس کھوتے کے پتہ کا منہ کالا کر کے لٹا ٹھٹھاؤ اور قبضے میں کھماؤ۔“

”بے شک..... بے شک.....“ مخبر دوست نے حسب عادت کہا۔

اورہ ہوئے دتو کہہ کر کو کار خاص نے دیگر ملازموں کی مدد سے گدھے کی پشت پر اٹھے منہ بٹھایا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر توڑے کی ساری سیاہی اس کے چہرے پر مل دی۔ ہانپتے ہوئے شاہ جی نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے حکم صادر کیا:

”لے جاؤ اس مرٹی چور کو میری نظروں سے دور!“

دتو کہہ کر جلوس پولیس چوکی سے رخصت ہوا، تو شاہ جی نے مخبر دوست کی طرف توجہ دی ”اصلاح معاشرہ کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے جی!“

”بے شک..... بے شک؟“

قبضے کے بچے بالے شاہ جی کی عادت سے واقف تھے۔ اسی لیے کالی دیر سے چوکی کے باہر دتو کہہ کر کے جلوس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی اس کی ساری چوکی سے برآمد ہوئی، وہ نعرے لگانے لگے: ”دتو ساڈا شیراے، باقی ابیر پھیراے۔“

جلوس کی قیادت کرنے والے حوالدار نے بچوں کے لیڈر سے کہا ”اوتے یہ مرٹی چور ہے، شیر کس طرح بن گیا؟“

بچوں کے لیڈر نے جواب دیا ”مشن جی! پہلے یہ مرٹی چور تھا چوکی میں آ کر شیر بن گیا ہے۔“

حوالدار شاید کچھ اور کہتا مگر بچوں کے لیڈر نے اس کی مہلت ہی نہ دی اور اب نعروں کے ساتھ بچوں کا قہقہہ بھی شروع ہو گیا۔

”دتو ساڈا شیراے..... باقی ابیر پھیراے۔“

تالیوں کی تھاپ پر یہ گاتا ناچتا جلوس قبضے کی مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد جب بازار پہنچا، تو انجمن اتحاد المسلمین کے صدر نے بڑھ کر پرانے جوتوں

فضول خرچ

ایک سنجوس باپ اپنے بیٹے سے: ”کیا کرو ہے ہو؟“

بیٹا: ”کچھ نہیں پایا!“

باپ: ”تم کچھ لکھ رہے ہو گے؟“

بیٹا: ”جی نہیں پایا۔“

باپ غصے سے: ”تو پھر چشمہ اتار کیوں نہیں دیتے۔ تمہیں فضول خرچی کی عادت پڑی گئی ہے۔“ (مرسلہ: فاطمہ سعد، راولپنڈی)

کھوتے کے پتر کو کوئی چھڑانے نہیں آیا۔ بہت دیر ہو گئی، کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟“

کار خاص نے نرمی سے جواب دیا: ”شاہ جی آتا ہی ہو گا اس بچارے کا باپ! آپ جانتے ہیں، غریبوں کو تو کوئی جلد رقم بھی ادھار نہیں دیتا۔ ایسے کاموں میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ غریبوں کا کچھ تو لحاظ کرنا چاہیے۔“

کار خاص کے یہ بول دتو کہہ مار نے بھی سن لیے۔ وہ کتوں کو نہلاتے ہوئے رک گیا۔ صبح سے گالیوں اور لعنوں کے زہریلے تیر خاصوشی سے سہتا رہا تھا۔ اب جو ایک ہمدردانہ آواز کانوں میں پڑی، تو اس کا سن بے قابو ہو گیا۔ سوچی ہوئی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو اُند آئے۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی:

”رہا تیرا شکر و شمنوں کے اس لشکر میں کوئی تو ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ نہیں.....!“
یہ کہہ کر وہ بھر کئے نہلانے میں مصروف ہو گیا۔

جنوری 2015ء

اور ہیروں کا.....!“

چونکہ اسے تھوڑا بہت آرام مل چکا تھا۔ زخموں سے خون رشنا بھی بند ہو گیا تھا اس لیے خاموشی سے گدھے کی پشت سے اترا اور چونک سے تعلق جگہ پر کتے نہلانے لگا۔

اب بچے بالوں نے غمرہ بدل دیا: ”کتا سازا شیراے، باقی ہیرو پھیراے!“

شاہ جی نے اپنے کتوں کی تصمین کا غمرہ سنا، تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ انھوں نے بچوں کے لیڈر سے مخاطب ہو کر کہا: ”اوائے کا کا..... غمرہ زرا زور سے لگا، جیسے سنائی کم دیتا ہے!“

لیڈر کو غمرے لگانے کی فیس کا پتا چل چکا تھا، اس لیے ساتھیوں کی آنکھ بچا کر دس انگلیاں فضا میں بلند کر دیں۔ شاہ جی اشارہ سمجھ گئے اور بولے: ”اوائے کم بختا لے لینا دس روپے۔ پہلے غمرہ تو لگا.....“ اس پر بچوں کے لیڈر نے اپنے ساتھیوں کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے غمرہ بلند کیا: ”کتا سازا شیراے“ بچوں نے جواب دیا: ”باقی ہیرو پھیراے!“

لنگ شگال غمرہ سن کر شاہ جی کی طبیعت خوش ہو گئی۔ انھوں نے دس کا نوٹ بچوں کے لیڈر کی طرف اچھالتے ہوئے کہا: ”اچھا سب بھاگ جاؤ..... ہم نے مرغی چور سے تقشیش کرنی ہے۔“

کچھ بچے چلے گئے اور باقی بدستور غمرے لگاتے رہے۔ شاہ جی ٹپتے ٹپتے دتو کہہ مار کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے جہاں کار خاص کتوں کی نہلائی کی گمرانی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شاہ جی خاموش کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ جب بچوں کا شور تھا، تو انھوں نے بولے سے اپنے کار خاص سے پوچھا: ”اوائے روٹے خاں، صبح سے اس

اردو ڈائجسٹ 221

نے کینٹی کے ٹکرک کو اشارہ کیا۔ اس نے نیلے رنگ کے پانی کی بائی اس کے سر پر اندیل دی اور بولا: ”حوالدار جی، صرف منہ کالا کرنے سے کام نہیں چلتا، اس کے پاؤں بھی نیلے ہونے چاہئیں۔“

دتو کہہ مار نے شند سے پانی کی جگہ سے ایک کپکپی لی اور پھر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ البتہ بچے بالوں نے اس دوران غمرہ بدل دیا:

”چیرمین سازا شیراے..... باقی ہیرو پھیراے!“

چیرمین امام مسجد کی طرح ذہین نہیں تھا، وہ سمجھا کہ آنے والے ایکشن کے لیے اس کے دوٹ چکے ہو رہے ہیں۔ اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا، بطور انعام بچوں کے لیڈر کو دیا اور پھر اس کے کان میں کہا: ”کسی اور کے غمرے نہیں لگانے، واپسی پر دس کا نوٹ اور دوں گا۔“

یہ کہہ کر چیرمین نے ازراہ تلفظ ایک چپت دتو کہہ مار کی گدی پر

رسید کر دی اور جلوس آگے بڑھ گیا۔

یہ جلوس قصبے کا چکر لگا کر واپس لوٹا، تو شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو گا جو دتو کہہ مار کی ہیبت کدائی پر ہنسا مسکرایا نہ ہو۔ تمام دن جلوس قصبے کے باسیوں میں قہقہوں کی سوغات بانٹتا رہا۔ مگر کسی بھلے آدمی نے زحمت گوارا نہ کی کہ دتو کہہ مار سے پوچھے کہ وہ گنہگار ہے بھی یا نہیں!

دن ڈھلے جلوس چونک واپس پہنچا، تو شاہ جی منتظر بیٹھے تھے۔ انھوں نے کتوں کی ٹالہین کو نہلانے کے لیے صابن و پانی کا دافر انتظام کر رکھا تھا۔ جلوس کے واپس آتے ہی شاہ جی نے دتو کہہ مار کو حکم دیا: ”اوائے مرغی چور، باری باری سب کتوں کو نہلا اور نہ تیری چڑی

جنوری 2015ء

کا ہار دتو کہہ مار کے گلے میں ڈال دیا۔ بچے بدستور غمرے لگاتے رہے:

”دتو سازا شیراے..... باقی ہیرو پھیراے!“

جلوس کے دونوں طرف کنڑے لوگ ہتے رہے اور جلوس چلتا رہا۔ مگر جب اصلاوح معاشرہ کا یہ جلوس چوک والی جامع مسجد کے سامنے سے گزرا تو امام صاحب نے قیادت کرنے والے حوالدار کو روک کر مشورہ دیا۔ ”منشی جی! یہ سزا کافی نہیں، اس پر حد لا کر رو۔ آپ جانتے ہیں نا اسلام میں چوری کی سزا کیا ہے؟“

مگر اس سے پہلے کہ حوالدار امام صاحب کا کوئی جواب دیتا، بچوں نے غمرہ لگایا: ”مولوی سازا شیراے، باقی ہیرو پھیراے۔“

اس پر امام صاحب کی ہتھی کھل گئی اور وہ بولے: ”بھاگ جاؤ شیطانو..... مجھے مرغی چور سے مار رہے ہو؟“

امام صاحب کی اس سرزنش

پر بچے بالے اور چنگے۔ وہ پہلے سے بھی بلند آواز میں کہنے لگے: ”مولوی سازا شیراے..... باقی ہیرو پھیراے۔“

جب امام صاحب کی زوجہ چہارم کے کانوں میں انروں کی آواز پہنچی، تو وہ گھونٹ سنبھالتی جگرے کی چار دیواری سے گردن بلند کرنے پر مجبور ہو گئی۔ خوش ہوئی کہ قصبے کے بچے شوہر نامداد کو شیر کے لقب سے یاد کر رہے ہیں۔ جلد یہ جلوس آگے بڑھ گیا۔ امام صاحب کی واپسی کے خوف سے زوجہ محترمہ پھر جگرے میں دبک گئیں۔

جلوس قصبے کی میوہل کینٹی کے دفتر کے سامنے پہنچا۔ چیرمین صاحب نے دتو کہہ مار کے استقبال کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ جلوس قریب آیا، تو چیرمین صاحب

اردو ڈائجسٹ 220

نملکین ہیں یاد بھی پھر بھی آپ ذرا مسکرائیے.....

فوٹو گرافر کے اس حکم کو
مطلق العنان بادشاہ بھی ٹال نہیں پاتا
یوسف نائم

ہو یا مشاعرہ، تواری کی محفل ہو یا کوئی سرکاری
تقریب، کھیل کا میدان ہو یا سیاست کا
جلسہ ایوان، ایسی تمام جگہوں پر دعوت اور ٹکٹ کے
بغیر داخل ہو جانے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ گلے میں
ایک ناکارہ کیمرا لگا لیا جائے۔ کیمرا لگا رہے تو گردن
سیدھی رہتی ہے اور راستہ بھی سیدھا ملتا ہے۔ کسی کی اہمیت
نہیں ہوتی کہ کیمرا میں سے یہ دریافت کر لے کہ آپ
یہاں کس خوشی میں تشریف لائے؟
فوٹو گرافر ہی وہ واحد شخص ہے جو دن کے وقت سورج
اور رات کے وقت بجلی کی روشنی میں، پولیس کی نظروں کے
تین سامنے جلسہ گاہ میں نقب لگاتا ہے۔ پولیس عقب میں
چپ چاپ کھڑی رہتی ہے۔ فوٹو گرافر سے یہ بھی نہیں
پوچھا جاسکتا کہ اس کے خوب صورت کیمرے میں فلم بھی
ہے یا نہیں؟ یہ فوٹو گرافر کا اپنا راز ہے جو عوام الناس پر
ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔

فوٹو گرافر نہ تو مزاج گو ہوتا ہے نہ طنز نگار، لیکن وہ
سب کو مسکرانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس کے ایک لفظ
”مسکرائیے، میں عجیب و غریب تاثیر ہے۔ یہ لفظ سن کر وہ
لوگ بھی مسکرا دیتے ہیں، جو نہ مسکرائیں تو تصویر زیادہ اچھی
آئے۔ ان کی اپنی تصویر تو بگڑتی ہی ہے، دوسرے مفت



میں مارے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی فوجی افسر کی زبانی
سے اٹن ٹن کا لفظ سن کر پوری بالین بے ضرورت سینہ
تھان دیتی ہے۔ اسی طرح فوٹو گرافر کی معمولی رہی فرمائش
پر، جس میں کوئی خلاصہ و رد نہیں ہوتا، کبھی کی ہاتھیں کھل
جاتی ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اسی طرح کسی فوٹو گرافر
کے کہنے پر ایک حسینہ کو مسکراتے دیکھ لیا، تو برجستہ فرمایا تھک
یہ ایک جہنم بھی کے ملتا ہے
(بعد میں انہوں نے مصرعے کو ایک زبانی میں جمع
کر کے اس کا حلیہ بدل دیا)

فوٹو کچھنوتے وقت ہر شخص کا مسکرانا اب خود
فوٹو گرافروں کو بھی پسند نہیں۔ فوٹو گرافر اب اتنے باختیار
ہو گئے ہیں گو یادستور کی بیالیسویں ترمیم پارلیمنٹ میں انہی
کے لیے اتری تھی۔ گرہ فوٹو کچھنوتے وقت پہلے تو لوگوں کو
شکل و صورت، قد و قامت اور لباس و پوشش کے معیار پر
جانچ کر دو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جن کا قد
بہت زیادہ لمبا ہو یا جو صورت سے مسکین اور دوسرے
درجے کے شہری نظر آئیں انہیں زمین پر بٹھا دیتے ہیں۔
کسی کے حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں،
اسے اکڑوں بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھنے
والوں کے دست و بازو پر اتنی کڑی نظر رکھتے ہیں کہ ڈر
لگنے لگتا ہے، انہیں نظر نہ لگ جائے۔ اور کرسیوں کے پیچھے
کھڑے رہنے والوں کو اس طرح کھڑا کرتے ہیں کہ وہ
اپنے انداز ہی سے وظیفہ یاب دکھائی دینے لگتے ہیں۔

فوٹو گرافر اپنے تمام ”سائمن“ کو اس طرح ترتیب
دیتے ہیں جیسے اکا بانا سسٹم کے مطابق گل دان میں پھول
سجائے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو خیر نیک تھا اور لوگ اس
بندوبست کے عادی بھی ہیں۔ لیکن بعض فوٹو گرافروں نے
اپنے اختیارات میں اب اس اختیار کا اضافہ کر لیا کہ وہ

شکر کاے تصویر نہیں سے کسی سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ فلاں
صاحب نہ مسکرائیں، اور کسی کو اپنی مسکراہٹ کا والیوم کم
کرنے کی ہدایت بھی دیتے ہیں..... کوئی فوٹو گرافر یہ گواہ
نہیں کر سکتا کہ دستور کی بیالیسویں ترمیم ضائع ہو جائے۔
وہ ہمیشہ ایک فوٹو دو مرتبہ کھینچتے ہیں۔ بعض لوگ یہ
سمجھتے ہیں کہ فوٹو گرافر ایک ہی تصویر دو وقتوں میں تکمیل
کرتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے۔ پہلی تصویر صرف سوڈہ ہوتی
ہے۔ فوٹو گرافروں نے اصل میں دہراتے کا یہ طریقہ
شاعروں سے سیکھا۔ شاعر اپنے ہر شعر کا پہلا مصرع دو
مرتبہ پڑھا کرتے ہیں۔ (یہ اور بات کہ فائدہ کچھ نہیں
ہوتا)

ایک شاعر اور ایک فوٹو گرافر میں یوں تو کئی باتیں
مختلف ہیں۔ لیکن ان دونوں حضرات میں دو فرق اہم
ہیں۔ ایک تو یہ کہ فوٹو گرافر کو اپنے متعلق کوئی غلط فہمی
نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ فوٹو گرافر پر ہونگ کا رواج نہیں
بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ شاعر کے بجائے فوٹو گرافر ”دیدہ
بینائے قوم“ ہو گیا۔ کیمرے کی آنکھ چشم پوشی کی عادی نہیں
ہوتی۔ آج اجتماعی اور انفرادی زندگی میں فوٹو گرافر کا وہی
درجہ ہے جو غزل میں ردیف اور قافیے کا ہوتا ہے۔ بس کسر
اتنی رہ گئی ہے کہ فوٹو گرافر کا نام آپ کے راشن کارڈ میں
درج نہیں درنہ ثنائی وہ ہر خاندان کا رکن ہے۔

پہلے بات اور تھی آدمی اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر
خوش ہو لیتا۔ اب اس سے تشنگی نہیں ہوتی۔ اپنی تصویروں کا
ایک پورا اہم رکھنا پڑتا ہے جس کا دن میں ایک مرتبہ مطالعہ
ضروری ہے۔ جس خاندان کا فیملی اہم نہ ہو، لوگ اس کے
انفرادی کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
سوچتے ہیں کہ یہ لوگ خاندانی ہیں بھی یا نہیں؟
یوں بھی جب سے اعمال و افعال کی نوعیت بدل گئی

جیت گیا۔ اگر کوئی انسیدوار پوسٹر پر صرف اپنا نشان انتخاب چھاپ دے اور نشان انتخاب کوئی جانور ہو تو غلط فہمی کا امکان رہتا ہے۔

منا ہے فوٹو گرافر بھی اب اپنے اسٹوڈیو کے شوکیس میں صرف انہی لوگوں کی تصویریں نمائش کے لیے رکھتے ہیں جو پابندی سے ہر ماہ ان کا کرایہ ادا کریں۔ بعض تصویریں البتہ ہوتی ہی نمائش کے لیے ہیں۔ یہ ان ماہ زخموں کی ہیں جن سے ملنے کے لیے غالب نے مصوری سیکھنے کی کوشش کی تھی۔

یوں تو فوٹو گرافر ہر جگہ آ جا سکتا ہے لیکن ایسی جگہ جانا ممنوع ہے جہاں مکان ڈھانے کے لیے بل زور رگشت کر رہا ہو یا کسی مجسٹریٹ کے حکم پر عوام پر گولی چلائی جا رہی ہو۔ یہ پابندی بھی صرف اس لیے ہے کہ فوٹو گرافر اگر وہاں آ بھی گیا تو کس سے کہے گا؟ ”ذرا سکرائے!“

معاوم ہونے لگتی ہے جیسے سر پر تلوار لٹکی ہو۔ یہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ پورے ماحول کی تصویر بدل جاتی ہے اور آدمی خود تصویر حیرت بن جاتا ہے۔


اب تو ضرورت کی کوئی چیز خریدیے، اس کی بوتل یا ڈبے پر موجد کی تصویر موجود ہوگی یا پھر کوئی ماڈل اپنی زلفوں، دانتوں، ہاتھوں اور اس قسم کی دوسری اشیاء کی نمائش میں مصروف نظر آئے گا۔

پیکنگ پر اگر تصویریں نہ ہوں، تو بہتوں کو تو خبر بھی نہ ہو کہ دنیا میں کیا کیا چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ ان ڈبوں اور بوتلوں کو آپ قرینے سے گھر میں سجا دیں، تو ایک آرٹ گیلری بن جائے۔

انکیشن کے امیدواروں پر بھی اب لازم ہے کہ وہ اپنے اپنے پوسٹروں پر اپنی تصویر ضرور چھپوائیں۔ کہتے ہیں امریکا میں تھی کارز صرف اپنی تصویر کی وجہ سے انکیشن

صاحب مضمون

اردو کے ممتاز مزاح نگار، ہوسف ناظم کا اصل نام سید محمد ہوسف تھا۔ آپ مہاراشٹر کے ایک گاؤں جانا میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے ایم اے اردو کیا۔ پھر سرکاری ملازم ہو گئے اور ڈپٹی لیبر کمنشنر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت مزاحیہ مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ مزاح کی دور دراز حق کتب شائع ہوئیں۔ آپ اپنے منفرد مزاحیہ اسلوب کے مالک تھے اور مزاح نگاروں اور اردو مزاح نگاروں میں نمایاں مقام پایا۔ ۲۵ جولائی ۲۰۰۹ء کو وفات پائی۔



شاعر اور ادیب اب اپنے نتیجہ نگار اور اس کے انتخاب پر اتنا وقت صرف نہیں کرتے جتنا اپنی تصویر منتخب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ فوٹو گرافر بھی ایسی تصویروں پر کم محنت نہیں کرتے، اپنا خون پسینا ایک کر دیتے ہیں تب کہیں جا کر شاعر اور ادیب آدمی نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چند دن بعد ایڈیٹر ہر تصویر کے نیچے یہ جملہ بھی چھاپنا شروع کر دیں گے کہ ایڈیٹر کا فوٹو گرافر سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

کسی بڑے آدمی یا بڑی خاتون کو عام جلسے میں ہار پہنانے کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد بعض لوگ منہ مائٹے رام ادا کرتے ہیں۔ اس موقع کی جو تصویر کھینچے وہ ان کے ڈرائنگ روم میں ہر وقت لٹکی رہتی ہے۔ جب ذرا گردن اٹھائی، دیکھ لی۔ یہی قیمتی تصویر بعض اوقات ایسی

ہے تصویروں کی اہمیت بڑھ چکی۔ اب ہر قدم پر آدمی کو اپنی تصویر پیش کرنی پڑتی ہے، خواہ اس کا چہرہ تصویر کے لائق سے یا نہیں۔ وہ تصویر کے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبے میں دخل نہیں دے سکتا۔ امتحان دینا ہو تو شناختی کارڈ پر اپنی تصویر لگانا پڑے گی۔ یہ اور بات کہ طالب علم کی جگہ اس کا کوئی خیر خواہ امتحان گاہ میں داخل ہو اور جوانی پر چالکھ آئے۔ پھر زندگی کے دیگر بہت سے اشغال کی خاطر بھی شناختی کارڈ ہی ہونا پڑتا ہے جس پر اپنی تصویر لگانا ضروری ہے۔ بعض لوگ بھولے سے شناختی کارڈ پر اپنی وہ تصویر لگاوا دیتے ہیں جو انہوں نے شادی سے پہلے کھنڈوا لی تھی، پہچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نظم و نسق کی کسی خرابی کی وجہ سے ملازمت مل جانے کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی دو تین درجن تصویریں درکار ہوتی ہیں۔ اور نہ پاسپورٹ کے لیے تو چند تصویریں ہوتی ہی چاہئیں۔

یہ تو خیر جہر یہ تصویریں ہوئیں لیکن شوقیہ تصویریں بھی ہیں جن کے بغیر زندگی ایسی کبانی نظر آتی ہے جس پر ”ہالی آئینہ“ لکھا ہو۔ جو تصویر ملازمت کی درخواست کے واسطے ہو، شادی کی مہم کے لیے ناموزوں سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ہوتی روٹوں ہی ملازمتیں ہیں۔ لیکن شادی کے باب میں جو تصویریں کھینچی جائیں ان کا انداز، اسلوب اور لہجہ الگ ہوتا ہے۔ یہ نکتہ آپ کو فوٹو گرافر ہی تفصیل سے سمجھا سکتا ہے۔

پھر شاعروں اور ادیبوں کی مخصوص انداز والی تصویریں ہیں۔ ادبی رسائل میں پہلے صرف کلام یا مضمون کی اشاعت کافی سمجھی جاتی تھی۔ قارئین بھی مطمئن ہو جاتے لیکن اب تصویر کے بغیر کسی تحریر کی اشاعت اس لیے بھی ممکن نہیں کہ کم سے کم ایک چیز تو قیمت ہونی چاہیے۔

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے



گستاخ فلائیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ”لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال در یافت کرتے، ہوجتے ہیں۔“

اردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون لیا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاپاؤ لوکیو لوکا کی یہ قول بھی مد نظر رکھیے:

”سنا جھمے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔“

معدوم ہونے کے
خطرے سے دوچار

افریقا کے بونے



ان پست قامت انسانوں کا تعجب خیز حال جو دور جدید میں بھی جنگل کو اپنا مسکن بنائے بیٹھے ہیں

فرزان کبھت

سنگھما کے مخصوص قطعہ اراضی کی بیرونی
زائگا حدود میں گھنے درختوں کے جھنڈوں کی
تھار سے پرے موساپولا گاؤں واقع ہے۔
جمہوریہ وسطی افریقا میں واقع ایک ہزار سات سو میل کے
رتبے پر پھیلا یہ جنگل افریقی براعظم کی عظیم شکار گاہ
ہے۔ ساتھ ہی یہ مشہور عالم افریقی بونوں کا مولد مسکن
بھی ہے جن کی نسل اب معدومیت کے خطرے سے
دوچار ہو چکی۔

یہ بونے ہزاروں برس سے براعظم افریقا کے مالک



اردو ڈائجسٹ 226

جنوری 2015ء

چلے آ رہے ہیں۔ اب ان نیم بدوئی جانوروں کو گھیر کر
شکار کرنے والوں کی تعداد صرف ایک لاکھ کے لگ بھگ
رہ گئی ہے۔ ان کی جنگلی زندگی کا غالب رقبہ سبزاروں
(Savannas) میں تبدیل ہو چکا۔ انھیں اپنے
پڑوسیوں کی طرف سے بھی خطرات لاحق ہیں۔

موساپولا کے اتنی فیصد باشندے شہد کی مکھیوں کے
چھتے کی صورت بنی چھوٹیوں میں رہتے ہیں۔ وہ
پتوں اور گارے سے بنائی جاتی ہیں۔ چھوٹیوں کے باہر
بچوں کی ٹولیاں کھیلتی کودتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرد و زن
اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ انتہائی
غربت اور بد حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طبی سہولتوں
کے فقدان کی وجہ سے ان میں گلہڑ سمیت کئی بیماریاں عام
ہیں۔ ہر پانچ لوہو لوہو بچوں میں سے ایک بچہ ایک سال کی
عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ بچوں کی اموات کے
اسباب زیادہ تر ملیریا، اسہال اور وبا ہیں۔

ان بونوں کے بچے دس بارہ سال کی عمر تک نارمل قد
و جسامت کے ہوتے ہیں۔ پھر ان کے قد نہیں بڑھ
پاتے۔ ساتیس دان اب تک نہیں جان سکے کہ ان کی
نشوونما ختم جانے کا راز کیا ہے۔ ان کی کوتاہ قامتی نے
غالباً ہزاروں برس سے جنگلوں میں بوندو باش رکھنے کے
سبب جنم لیا۔ جنگلوں میں رہنے والے لوگ کوتاہ قامت
بھی ہوا کرتے ہیں مگر ان بونوں جیسے نہیں۔ ایک اوسط
بونے کا قد چار فٹ تک ہوتا ہے۔ جبکہ عورت اڑھ فٹ
چھوٹی ہوتی ہے۔

ان بونوں میں شادی بیاہ کے لیے ایک سیوا منعقد کیا
جاتا ہے۔ اس میں مرد عورتیں اپنی پسند کے ساتھی چن
لیتے ہیں۔ پھر ان کی آپس میں شادیاں ہوتی ہیں۔ اس

موقع پر قدیم رسوم و رواج کے مطابق خوب گایا بجایا جاتا
ہے۔ تمام قبیلے کی دعوت کی جاتی ہے۔ خوبصورتی
بڑھانے کے لیے دانتوں کے اگھے دانت ریتی سے لگسا
کر نوکیلے بنائے جاتے ہیں۔

افریقی بونے شکار کے دیوانے ہیں۔ ان کے محبوب
شکاری جانور چھوٹے ہرن اور بارہ سنگھے ہیں۔ انھیں یہ
جال لگا کر پکڑتے ہیں۔ یہ جنگل میں بہت اندر جا کر اس
کی گہرائی میں اتر جاتے ہیں۔ وہاں گھنے درختوں کے
سبب دن کو بھی رات جیسی تاریکی ہوتی ہے اور زمین پر
پتوں کا قالیں سا بچھا ہوتا ہے۔

یہ بونے زبردست قسم کے کھوجی بھی ہیں۔ انھیں
ہوئی میلوں، کھنٹی جھالوں، گھاس بھوس اور کچھڑ میں
باسانی اپنا راستہ بناتے اور معلوم کر لیتے ہیں کہ وہاں سے
انھیں کون جانور گزرے ہیں۔ جو بونا سب سے زیادہ ماہر
شکاری اور کھوجی ہو، اسے تمام بونے اپنا سردار تسلیم کرتے
ہیں۔ جانوروں کا شکار کرنے کے لیے یہ ایک سوزوں جگہ
دیکھ کر وہاں جال بچھاتے ہیں۔ یہ جال انگوڑ کی میلوں
سے بنتے ہیں۔

جال کے ذریعے جانوروں کا شکار آسان نہیں۔
کیونکہ چھوٹے ہرن اور دوسرے جانور جب شکاریوں
کی آوازیں سنیں تو فوراً تیل بوٹوں میں چھپ جاتے
ہیں۔ شکاری انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے خوب شور
مچاتے اور انھیں جال کی طرف بھانسنے پر مجبور کر دیتے
ہیں۔ جب کوئی جانور جال میں پھنس جائے، تو وہ خوب
اچھلتے کودتے ناچتے گاتے ہیں۔

یہ بونے بھی عام انسانوں کی طرح راگ اور
موسیقی کے رسیا ہیں۔ ایک امریکی لوہیں سارنوں نے ان

اردو ڈائجسٹ 227

جنوری 2015ء

کے گیت ریکارڈ کیے۔ وہ کہتا ہے "بوںوں کے بچے بولنے کے ساتھ ہی گانا بھی سیکھنے لگتے ہیں۔ کیوں سے لے کر گانگو تک تمام بونے ایک ہی لے میں گاتے ہیں۔"

بوںوں کی زندگی گروہی ہے۔ شکار کی صورت انھیں جو خوراک ملے، وہ اسے مل جل کر کھاتے ہیں۔ ان میں خاندانی روابط بے حد مضبوط ہیں۔ ہر گروہ اپنے اصولوں کی سختی سے پاسداری کرتا ہے۔ ان سے روگردانی شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ بوںوں میں لڑائی جھگڑوں کی نوبت نہیں آتی۔ وہ کبھی دوسرے گروہوں سے بھی نہیں لڑتے۔

بارشوں کے دنوں میں شکار کی فراوانی ہوتی ہے۔ لیکن ان دنوں بونے شکار سے زیادہ اپنی زمینوں پر سبزیاں کاشت کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ چار سو سال قبل خوردنی تیل کے کچھ پودے برازیل سے افریقہ لائے گئے تھے۔ ان کی کاشت اب بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔

یہ بونے جنگل سے باہر ہانٹو کسانوں سے مال کے بدلے مال کے طریقے پر تجارت کرتے ہیں۔ یہ گوشت، جنگلی شہد اور کھبیوں کے بدلے لہن سے اشیائے ضرورت لیتے ہیں مثلاً اناج، کپڑے وغیرہ۔ ہانٹو قبائلی دراز قامت ہیں۔ انھوں نے جب پہلی مرتبہ ان بوںوں کو دیکھا تو ہبشکل ہی یقین کیا کہ وہ واقعی سرزمین افریقہ میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ انھوں نے بوںوں کو شرمیلا، بے ضرر اور اپنے ہی خول میں بند رہنے والا پایا۔

بونے ہانٹو لوگوں کی انوکھی چیزوں مثلاً کھانا پکانے

کے برتنوں، وحاشیہ نیزوں، تیروں اور خنجروں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے حصول کی خاطر وہ کئی ماہ جنگل کی رہائش ترک کر ہانٹوؤں کے کھیتوں میں کام کرتے اور معاوضے میں یہ چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔ صدیوں تک ہانٹو زمین داران بوںوں کو اپنے موروثی زرعی غلام سمجھتے رہے۔ ان کے درمیان اقصیب کی دیوار اب تک کھڑی ہے۔ مفرور اور اونچے دماغ والے ہانٹو بوںوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

انسانی حقوق کی انجمنیں ہر جگہ مظلوم، دسے کچلے ہوئے اور نا انسانی کے شکار لوگوں کو انصاف دلانے اور ان کی حالت سدھارنے کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں۔ لیکن جمہوریہ وسطی افریقہ کے بوںوں کو وہ نظر انداز کر رہی ہیں۔ روانڈا، کانگو اور کیمبوجا میں آباد بوںوں کے ساتھ بھی بڑی بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ انھیں اپنی محنت کا خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملتا۔ آجر ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک بھی نہیں کرتے۔ حکومتیں جنگلوں پر ان کے حقوق کا کاندہ تسلیم نہیں کرتیں حالانکہ وہ صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔

بونے جنگل کی زندگی ترک کرنے کو تیار نہیں۔ پھر بھی وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا پسند کرتے ہیں۔ ایک یونا کہتا ہے "میں اپنے بچوں کو دونوں دنیاؤں میں زندگی گزارنے کی تعلیم دلاؤں گا۔ ایک جنگل کی دنیا، دوسرے شہر والی۔۔۔۔۔ یہ قدیم رسوم و رواج پر کاربند رہتے ہوئے جدید دنیا کے تقاضے پورے کرنے کی بہترین مثال ہے۔ لیکن کیا اسکولوں میں تعلیم پا کر نکلنے والے بونے بچے جنگلی زندگی کی طرف پلٹ سکیں گے؟ پتھر کے زمانے سے لے کر کتاب کے زمانے کے

درمیان واقع خلا پھلانگنا آسان بات نہیں۔

بچوں کی تعلیم زیادہ تر پرائمری کی سطح تک ہی محدود رہتی ہے۔ چند ایک ہی ثانوی اسکولوں میں جا پاتے ہیں۔ ان بوںوں کی جدید زمانے میں کامیاب ترین چھلانگ موساپولا سے تیس میل دور جانب شمال مونا سارا کے کیمتو لک مشن میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہاں ایک ہزار کے لگ بھگ بونے ہانٹوؤں کی مداخلت بے جا سے آزاد موگ بھلی اور دیگر نقد آور اجناس کی کاشت کاری میں مصروف ہیں۔ اس محنت کے بدلے انھیں اشیائے ضرورت دینے کے ساتھ ہی مسیحیت قبول کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے جسے قبول کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

بونے بے یا کانا ای ایک عظیم ہستی کی عبادت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ موکوئڈی یعنی ارواح جنگل کو بھی مقدس سمجھتے ہیں۔ ان میں سب سے طاقتور موکوئڈی "ابنجنگلی" ہے۔ یہ مخصوص راتوں میں جنگل میں نزول کرتی ہے۔ جب اس کے نزول کا وقت ہو، تو

ہر سو خانہ سوشی چھا جاتی ہے۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے جنگل کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر درجن بھر بونے ایک ایسی مخلوق کو اپنے درمیان لیے جنگل سے نمودار ہوتے ہیں جو سرتا پالے لیے تنکوں میں ملفوف ہوتی ہے۔ اس کے کوئی خدا خال اور اعضا وغیرہ نہیں ہوتے۔ یہی "ابنجنگلی" ہے۔

اس کے نمودار ہوتے ہی سب لوگ شدید عالم خوف میں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ "ابنجنگلی" اپنے منہ سے کچھ نہیں بولتی، ہر اہی اس کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جنگل سے باہر کھلی جگہ پر نکل کر "ابنجنگلی" ناپنے کو بولنے لگتی ہے۔ ساتھ ہی ڈھول بجا شروع ہو جاتے ہیں۔ ڈھولوں کی تھاپ میں تیزی آنے کے ساتھ ابنجنگلی کا دھن بھی تیز تر ہو جاتا ہے۔ تمام بونے بھی ہنونی انداز میں ناپنے لگتے ہیں۔ یہ دھن ساری رات جاری رہتا ہے۔ صبح ہوتے ہی "ابنجنگلی" اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جنگل میں غائب ہو جاتی ہے۔

نصیر الدین طوسی

۲۸ دوست ہزار بھی کم ہیں اور دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
 ۲۹ جو شخص ناممکن کے پیچھے بھاگتا ہے وہ ممکن سے بھی رہ جاتا ہے۔
 ۳۰ آنکھیں بند کر لینے سے سورج کی روشنی کم نہیں ہو جاتی۔
 یعقوب بن اسحاق الکندی

۳۱ جو شخص جتنا اچھا ہوتا ہے اس کے دشمن اور حاسدانے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔
 ۳۲ جو شخص تیری باتیں خوشدلی سے نہیں سنتا تو اس کے سننے کا احسان اپنی باتوں سے اٹھالے۔
 ۳۳ ہر حسین چیز اچھی نہیں ہوتی لیکن ہر اچھی چیز لازماً حسین ہوتی ہے۔
 ۳۴ بیمار کی عیادت خدا کی عبادت ہے۔
 (انتخاب: تاج شفیق، لاہور)

اپنی زندگیوں کو مثال دے سکتے ہیں۔

دور حاضر کے مغربی دانشور اکثر مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک اسلامی ملک میں کس قسم کا حکومتی نظام نافذ کیا جائے؟ وہ اس ضمن میں اسلامی فرقوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات نمایاں کرتے ہیں۔ اب جناب محمد وقاص نے زیر نظر کتاب اسلامی ریاست کا منصوبہ بڑے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس منصوبے کی خاصیت ہے کہ یہ ان خامیوں و کوتاہیوں سے پاک ہے جو مغربی حکومتوں میں عام ہو چکیں۔ اس کا مقصد صرف عوام کی ترقی، بھلائی و خوشحالی ہے۔

کتاب صوری و معنوی لحاظ سے عمدہ ہے۔ اسلامی ریاست سے دلچسپی رکھنے والے مرد و زن اسے مرغوب کتاب پائیں گے۔

سو عظیم مسلم شخصیات

سازشے چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب صوری و معنوی لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے۔ سیرت خلفائے راشدین سے دلچسپی رکھنے والے اسے سن پسند کتاب پائیں گے۔

اسلامی فلاحی ریاست



مصنف: محمد وقاص خان۔ ناشر: محنت جہلی کیشنز، مرکز تحریک محنت جی ٹی روڈ، واہ کینٹ۔ فون: ۵۳-۲۹۰۴۰۵۲۔ قیمت: درج نہیں۔

مغربی دانشور خود لکھتے ہیں کہ دور جدید کی مغربی حکومتوں نے شوری (جمہوریت) انسانوں کی مساوات اور فلاح و بہبود کا تصور اسلام سے لیا ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں وہ فلاحی اور عوام دوست حکومت وجود میں آ چکی تھی جس نے چودہ سو برس بعد یورپ میں جنم لیا۔

لیکن مغربی جمہوری حکومتوں میں اللہ تعالیٰ نہیں، عوام کو مقتدر اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لیے ان حکومتوں کا نظام دنیاوی و مادہ پرستانہ زیادہ ہے۔ جبکہ اسلامی مملکت ان حدود و قیود پر عمل کرنے کی پابند ہے جو قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ 233



مصنف: میر باہر مشتاق۔ ناشر: عثمان جہلی کیشنز، اے۔ ایل بلاک پی۔ ۱۳ اریڈوے ہاؤسنگ اسکیم گلشن اقبال کراچی۔ فون: ۵۳-۲۹۰۴۰۵۲۔ قیمت: ۵۴۰ روپے۔

امریکا کے مشہور صدر تھیوڈور روز ویلیٹ کا قول ہے: ”آپ کو ماضی کے متعلق جتنی زیادہ معلومات ہوں گی، آپ مستقبل کو اتنا ہی بہتر بنا سکیں گے۔“ یہ

اردو ڈائجسٹ 233



کتابوں کی کاشان

کتابوں پر تبصرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

آپ کا شمار قریش کے دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ مگر جب اسلام لائے، تو اپنی ساری دولت اس نئے عظیم الشان مذہب کی ترقی و ترویج میں لٹا دی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”مجھے اور اسلام کو سب سے زیادہ ابو بکرؓ نے فائدہ پہنچایا۔“ (مسند احمد)

حضرت ابو بکر صدیقؓ جب خلیفہ بنے، تو تاوانات و رویشی زندگی بسر فرمائی۔ آپ کو پیوند لگے کپڑے پہننے سے بھی عار نہ تھا۔ دورانِ خلافت آپ نے کوئی عمل نہیں بنایا، اونٹوں کے گلے کھڑے نہیں کیے اور نہ ہی مال جمع کیا بلکہ آپ کی تمام تر توانائی ترویجِ اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی و فلاح کے کاموں پر مرکوز رہی۔ یہ ہے سچا و حقیقی اسلامی طرزِ حکمرانی!

زیر تبصرہ کتاب انہی جلیل القدر خلیفہ ازل کی حیات مبارکہ نہایت تفصیل سے ہمارے سامنے لاتی ہے۔ مصری محقق نے پیدائش سے لے کر وفات تک حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زندگی کے کئی واقعات کو بڑی شرح و سلا سے بیان کیا ہے۔ یوں ایک ایسی سبق آموز زندگی ہمارے سامنے آتی ہے جس پر چلتے ہوئے ہم بھی

حضرت ابو بکر صدیقؓ
مصنف: محمد حسین بیگل، مترجم: انجم سلطان شہباز۔
ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ جہلم، فون: ۶۱۳۹۷۷-۰۵۳۳۔ قیمت: ۷۸۰ روپے۔

نام و دانش و راست مسلمہ کے زوال کی مختلف وجوہ بیان کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مسلمان حکمران حقیقی اسلامی تعلیمات سے کنارہ کشی اختیار کر چکے۔ انہوں نے اس طرزِ حکمرانی کو خیر باد کہہ دیا جسے نبی کریم ﷺ نے اپنایا اور جس پر خلفائے راشدین بھی کاربند رہے۔

خلیفہ ازل، حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی کی مثال لیجیے۔



اردو ڈائجسٹ 232



خوبصورت بات علم تاریخ کی اہمیت بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ خصوصاً ہم مسلمانوں کے لیے اپنی تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

وجہ یہ ہے کہ محض ایک ہزار سال قبل مسلمان دنیا میں سپر پاور کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ہر شعبے ہائے زندگی میں چھائے ہوئے تھے اور انہوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کئی عظیم کارنامے انجام دیے۔ لیکن بوجہ مسلمان زوال پذیر ہو گئے اور اب تک دنیا میں پہلے جیسا مقام حاصل نہیں کر سکے۔

جناب میر باہر مشتاق ایک دردمند مسلمان اور عمدہ محقق ہیں۔ آپ اپنی تحریروں میں اغیار کی سازشیں آشکار کرتے اور مسلمانوں کو زوال سے نکلنے کی تدابیر بتاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سٹی کی ایک کڑی ہے۔ مرتب نے کتاب میں ان قابل رشک اور یادگار زمانہ اسلامی شخصیات کو جمع کر دیا ہے جنہوں نے مذہب، اخلاق، سائنس، فقہ، قانون، حکومت اور سیاست کے شعبوں میں زبردست کارنامے انجام دیے۔

ان عظیم شخصیات کے بارے میں پڑھنے سے افشا ہوتا ہے کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کے فروغ سے لے کر سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی تک مسلمانوں نے کئی میدانوں میں اپنے کمالات فن دکھائے اور انسانی تہذیب و تمدن کو بنا سنوار دیا۔ یہ کتاب اسلامی عظمت کے اسی عہد رفتہ کو بڑی خوبصورتی سے عیاں کرتی اور ہمیں فخر و حوصلہ بخشتی ہے۔

سور عظیم مسلم شخصیات میں خلفائے راشدین حضرت خالد بن ولید، علی، کرام، فقہائے کرام اور دور حاضر کی مشہور شخصیتوں مثلاً مولانا مودودی، حسن البنا، سید قطب، شبلیہ مولانا محمد الیاس، ڈاکٹر نجم الدین اربکان وغیرہ پر

میر حاصل خان کے موجود ہیں۔ کتاب کی پیش کش عمدہ ہے اور کاغذ معیاری، تاریخ اور سوانح حیات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس تصنیف کو پسند کریں گے۔

ایک ہی مٹی کے لوگ



مصنف: سلطان جمیل نسیم۔ ناشر: مختیار اکیڈمی، 3-49، گلشن اقبال کراچی۔ قیمت: ۳۰۰ روپے
 نیری پرائیٹ (پ: ۱۹۶۶ء) برطانیہ کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی ایک تحریر میں کہانی کی اہمیت کچھ یوں اجاگر کرتے ہیں: ”لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان کہانیاں تخلیق کرتے ہیں، حالانکہ معاملہ اس کے الٹ ہے۔“
 گویا پرائیٹ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کہانیاں انسان کی زندگی سنوارنے اور اسے درست راہ دکھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اصلاحی کہانیوں کا یہ بڑا مثبت رویہ ہے۔

جناب سلطان جمیل نسیم بھی ایسی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں جو انسان کے کردار کی تشکیل میں معاون بن سکیں۔ اسے نیک و بد کے مابین تمیز کرنا سکھائیں اور معاشرے کا مفید شہری بنا دیں۔ آپ مشہور شاعر، صحافی، کبیر آبادی کے فرزند اکبر ہیں۔

مصنف: ڈاکٹر سید صلاح الدین قادری۔ ناشر: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار کراچی، فون: ۲۳۶۹۷۲۳-۲۱۔ قیمت: درج نہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد الہی ہے: لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا؟ (القصص: ۱۷) جب اونٹ کی گونا گوں خصوصیات دیکھی جائیں، تو یہ مصداق قرآن پاک وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے مجززے کی حیثیت جانتی نکالی نظر آتا ہے۔

جناب ڈاکٹر صلاح الدین قادری جامعہ ملیہ ڈگری کالج، کراچی میں لیکچرار حیوانیات ہیں۔ انہوں نے محنت شاقہ کے بعد زیر تبصرہ کتاب مرتب کی ہے جس میں اونٹ کی عمومی معلومات دینے کے علاوہ اس کے گوشت اور دودھ کے طبی فوائد بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ معلومات واضح کرتی ہیں کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ انسانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

محقق موصوف کی تحقیق افشا کرتی ہے کہ دودھ سرطان، دیپانائٹس، استسقاء، تپ دق اور گردوں کی بیماریوں میں شافی ہے۔ یہ کتاب گویا اونٹ کا مختصر انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں اس جانور سے دلچسپی رکھنے والوں کو بہت سی قیمتی معلومات مل جائیں گے۔ کتاب کی طباعت و پیش کش بہت عمدہ ہے۔ اپنی تندرستی کو فوقیت دینے والے مرد و زن اسے مفید کتاب پائیں گے۔

دوا، غذا اور شفا

مصنف: ڈاکٹر آصف محمود جاوہ۔ ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد۔ قیمت: ۱۳۰ روپے۔
 حدیث نبوی ﷺ ہے کہ ہر مرض کی شفا موجود ہے۔ لیکن صحت پانے کے لیے ضروری ہے کہ علاج سے مدد لی جائے۔ دور حاضر میں علاج کرانا خاصا مہنگا

ضابط کتاب طویل عرصے سے شاندار افسانے لکھ رہے ہیں، تاہم ”پبلک ریلیشننگ“ کمزور ہونے کے باعث ویسی شہرت نہ پاسکے جس کے آپ حق دار تھے۔ راقم کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت یا دولت کمانے نہیں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے افسانے لکھتے ہیں۔ ذہنی محنت و مشقت سے ایک خوبصورت و موزوں افسانہ تخلیق کر کے انہیں جو سچی مسرت و خوشی ملے، شاید وہ اسی کو شانی و کافی سمجھتے ہیں۔

آپ کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے، زیر تبصرہ پانچواں مجموعہ ہے۔ اس میں چودہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا موضوع سلگتا کراچی ہے جہاں سیاسی راہنما اپنے مفادات کی خاطر لسانی و مذہبی فسادات کراتے رہتے ہیں۔ نافرسادات نے عروس اہلوان، کراچی کو کسی لٹی پٹی بیوہ کی صورت دے ڈالی مگر افسوس! مفاداتی لڑائی اب بھی جاری ہے۔

”ایک ہی مٹی کے لوگ“ کے افسانے ہمیں جدید دور کے مسائل سے آگاہ کرتے اور برہنہ سچائیاں سامنے لاتے ہیں۔ افسانے پڑھنے کے شوقین اس مجموعے کو قابل مطالعہ اور پسندیدہ پائیں گے۔ کتاب کی اشاعت و طباعت معیاری ہے اور اس لحاظ سے قیمت چنداں زیادہ نہیں۔

اونٹ: جدید طبی فوائد



پہلو خیاں



قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سبٹا کالیم

”بھائی جی“

شانہ امیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ لطاف صاحب کا تحریر کردہ ”بھائی جی“ پڑھا تو ہمارے دل میں رنگ دانہ کا سیلاب اٹل پڑا۔ ہم مرزاہم اور ہمارے مسلمانوں کے لیے اللہ جل شانہ سے عافیت طلب کرتے ہیں۔ (عبدالقدلاہور)

معیاری تحریروں سے سجا گلہ ستہ

شمارہ دسمبر نظر تو آواز ہوا۔ یہ دلچسپ اور معیاری تحریروں سے سجا گلہ ستہ دل کو بھرا گیا۔ محترمہ نسرتین جلیلی کا انٹرویو محنت کر دار اور اخلاق سے عبارت تھا۔ ”مشورہ حاضر ہے“ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہو سکے تو کھیلوں کے پاکستانی بیرونیوں کے بارے میں لکھیے۔ آخر میں اپنی ٹیم کو اتنی اچھی کاوش پر مبارک باد۔ (محمد اویس دانش خانزادہ سکرنڈ نواب شاہ)

کرپٹ ملازمین

اردو ڈائجسٹ کے تمام صفحات اور تصاویر میں گلہ ہارے اور کلامیت بہت مدد۔ پروٹنگ کا معیار بھی بہتر ہے۔ رسالے میں وقتاً فوقتاً میری کہانیاں شائع ہوتی ہیں جن کا مناسب اعزاز یہ بھی موصول ہوتا ہے۔ تاہم اعزاز کی شمارہ

اردو ڈائجسٹ سے معلوم ہوا کہ قریشی برادران کے برادر بزرگ، گل حسن انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ لطاف حسن قریشی صاحب کے مقالہ خصوصاً، بھائی جی سے مرحوم کی زندگی کے حالات پڑھ کر اوصاف تمیذ سے واقفیت ہوئی اور یہ طمانیت ملی کہ انھوں نے خاندان کی سربراہی انتہائی خوبی سے نبھائی۔ اب ہم عمر کے ایسے جیسے میں داخل ہو چکے کہ دم واپس کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ بھائی گل حسن جیسے صاحب کردار لوگوں کے سائے سے محرومی نے اس احساس میں مزید شدت پیدا کر دی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات بلند اور ہمسائے گان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

محترمہ سفیرہ بانو شیریں کے انتقال سے بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ ان کا ”مشورہ حاضر“ بہت اچھا لگا۔ سے پڑھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

(احسان الحق مدیر اہل چستان ناٹمز)

بھائی جی کی وفات کا پڑھ کر بہت غم ہوا۔ اللہ جل

غلاموں کی نماز

(ثرکی وفد ہلال احمر لانا ہور میں)

کہا مجھ کو ثرکی نے مجھ سے بعد نماز طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام وہ سادہ مرد مجاہد وہ مومن آزاد خبر نہ تھی اُسے کیا چیز ہے نماز غلام ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں انہی کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام بدن غلام کا سوتِ عمل سے ہے محروم کہ ہے مرد غلاموں کے روزِ شب پہ حرام طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے ورنہ سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام خدا نصیب کرے بند کے غلاموں کو وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام!

فلسطينی عرب سے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے تیری ذوا نہ جینوا میں ہے، نہ لندن میں فرنگ کی رگب جاں پہنچے بیور میں ہے ستارے میں نے، غلامی سے امتوں کی نجات خود کی پرورش و لذت نمود میں ہے! (اقبال)

اور کتبیں مرحلہ بن چکا۔ مزید برآں بعض اوقات بد پرہیزی یا بد عملی سے معمولی بیماری بھی بڑھ کر خطرناک مرض بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر آصف محمود جاہ خدمت انسان کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ سلسلہ علاج لوگوں کو مختلف مسائل میں گرفتار پایا، تو ان کی زندگی آسان بنانے کے لیے زیر تبصرہ کتاب لکھ ڈالی۔

دوا، غذا اور شفایاں بتایا گیا ہے کہ خدا نخواستہ انسان کو کوئی بیماری چسپے تو کیونکر نمٹا جائے۔ چنانچہ اس میں مختلف بیماریوں میں استعمال ہونے والی ادویہ ان کے منفی اثرات اور انتخاب سے متعلق بڑی مفید معلومات دی



گئی ہیں۔ یہ خوبی کتاب کو عام گھرانوں کے لیے بہت موثر بنا دیتی ہے۔

جن گھرانوں میں خصوصاً بچے ہوتے ہیں، ان میں یہ کتاب موجود ہونی چاہیے تاکہ کسی طبی مسئلے یا آفت کی صورت اس سے بروقت نمٹا جاسکے۔ کتاب کی پیش کش معیاری ہے اور اپنی افادیت کے پیش نظر بہت کم قیمت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسرائیل کا سمندر گویا کوزے میں سمیٹ دیا ہے۔

(تبصرہ نگار سید عاصم محمود)

نوٹ

قارئین کرام بذریعہ ای میل بھی اپنی آرا اور تجاویز بھیج سکتے ہیں۔ قارئین کے تبصروں سے ہمیں رسالے کا معیار بڑھانے اور بہتری لانے میں مدد ملتی ہے۔ ہمارا ای میل پتہ ہے: editor@urdu-digest.com (ادارہ اردو ڈائجسٹ)

”اسلامک کلچرل سینٹر“ ہزار ہا ناروژی مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی ضروریات بخوبی پوری کر رہا ہے۔ شہید دوسروں کی خاطر جان دیتا جبکہ محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے تو دوسرے کا تحفہ زندگی۔ صوفی صاحب ناروژی مسلمانوں کے لیے مسکن ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین (محمد راشد خیر الدین اوسلو ناروے)

بچکی کا نسخہ

شمارہ ستمبر میں حکیم عبدالوحید سلیمانی نے اپنے مضمون ”مشورہ حاضر ہے“ میں بچکی دور کرنے کا نسخہ بتایا۔ ایک لسنہ میرے علم میں بھی ہے جو ڈاکٹر اسماعیل کی وساطت سے معلوم ہوا۔ آپ لالی کزئی (راہ پٹنڈی) میں مطب کرتے تھے۔

ایک دن ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ایسا مریض آیا جسے دو دن سے مسلسل بچکی آ رہی تھی اور بند ہونے کا نام نہ لیتی۔ مطب کے سامنے پھل والا کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل نے ملازم سے بڑا سا خاکی لفافہ منگوایا اور مریض سے کہا کہ اس سے اپنا منہ ڈھانک لو۔

مریض نے لفافہ چہرے پر ایسے لگا دیا کہ منہ اور ناک اس کے اندر آ گئے۔ تب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ لفافے کو پکڑے کچھ دیر ایسے ہی بیٹھے رہو۔ چنانچہ مریض لفافے کے اندر ہی سانس لینے لگا۔ دس منٹ بعد اس کی بچکی بند ہو گئی۔

اس نسخے کا قاعدہ یہ ہے کہ استہانے میں کوئی نقصان نہیں۔ خداخواست آرام نہ آئے تو حکیم صاحب کے تیر بہدف نسخے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ (جاوید احمد صدیقی مارا پٹنڈی)

درمیان میں غمزدہ ہو جاتا ہے۔ نکلے ڈاک کے ملازمین شاید انہیں اپنے دوستوں کو بطور تحفہ دے ڈالتے ہیں۔ نجانے کرسیشن کی یہ شکل کب ختم ہوگی؟ (بشیر احمد بھٹی میا پور)

دو غلطیاں

شمارہ دسمبر میں شائع شدہ اپنی آپ بیتی زیر مطالعہ رہی۔ اس میں دو غلطیاں رہ گئیں جن کی تصحیح ضروری ہے۔ اول میرا نام ”ممبر اعظمی“ ہے جبکہ مضمون میں ”مگھوہ اعظمی“ لکھا گیا۔ دوم میری آپ بیتی کا پہلا حصہ اگست نہیں ماہ اکتوبر میں شائع ہوا تھا۔

(ممبر اعظمی ذبیحہ کراچی)

ناروے کے صوفی اصغر

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے جب چک نمبر ۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶ فیصل آباد سے صوفی میاں محمد اصغر ناروے پہنچے۔ پھر انہوں نے اس مغربی ملک میں اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے تنہا دامن دار رہا۔

جب صوفی صاحب اوسلو میں مقیم ہو گئے تو کسی بھی مسلمان کی رہائش گاہ میں تقسیم القرآن لے کر درس دینے لگے۔ شروع میں بہت کم مرد و زنان تھے پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

چنانچہ ایک شمارت ’فولکیٹ باؤس میں ۳۰ کراؤن کرائے پر ایک کمرے لیا گیا۔ روزہ رفتہ رفتہ کئی پاکستانی اوسلو میں مقیم ہو گئے۔ ان کی اکثریت درس قرآن میں شریک ہوتی۔ لہذا فیصلہ ہوا کہ شہر میں اسلامی مرکز تعمیر کیا جائے۔

۹۰ء کی دہائی کے آغاز سے اسلامی مرکز کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کیا جانے لگا۔ اس مہم میں صوفی صاحب پیش پیش رہے۔ وہ کوئی غیر معمولی شخصیت نہیں تھے مگر اسلام سے محبت اور ایمانی جذبے کی بدولت انہوں نے مخلص احباب کی ایک جماعت تیار کر لی۔

شبانہ روز جدو جہد رنگ لائی اور اسلامی مرکز کی تعمیر کے لیے مطلوبہ رقم جمع ہو گئی۔ آج اوسلو کے مرکز میں واقع

گوشہ سوشل میڈیا

گوشہ سوشل میڈیا

آج کل کے دور میں فیس بک زندگی کا اہم جز بن چکی۔ لاکھوں پاکستانی اپنی خوشی، غمی اور دلچسپ معلومات وغیرہ اسی سوشل سائٹ کے ذریعے دوستوں سے شیئر کرتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ ۵۴ سال سے اردو زبان کی ترویج کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ ۳۰ سالہ دور کی ضرورت، مد نظر رکھتے ہوئے اردو ڈائجسٹ بھی فیس بک پر شاعری، نثر، اقوال، احادیث و قرآن الہی اور مختلف اسلامی، سائنسی، سیاسی، معاشی، سماجی واقعات شیئر کر رہا ہے۔ یوں نہ صرف اردو زبان کی ترویج ہو رہی ہے بلکہ دوسری زبانوں والے بھی اس سے آشنا ہو رہے ہیں۔

بہت سے قارئین ای میل، فیس بک اور بذریعہ ڈاک ہمیں اردو زبان کی بہتری کے لیے تجاویز دیتے اور شاعری و نثر میں اپنی کاوشیں بھی بھیجتے ہیں۔ ہم قارئین کی تجاویز، تبصروں و تنقید کو دل سے اچھالتے اور ان بات پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ اردو کی ترویج میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ اپنی تجاویز، تنقید اور تحریریں ہمارے ای میل، فیس بک اور فٹزری پتے پر بھیجیں جن کا ہم خیر مقدم کریں گے۔ ہمارا پتہ یہ ہے: P.O. Box 111 جوہر ٹاؤن لاہور۔ ای میل editor@urdu-digest.com (ادارہ)

پاک دھرتی کا قرض

ہم اس سوئی دھرتی پر نئی سچ جگائیں گے اور شلال موجوں کو باہم کر کے نئی تقدیر بنائیں گے ہم اس ارض وطن پر دیشی خواب جگائیں گے اور ان خوابوں کے در پردہ نیا دور دکھائیں گے ہم اس پاک دھرتی کا قرض کیسے چکائیں گے؟ اب پرہم کے سائے میں نئی جہتوں کا سفر ہے ہم محبت خیز جہتوں کے نئے دیپ جگائیں گے اب سر پر ہو سایہ گلن نمیب عظیم

اردو ڈائجسٹ 239

ہم قرآن کی روشن شمعوں سے نفرت کو مٹائیں گے ہم سا سوئی دھرتی پر نئی سچ جگائیں گے (سہیلہ ڈوشین شاعر، شیکاگو، امریکا)

۱۔ آپ کا ڈائجسٹ بہت اچھا ہے۔ ۲۰۰۰ء سے پڑھ رہا ہوں۔ براہ مہربانی اس میں شاعری بھی شامل کریں۔

(محبوب اقبال)

۲۔ اس میں بہت معلوماتی مضامین ہوتے ہیں۔ میں اردو ڈائجسٹ کو پسند کرتی ہوں۔ (کنول مہک)

۳۔ تصویر کے نیچے اپنا ٹیکہ لگا کر کریں تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ شیئر کر سکیں۔ (بال)

(۱۶۷۰ سال میں ایچ شیئر کرنے میں ٹیک کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ بس ذرا ایچ ایف کا مظاہرہ کریں۔)

۴۔ میں اردو ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں اور اس کی ترقی و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ (دستگیر ریاض)

۵۔ اردو ڈائجسٹ کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے کاپی رائٹر بننے کا ارادہ ہے اور کیا میری کبائیاں اس میں شائع ہو جائیں گی۔ (علیہ نجم)

(اپنی کبائیاں ایڈیٹر کے ای میل ایڈریس یا پرنس ایڈریس پر بھیج دیں۔ شائع کرنے کا فیصلہ مضمون پڑھنے کے بعد کیا جائے گا۔)

۶۔ ایڈمن سے گزارش ہے کہ روزانہ دس تصویروں سے زیادہ نہ لگائیں کیونکہ میں ہر ایچ شیئر کرتا ہوں۔ اس طرح میرے لیے ممکن نہیں رہتا۔ (کامران خان)

۷۔ میں اردو ڈائجسٹ کی گھر بیٹھے رکن کیسے بن سکتی ہوں۔ کیا یہ مجھے مادہ تک میرے گھر ماہوار بھیجا جا سکتا ہے۔ طریقہ کار بتادیں۔ (فاطمہ زاہد)

(نمبر آ سکتا ہے۔ آپ اردو ڈائجسٹ کی سالانہ خریداری کے گھر بیٹھے ڈائجسٹ حاصل کر سکتے ہیں۔)

۸۔ مجھے اردو ڈائجسٹ پسند ہے۔ کیا آپ مجھے اس کی ایک کاپی بھیج سکتے ہیں۔ (فریح ڈیشان ملک)

(اس کے لیے آپ کو اردو ڈائجسٹ سالانہ خریداری کا دکن ہونا ہوگا۔)



